

خوب صورت، بھوری شہری آنکھوں میں چھائی خشکی  
..... کچھ تھا اس میں جو اسے سارے میں یگانا بنا تھا۔  
لے کر گئے اور چیزیں بلوس، برسی کی بانڈو پٹے، مقطر  
کے انداز میں گروں سے لپیٹے، ٹانگہ پر تاجدار رکھے وہ  
پاؤں جھٹائی، تنقیدی انگاہوں سے دھڑا دھڑا دیکھ رہی  
تھی اور تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ سیاہ فام لڑکی آج  
بھی بچہ اس کے ساتھ بیٹھی ہے۔

سنہری صبح جھجک رہی تھی جب وہ سست روی سے چلتی بس اسٹاپ تک پہنچی۔ کندھے پہ بیگ لٹکائے ہاتھ میں پانی کی بھجونی بول پکڑے، چہرے پہ ڈھیروں بے زاری لیے دو بج کے قریب آئی، جہاں بیٹھ کر وہ روز دس منٹ بس کا انتظار کرتی تھی۔

اس نے بیگ ایک طرف رکھا اور زچہ پہ بیٹھ گئی۔ پھر ایک ہاتھ سے جمائی روکتے دوسرے سے بول کھول کر لبوں سے لگائی۔ گرمی آج کل بڑھتی ہی جارہی تھی۔ صبح ہی صبح اسے سینہ کے لگا تھا، جانے آگے کیا ہوگا، وہ گھونٹ بھرتی بے زاری سے سوچ رہی تھی۔ چہرے پہ بھی ویسی آکٹائے ہوئے تاثرات تھے جیسے دبا بھر سے چٹھا ہو۔ سنہری پیشانی پہ مستقل بڑے بل اور کار کاغذی

ان دونوں کے درمیان اس ٹائیگ رکھا تھا اور اس وقت وہ سیاہ فام لڑکی سیر جھکائے، نگاہ ترمجھی کیے اس کے بیک گورڈ پر ہی تھی، جس جگہ جگہ چاک اور آئینہ سے اس نے اپنا نام لکھ رکھا تھا۔  
”محمد ابراہیم... محمد ابراہیم... Ibrahim“

Ibrahim..... محمد ابراہیم.....

مکمل ناول





آؤا ترجمان چھوٹے بڑے پر انداز میں لکھا تھا۔ وہ لڑکی کبھی بھی اس کے ایک کو دیکھتی تھی مگر محل کے تو روز کے دس منٹ اس سیاہ فام لڑکی کا جائزہ لیتے ہی گزرتے تھے۔

وہ بھی عجیب پر اسرار کردار تھی۔ یہاں اسلام آباد میں سیاہ فام نظر آئی جاتے تھے مگر وہ اپنے جیسوں سے مختلف تھی۔ سر پہ دھول باندھ کر گردن کے پیچھے گرو لگاتی اور نیچے اوور کوٹ مٹھے ہوئے ہونٹ سیاہ رنگت۔ مگر چمکیلی آنکھیں۔۔۔ کوئی ایسی چمک تھی ان میں کہ محفل کبھی ان آنکھوں میں دیکھ نہ پائی تھی ہمیشہ نگاہ چرا جاتی۔ شاید ڈیڑھ مہینہ قبل وہ اسے اپنے مخصوص اوقات میں اینڈینڈ پہنچتی تھی اور ان ڈیڑھ ماہ میں ان کا انداز بیشک یکساں رہا تھا۔

کمر سیدھے رکھے الرٹ سی ناچ پہ بیٹھی خاموشی سے سناٹے سیندھ میں دیکھتی وہ بہت چپ سی لڑکی معلوم نہیں کون تھی اور پھر اس کی وہ پر اسرار کتاب سیاہ جلد والی بھاری سی کتاب جس کا سیاہ سرورق بالکل خالی تھا اس کی گود میں دھری ہوئی اور کتاب کے کناروں پہ اس کے سیاہ ہاتھ مضبوطی سے جے ہوئے۔ اس کے انداز سے کچھ خاص جھلکتا تھا۔ کتاب کی حفاظت کا احساس یا شاید اس کے بیش قیمت ہونے کا۔

کتاب بالشت بھر موٹی تھی۔ صفحوں کے جھلکتے کنارے پلے اور خستہ لگتے تھے جیسے کوئی بہت قدیم کتاب ہو۔ ٹینکڑوں برس پرانا کوئی نسخہ ہو۔ کچھ تھا اس میں کوئی قدیم راز لکھوئی پر اسرار تھا۔ وہ جب بھی اس کتاب کو دیکھتی یہی سوچتی اور آج جانے کیا ہوا وہ اس خاموش سی لڑکی سے مخاطب ہو ہی گئی۔ شاید تجسّس عاجز کر رہا تھا۔

”ایکسکیوز می۔ ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟“  
”پوچھو۔“ سیاہ فام لڑکی نے اپنی چمکیلی آنکھیں

اٹھائیں۔

”یہ کتاب کس کی ہے؟“  
”میری!“

”میرا مطلب ہے کس میں لکھا ہے؟“  
وہ چند لمحے محفل کا چہرہ دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

”میری زندگی کی کہانی!“

”اچھا۔“ وہ حیرت چھپانہ سکی۔ ”میں سمجھی یہ کوئی قدیم کتاب ہے۔“

”قدیم ہی ہے۔ صدیوں پہلے لکھی گئی تھی۔“  
”تو آپ کو کہاں سے ملی؟“

”مصری ایک پرانی لائبریری سے یہ کچھ کتابوں کے

بیچ پڑی تھی جب میں نے اسے نکالا تو اس پر زمانوں کی گرد تھی۔“ وہ محبت سے سیاہ جلد پہ ہاتھ پھیرتے کہہ رہی تھی۔ اس کے لیون پہ مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ ”میں نے وہ گرد جھاڑی اور اسے اپنے ساتھ رکھ لیا پھر جب یہ حال معلوم ہوا کہ اسے تو کسی نے میرے لیے لکھا آؤا حیران تھا۔“  
محفل منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں کیا دلچسپی ہے اس میں؟“  
”میں اس کے بارے میں مزید جانتا چاہتی ہوں۔ کیا میں اسے پڑھ سکتی ہوں؟“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”تم نے دور کی سی لڑکی ہو اس قدیم زبان میں لکھے نسخے کو کہاں سمجھو گی؟“

”مگر یہ ہے کیا؟ اس میں لکھا کیا ہے؟“ وہ تجسّس اب اسے بے چین کر رہا تھا۔

”میرا نامی۔۔۔“

اسی بل باران بجاؤ محفل نے چونک کر سامنے سرک پہ آئی اس کو دیکھا۔

”میرا حال۔۔۔“ وہ سیاہ فام لڑکی کہہ رہی تھی۔

محفل بیک کا اسٹریپ پکڑے کھڑی ہوئی اسے جلدی کا رخ پوچھنا تھا۔

”اور میرا مستقبل بھی مجھے کیا پیش آئے والا ہے یہ کتاب سب بتا دیتی ہے۔“

”میں چلتی ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے معذرت خواہانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

”اس میں تمہارا بھی ذکر ہے محفل!“ وہ اگلے بیروں مڑی۔

”میرا ذکر؟ میرے بارے میں کیا لکھا ہے؟“ وہ شدید رہی تو رہ گئی تھی۔

”یہ کہ میں تمہیں یہ کتاب دے دوں۔ لیکن میں تو اسے تمہیں جب ہی دوں گی جب تم تھک کر خود مجھ سے ہائٹے آؤ گی کیونکہ اس میں تمہاری زندگی کی کہانی بھی ہے جو ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے۔ سب لکھا ہے۔“

اس کا تیز باران بھر بھاؤ وہ کچھ کہے بنا تیزی سے اس طرف لپکی۔ راؤ پکڑ کر اوپر چڑھتے اس نے بل بھر کو پلٹ کر دیکھا تھا۔

وہ سیاہ فام لڑکی اسی طرح مسکرا رہی تھی۔

پر اسرار مسکراہٹ محفل کو ایک دم اس سے دست ڈر گاتھا۔

www.pkdigest.com

سے دست ڈر گاتھا۔

کالج کے بعد وہ اپنی دوست ٹائیپ کے ابو کی اکیڈمی میں سیونٹھ کلاس کے بچوں کو سائنس اور مہتمس پڑھاتی تھی مگر سچے سچے اپنے اسے روز ساڑھے تین ہو جاتے تھے۔

گیٹ عبور کر کے پورچ میں دیکھا تو تین گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ دل کر رہ گیا۔ گھر میں گاڑیوں کی قطار کے باوجود۔ بسوں کے دھکے کھانے پہ مجبور تھی۔

”ہم بچوں کے رحم و کرم پہ پلنے والے بیٹوں کے نصیب بھی کتنے یتیم ہوتے ہیں نا!“ خود پہ ترس کھاتی وہ اندر آئی تھی۔

لاؤ، بچا میں خاموش دہر داری تھی۔ وہ سب کے

سوتے کا نام تھا۔ آٹھا جان اس کے سب سے بڑے تایا اس وقت تک آٹھ سے لوٹ آئے تھے اور ان کی سچی خیر کے باعث پورے گھر کو حکم ہوتا تھا کہ بچہ بھی نہ کھڑے ورنہ وہ ڈسٹر بول کے حکم بظاہر پورے گھر کو اور در حقیقت محفل اور مسرت کو سٹایا جاتا تھا اور آخر میں جب آٹھا جان کی یتیم ملتی مستاب ان الفاظ کا اضافہ کرتیں۔

”اور مسرت اور اپنی بیٹی کو سمجھا تا کہ جب پور پور شہر پھرنے سے فاصلہ ہو جائے تو گھر آتے ہوئے میں دور آرام سے کھولا کرے، تنہا صاحب کی خیر خراب ہوتی ہے۔ اب میں کچھ کہوں گی تو اسے برا لگے گا۔“

بھری تو زبان سے اس کی۔ نہ پچھوئے کا لحاظ نہ برے کا ادب، استغفر اللہ۔ ہماری بیٹیاں بھی کالج میں پڑھتی ہیں ان کے تو انداز اسے نہ لگے جیسے محفل کے۔

دیکھو دیکھو تو اسے تو آگ ہی لگ جاتی تھی۔ ہر روز

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

300 روپے

اے محبت تیری خاطر

فاویہ کشمال طازی

225 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



دروازہ کھولتے ہوئے ہی فقرہ سماعت میں گونجتا تو وہ  
چڑنے کے باوجود دروازہ آہستہ بند کرتی۔  
مکن کی طرف آئی تو سبک میں جھوٹے برتنوں کا  
ڈھیر لگا تھا۔ ناگواری سے تاک چڑھائے اس نے بیک  
سلیب پر رکھا اور بائیں ہاتھ کی طرف بڑھی۔ صبح ناشتے  
کے بعد سے اب تک کچھ نہ کھایا تھا اور اب زوروں  
کی جھوک لگی تھی۔  
بائیں ہاتھ کھولا تو وہ خالی تھا۔ دیوال یہ روٹی کے چند  
ڈرنے بھرے تھے۔ اس نے فرنگ کھولنا چاہا تو وہ لاکڈ  
تھا۔ مہتاب نائی اس کے آنے سے قبل فرنگ لاک کر  
دیتی تھیں۔ مسرت اس کے لیے کھانا بجا کر بائیں ہاتھ  
میں رکھتی تھیں مگر جب سے مہتاب نائی نے کھانے  
کی خود مگرانی شروع کی تھی ہاتھ پاٹ ہر تیرے دن  
خالی ہی رہتا تھا۔  
تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، لیکن  
پھر ضبط کر کے باہر نکلی اور آہستہ سے گیٹ عبور کر کے  
کالونی کے باہر نکلنے والے ہوٹل سے ایک نان اور ایک  
کباب لے آئی کہ اتنے ہی پیسے تھے۔  
واپسی یہ وہ پھر سے پرانی محل بن چکی تھی۔ لاؤنج کا  
دروازہ کھول کر دھڑام سے بند کیا۔ فرش پر بڑی فٹ  
پال اٹھا کر پوری قوت سے دیوار پر باری اور صوفے پر  
ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھی نان کباب کا لطفہ کھولنے  
لگی۔  
لے بھر بعد ہی اتفاقاً جان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور  
شنتا تھی ہوئی نائی مہتاب باہر آئیں۔  
”وہ محل!“ وہ کہیں تو اس نے آرام سے سر اٹھایا۔  
”کباب کھا میں کی نائی لیاں؟“  
”شٹ آپ ہزار دفعہ کہا ہے کہ آرام سے دروازہ  
کھولا کرو مگر نہیں۔“  
”آہستہ ہو لیں نائی لیاں! اس وقت اتفاقاً سو  
رہے ہوتے ہیں“ اٹھ جائیں گے۔“ وہ نان پہ کباب  
رکھ کر یاؤں جھلاتی بے نیازی سے کھاری تھی۔  
”تم۔۔۔ احسان فراموش۔۔۔ تمہیں ذرا بھر بھی  
احساس ہے کہ اتفاقاً صلاب دن بھر کے کھانے۔۔۔“

فقرہ مکمل ہونے سے قبل ہی وہ اپنا نان کباب اٹھائے  
اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔  
نائی مہتاب شنتا نائی کلسی رہ گئیں۔  
اندر مسرت کو انڈولن جاگ چکی تھیں۔  
”کیا ہوا ہے محمل ایجا بھی بیگم کیوں ناراض ہو رہی  
ہیں؟“  
”دلغ خراب ہے ان کا پیدائشی مسئلہ ہے۔ آپ کو  
نہیں پتہ؟“ اس نے بے زاری سے نان کباب کا لطفہ  
بستر پر رکھ دیا۔  
”مگر ہوا کیا ہے؟“ ان کی نگاہ پھسل کر لطفانے پہ  
گئی۔ ”پچھرا ہر سے کھانا لائی ہو؟ فرنگ میں۔۔۔“ اور پھر  
خود ہی خاموش ہو گئیں۔  
”آپ کے لیے لائی ہوں۔ آپ نے کچھ کھلایا۔“  
”میں کھا چکی ہوں یہ تم کھاؤ“ مجھے معلوم ہے تم  
نے کچھ نہیں کھلایا۔“ وہ تھکاوٹ سے مسکرائیں تو  
محمل نے لمحہ بھر کو ان کو دیکھا۔ ساہمے ہوئے کان کے  
جوڑے میں سفید ہوئے بال اور جھروپا زرد چہرے  
والی اس کی کھنکی تھی بے ضروری ہاں چڑوائی اس عالی  
شان کو بھی کی ماکن ہوتے ہوئے بھی ملاؤں لگی تھی۔  
”دل برامت کیا کرو محمل! اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔“  
”مجھے قصہ آتا ہے ان لوگوں پر لیاں!“  
باہر تائی مہتاب کے بونے کی آواز برابری آ رہی تھی۔  
وہ اب شور کر کے جانے کس کس کو تیار رہی تھیں۔  
”ناشکری مت کرو بیٹا! انہوں نے رہنے کے لیے  
ہمیں جھٹ دی ہے ہمارا دیا ہے۔“  
”احسان نہیں کیا، میرے باپ کا گھر ہے۔ اسے ابا  
نے ہمارے لیے بنوایا تھا۔ یہ بڑس یہ فیکٹریاں یہ سب  
ابا نے خود بنایا تھا۔ سب کچھ ابا نے ہمارے نام کیا تھا۔“  
”تمہارے ابا اب زندہ نہیں ہیں محمل! وہ اب  
کہیں بھی نہیں ہیں۔“ وہ جیسے تھک کر کہہ رہی تھیں  
اور وہ انہیں دیکھ کر وہ کی۔ پھر سر جھٹک کر لطفہ اٹھالیا۔  
نان سخت ہو گیا تھا اور کباب ٹھنڈا۔ وہ بے دلی سے  
لقھے توڑنے لگی۔

گئی تھی۔ وہ ذرا بھی سہلائی تو اونچی پونی ساتھ ہی  
گردن کے اوپر جھوٹتی۔  
اس کی آنکھیں کلچ سی سنہری تھیں اور ہلکا سا  
کاجل بھی ان کو دکھاتا تھا۔ وہ بلاشبہ گھر کی سب سے  
حسین لڑکی تھی۔  
”اسی لیے تو جلتی ہیں یہ سب۔“ اسے ہنسی آئی۔  
ایک نظر خیریت والی۔ جیتنے کے اوپر کھلا سا کرتا اور گردن  
کے گرد لپٹاؤں پہ مہتاب کی طرح ایک پلو پہنائے کو ٹھکانا اور  
دو سر اکریہ گردن اوچی سب سے منفرد تھی۔  
”جن میں نائی مہتاب نکلتی نکال کر مسرت کے  
سامنے رکھ رہی تھیں جو بیت نامعداری سے ایک  
طرف خانے کا پانی پڑھا کر دوسری طرف کڑائی میں  
تیل گرم کر رہی تھیں۔ اس نے نظر بڑی تو نکلتی رہ گئے  
ہوئے ذرا لاپرواہی سے گویا ہوں۔  
”یہ بچوں کے لیے فرمائی کرو مسرت! اب ہر کوئی تو  
باہر سے منہ مار کر نہیں آتا!“  
”بچا فرمایا نائی لیاں! یہاں تو لوگ گھر کے اندر ہی  
دوسروں کے بال پر منہ مارتے ہیں۔“ وہ اطمینان سے  
کہہ کر کوڑے سیالی کا گلاس بھرنے لگی۔  
”زیان کو سنبھالو لڑکی! اتنے ہے تمہاری بیٹی! تو کبھی  
ایسے ہمارے آگے نہ بولیں۔“  
”آپ برامت نائیں بھائی بیگم! میں سمجھا ہوں  
گی۔“ ”تھرا کر مسرت نے ایک جی نگاہ محمل پر ڈالی۔ وہ  
کندھا چاکر کھڑے کھڑے پانی پینے لگی۔  
”سمجھاؤ نا، بستر ہو گا۔“ اس پر ایک تنفر بھری نگاہ  
ڈال کر نائی مہتاب باہر جا گئیں۔ ناعمدہ چینی پیسلے یا جا  
چکی تھیں۔ اب مسرت اور محمل ہی مکن میں رہ گئے  
تھے۔  
”اب یقیناً بستر تن بھی آپ کو ہی دھونے ہوں گے،  
لیاں!“  
”وہ بھی دل تو کیا ہے! ان کے احسان کم ہیں ہم  
یہ۔“ وہ مصروف سی ایک ایک کر کے نکلتی کڑائی  
میں ڈال رہی تھیں۔  
محمل نے ایک گہری سانس لی اور آستینیں مڑو کر



سب کی طرف متوجہ ہوئی۔ اسے سمجھا کہ اگر وہ رات کو کھانا بھی تیار کرنا تھا۔  
 "جیسے پہلے آپ کر لیں گی۔"  
 "بڑا احسان کرنا چاہتی ہوں۔" وہ برتن دھو کر فارغ ہوئی تو مسرت سے اپنی بھرپوری تھیں۔  
 "عمل یہ باہر لے جاؤ غائب لائن میں ہوں گے۔"  
 وہ بنا احتجاج نہ لے کر لائن میں روزنامہ کی طرح گریباں لگی تھیں۔  
 آغا کریم اخبار کھولے دیکھ رہے تھے ساتھ ہی مقاب نامی اور ناعہہ چچی باتیں کر رہی تھیں۔ ناعہہ چچی سب سے چھوٹے بچا اسد کی بیوی تھیں جو قریب ہی بیٹھے غفران بچا سے کچھ کہہ رہے تھے۔ غفران بچا اور محل کے آیا آغا ابراہیم جڑواں تھے۔ آغا کریم ان سے بڑے اور اسد بچا چاروں بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔  
 غفران بچا کی بیکر فضا چچی بڑے آدے میں کھڑی اپنی بیٹی کو آواز دے رہی تھیں۔ اسے ٹرائی لے کر آگاہ کر مکر مکر کہیں۔  
 "اگرے محل جان! اتر کھلی گئی رہیں! ندیا سامیہ کو کہہ دیا ہوتا تمہاری پہلپ کروا دیتیں۔"  
 فضا چچی ناعہہ اور مقاب کی طرح زبان کی کڑوی نہ تھیں بلکہ اتنی میٹھی تھیں کہ جب یہ میٹھاں اپنے لبوں سے دوسرے کے حلق میں اندر لیتیں تو وہاں کانٹے اگل آتے تھے۔  
 "اوس اس کے" وہ بھی بس مسکرا کر ٹرائی آگے لے گئی۔ اب کیا کہتی کہ نر اور سامیہ نے پہلے کون سے کام کئے تھے جواب کرتیں۔ اگر وہ انہیں ملائی تو وہ فوراً چلی آئیں ایک دو چیزیں پکڑا لیں چولہا جلاتیں باتیں بکھارتیں اور پھر آہستہ سے کھسک جاتیں۔ اس کے بعد لائن میں فضا چچی سب کو ایک ایک چیز یہ چکھیں میری سامیہ نے بتائی ہیں۔" اور "میری ندا کے ہاتھ میں تو بہت فاقہ ہے۔" کہہ کر پیش کرتیں۔

اور محل کو کابلی کے وہ طبقے ملے کہ اس سارے فضا سے بچنے کو محل نے کبھی ان دونوں کو بلانے کی غلطی نہ کی تھی۔ مگر فضا چچی کی یہ میٹھی زبان ہی تھی کہ نہ وہ بھی ان کو لپٹ کر جواب دے سکی نہ ہی کچھ جاسکی تھی۔ وہ صوبہ کی وہ بڑی تھیں۔  
 "لاؤ لاؤ جلدی کرو دونوں ماں بیٹی لگتی ہیں پھر بھی گھنٹہ لگ جاتا ہے۔"  
 "نائی! آپ کوئی ملازمہ کیوں نہیں رکھ لیتیں۔"  
 کم از کم آپ کو ہم ماں بیٹی سے چلانا تو نہیں پڑے گا۔" وہ تیزی سے کہہ کر ٹرائی وہیں چھوڑے واپس چلی گئی۔  
 سب باتیں چھوڑ کر دھڑکیں لگاتے تھے۔  
 "احسان کرنے کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" نامی نے ٹرائی اپنی طرف کھینچی۔ آغا کریم نگاہیں چرا کر پھر سے اخبار میں گم ہو چکے تھے۔  
 وہ واپس کچن کی طرف آئی تو فواد تیزی سے میریہاں بھلا نکلتا ہیچ آ رہا تھا۔  
 "جاسے لگ گئی؟" آخری میز پر اترتے مصروف سے انداز میں کہتے وہ کابلی پہ کھڑی باندھ رہا تھا۔  
 "اسے کبھی لے گئی ہوں" چائے لٹائی ہوں۔" وہ زیادہ غور سے نے بغیر ہر بل کر گیا۔ محل نے ٹوک کر لمحہ بھر کو اسے جاتے دیکھا۔  
 وہ مقاب نامی کا بڑا بیٹا تھا۔ حنا و سیم اس کے بعد تھے اور سدھ اور مہرین سب سے چھوٹی تھیں۔ فواد آغا جان کے آفس جاتا تھا اونچا لبا خوش شکل تو تھا ہی مگر ڈریسنگ اور دولت کی چمک دیکھ سے مزید کشش اور پختہ سم لگتا تھا۔ فواد ان کا سب سے پاپو لڑکا جس پہ ہر لڑکی کا دل اور لڑکی کی ماں کی نظر تھی۔ نر اور سامیہ ہوں یا ناعہہ چچی کی مغرور، غریبی آرزو سب فواد کے آگے پیچھے پھرتیں۔ رضیہ چھوٹو تو اپنی اکلوتی فاقہ کے لیے کبھی فواد کو ڈرنے بلا رہی ہیں تو بھی فاقہ اندول کا حلوہ بنا کر اس کے گے لارہی ہے۔ فواد بیٹھا شوق سے کھانا کھا تھا سو یہ لڑکیاں ہاؤں کے بنائے کو اپنا کہہ کر بہت شوق سے پیش کرتی تھیں۔ مگر وہ بھی سدا کا بے نیاز

تھا۔ اپنی اہمیت کا احساس تھا کہ بے نیازی اور اترا ہٹ کر نہ ہوتی تھی۔ اور وہی تو تھا جس پہ مقاب نامی کرکٹ لڑائی کر کے پھرتی تھیں۔ ورنہ حنا تو بھٹکل الیف اسے کر کے دیتی ایسا کیا کہ نہ تو پھر خط پتر لکھا نہ ہی پھولی کوڑی کھرتی تھی۔ نقلی ریکارڈ اس کا اتنا برا تھا کہ نامی کرکٹ رہتی تھیں۔ مگر وہ سب تھا جس نے نامی اور آغا کریم کا ہر جگہ سر شرم سے جھکا تھا۔  
 "نالا! تم گھنا" الیف اسے میں دوبارہ مل ہو کر بدھائی چھوڑ کر آواز گزنی میں مشغول مسکرت کاغذی سے اور کھنے والے تو بے لفظوں کہہ بھی دیتے تھے کہ ان گھول کا بھی پرانا شاسا ہے جہاں دن سوئے اور راتیں جاتی ہیں۔  
 وہ سر جھٹک کر کچن میں آئی تو مسرت جلدی جلدی کپڑے سے سلیب صاف کر رہی تھیں۔ ان کی بیانی میں آواہک چائے پڑی تھی۔ ان سے کچھ کہنا۔  
 بے کار تھا اس نے ٹرے اٹھا لیے۔  
 لائن میں فضا چچی کے ساتھ والی کرسی پہ فواد بیٹھا تھا۔ وہ اسے مسکرا کر بہت توجہ سے کچھ بتا رہی تھیں اور وہ لاچار والی سے بن رہا تھا۔  
 محل اس کے کپ میں چائے اندر لے رہی تھی کہ وہ کہہ اٹھا۔  
 "میرے کپ میں چینی مت ڈالو۔"  
 "نہیں ڈالو۔" وہ بیٹھنے کے بل کھاس پہ بیٹھی سب کو چائے اٹھا کر دے رہی تھی۔  
 "اوسے بیٹا! چینی کیوں نہیں پیا رہے؟" فضا چچی بہت زیادہ فکر مند ہوئیں۔  
 "چوٹی کچھ دھت لود کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"  
 "اوتے تو سارٹ ہو اور کیا لود کرو گے؟" آرزو اسی بل سامنے والی کرسی پہ آ بیٹھی تھی۔ پھر میری چائے میں آواہ چھ چینی محمل۔  
 وہ فواد کے بائیں سامنے ٹانگ پہ ٹانگ پر چڑھا کر بیٹھی تھی۔ چست مسافید ٹاؤنر اور لوہر قد سے کھلے والی ریڈ شارٹ شرٹ۔ کندھوں تک اسٹینپ میں کئے

بائیں "اور گزنی عام سا چو جس کو بہت محنت سے اسے قدر سے پرکشش بنانا تھا مگر کی کلن سی آئی ہر اس کو بہت شہرہ کھاتی تھیں۔  
 "فٹ تو رکھنا پڑتا ہے خود کو۔ محل! یہ کباب پکڑا نا۔" فواد نے ہاتھ بڑھا کر کہا تو محل نے فوراً کباب کی پلیٹ اٹھا کر وہی چابی اور دیتے دیتے اس کی انگلیاں فواد کے ہاتھوں سے مس ہوئیں۔ وہ چونکا تو گھر آکر محل نے پلیٹ چھوڑ دی۔ سدھ کر جاتی اگر وہ تمام نہ لیتا۔ محل نے فوراً "ہاتھ چھین لیا۔ وہ پلیٹ پکڑے ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا چونکہ کرسب کچھ بھول کر جیسے اسے پکی دھو دیکھا ہو۔ اس لیے بھر کا عمل تھا۔ اس نے سرخ پچھیر لیا تو وہ بھی دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔  
 فضا چچی اور آرزو کی اور طرف متوجہ تھیں۔ کسی نے بھی وہ لمحہ محسوس نہ کیا تھا وہ اگر گز بھی چکا تھا اور فواد وہ وقتے وقتے سے اس پہ ایک نگاہ ڈالتا تھا۔ جو بیٹھنے کے بل کھاس پہ بیٹھی سب کو چائے سو کر رہی تھی۔ ذرا سا سر جھٹکائی تو بھوری ہوئی میل اور اوچی لگتی۔ سر اٹھاتی تو پوئی ساتھ ہی جھوٹی اور وہ کلج سی شہری آنکھیں ان ساری لڑکیوں کے پاس اس جیسا کچھ بھی تو نہ تھا۔  
 وہ چائے کے سپ لیت خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔  
 شام میں وہ کمرے میں بند پڑھتی رہی پھر مغرب ڈھل گئی تو کچن میں آگئی جہاں مسرت پھرتی سے کنگ پور پور پور پور کاتی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ چن میں اور کوئی نہ تھا اور سارا پھیلا ابقیتا۔  
 انہی کو سینہ تھا۔  
 "اماں! یہ نامی امان یا چاہوں میں سے کوئی کھانے کی ذمہ داری کیوں نہیں لیتا؟ ہمیشہ آپ ہی کیوں بناتی ہیں؟" وہ سب کچھ کہہ کر ہول گئی تھی۔  
 "تو ہمارا گھر ہے بیٹا! میں یہ کروں گی تو کیا ہو جائے



”آپ تھکی نہیں ہیں ان کی خدمت کرتے کرتے؟“

”نہیں، محض کیسی؟“ وہ اب جھک کر جوں جوں جلا رہی تھیں۔

”اچھا بتائیں کیا بتانا ہے؟ میں کچھ کر اؤں۔“

”برائی تو بتائی ہی ہے، بانی مرتاب بھائی سے پوچھتی ہوں۔“ اور اس بانی مرتاب تائی نے بچن کے دروازے سے جھانکا۔

”کھانا بھانا شروع بھی کرو مسرت! روز دیر ہو جاتی ہے۔“

مسرت جوں جوں جلاتے فوراً پٹی۔ ”جی بھائی! اس شروع کر رہی ہوں، آپ بتائیں برائی کا سبب کیا کہہ سکتا تھا ساتھ کیا باتوں؟“ وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ان کے سامنے جا کر پوچھنے لگیں۔

”ساتھ ہی مفر قہمہ بڑا دو، کباب بھی مل لیتا، اور دوپہر والا روٹی گوشت بھی گرم کر لیتا، آلو کا ایک سالن بھی بناؤ، سلاور رائے بھی نہ بھولنا۔“

”جی اور پیٹھے میں؟“

”دیکھ لو،“ وہ بے نازی و نخوت سے گویا ہوئیں۔

”پڑنگے بناؤ یا ذیل روٹی کی کھیر،“ اور ایک اچھٹی نظر اس پر ڈال کر پلٹ گئیں۔

”ایک ٹامہ پونچھ بھر بھر کے آپ تین تین چار چار دس بتاتی ہیں، مہر رات کے لیے کچھ پچھائی نہیں ہے۔“ وہ کلبستی بھی تھی اور حیران بھی ہوئی۔

”تم خود ہی تو کہتی ہو کہ وہ ہمارا مال حرام طریقے سے کھاتے ہیں پھر حرام میں کیا برکت ہوتی ہے بتانا؟“ ان کے منہ میں برسوں کی تھکن تھی اور کہہ کر وہ پھر سے کنگ بورڈ پہ جھک گئیں۔

وہ بالکل چپ سی ہوئی۔ واقعی کیوں یہاں دھپچے کے دھپچے ایک وقت کے کھانے پہ ختم ہو جاتے تھے اس نے تو بھی اس پہلو سے سوچا ہی نہ تھا اور لیاں بھی ان کے ہر ظلم و زیادتی سے آگاہ تھیں پھر بھی چپ چاپ سے جاتی تھیں۔

”ہمارا مال!“ دل میں ایک کانٹا سا بچا گیا۔

برس قبل ابائی فریخت سے پہلے یہ فیکٹوریاں یہ جائیدادیں، بینک بینکس، یہ امپورٹ ایکسپورٹ کی پوری برائیں امپائر سب ابا کا تھا اور یہ تھا کہیم یہ راجہ بازار میں کپڑے کی ایک دکان جلاتے تھے، عطران بچا ایک معمولی سی کمپنی میں انجینئر بھرتی تھے اور آرزو کے والد اسد تھا وہ تو وہ ہم کی طرح تھے، بے روزگار تھے، گھٹو اور ٹالاق پھر کیسے ابا کے جہلم کے بعد وہ اپنے اپنے کرائے کے گھر خالی کر کے باری باری اوھر ان بے بہ آغا ابراہیم کا گھر، آغا ہاؤس، تین منزلہ عالی شان محل نما کو بھی تھی، چلی منزل پہ آغا جان کی فیملی نے بسیر جمایا، بالائی پہ نصف چاچی نے اور سب سے اوپری منزل پہ اسد چاچی کی فیملی کا قبضہ تھا۔ وہ چند دن کے لیے آئے تھے، مگر پھر وہ چند دن بھی ختم نہ ہوئے۔ بات بے بات جگہ کی کمی کا دروہا جانا یہاں تک کہ ماسٹر بیڈ روم سے مسرت اور محمل کو نکال کر اسٹور میں شفٹ کر دیا گیا۔ وہ اس وقت چھوٹی تھی، شاید نووس برس کی، مگر جیسے جیسے شعور کی منزلیں پار گئیں، نو اندر ہی اندر لاڈ اور کاندھا اب تو عرصہ ہوا اس نے نہ بچا چھوڑا تھا۔ گھر کے مڑوں کے سامنے تو خیر وہ زبان بند ہی رکھتی مگر تائی پچھو یں سے برابر کا مقابلہ کرتی اور کزیز تو کسی کھاتے میں نہ تھیں۔ لیکن اس زبان چلانے کے باعث اس پہ سختیاں بڑھتی گئیں۔ وہ محض زبان سے جواب دے جتنی تھی مگر تائی اباں وغیرہ سرے سرے جیسے بھی استعمال کرتے۔ جب سے اس نے اپنے ذاتی جیب خرچ کے لیے ایک دوست کے والد کی اگینڈی میں ٹیوشنز دی شروع کی تھیں اس کو گھر واپسی میں دیر ہو جاتی اور قہمہ جتنا، یا قصداً اس کے لیے وہ پیر کا کھانا نہ رکھا جاتا۔ ایک دفعہ اباں ایک روٹی اور سالن کی پلیٹ بچا کر کمرے میں لے گئیں، عکرم تائی مرتاب کی نگاہ پڑی تھی اور گھر میں بھونچل ہی آگیا۔ وہ وہ باتیں سنائیں مسرت کو ایسے ایسے ”چوری“ کے الزامات و القابات سے نوازا کہ مسرت پھر بھی اس کے لیے کچھ نہ بچا سکیں۔ شاید تائی یہ سب اس لیے کرتی تھیں

تاکہ وہ یوشن چھوڑ دے اور جو پندرہ سو روپیہ اس یوشن سے ملتا ہے وہ اسے نہ ملا کرے۔

اور یوشن کی اجازت بھی تو کتنی مشغول سے اسے ملی تھی۔ جب سب کے سامنے ہی اس نے پوچھ لیا تو شروع میں تو سب ہی اکھڑ گئے لیکن اس کا فقرہ کہ ”ٹھیک ہے“ ان کی تانخہ ہے، لائے آغا جان اسیرو بانی کو ملتی ہے، کیونکہ اگر مجھے راکٹ منی نہ ملی تو میں سدھ اور مرین کے ہر ہاتھ اور منگے جوڑے کو آگ لگا دیتا ہوں، کیونکہ اگر تائی جتنی جتنی ہو جتنی سدھ اور مرین کے عزیز دس منٹ کی بحث کے بعد اسے اجازت مل ہی گئی تھی اور ابھی جو اباں نے یاد دلایا کہ وہ لوگ ان کا مال کھاتے ہیں، تو وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ کچھ ایسا ضرور ہے کہ آغا جان اس میں سالہ لڑکی سے خائف ہیں۔ اگر بھی جو وہ اپنا حصہ مانگے کھڑی ہو جائے تو۔ تو کیا ان کا کیس اتنا کمزور ہے کہ وہ عدالت کا فیصلہ اپنے حق میں نہ کرا سکیں گے اور انہیں ہر چیز محمل کے چاٹنے کرنی پڑے گی؟ اور کیا وہ ہیں سالہ لڑکی اتنی اہمیت سے کہ وہ ان سب کو ان طرح کے اسٹے ماہر اور چالباز کھاڑیوں کو اپنی انگلیوں پہ نیچا سکے؟

جواب ایک زور دار قہقہہ تھا۔ وہ بھی اباں کے خلاف اٹھ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اگر بھی اس کے ہاتھ ان کی کوئی کمزوری لگ جائے، کوئی دھتکتی رنگ منے جا کر وہ اپنے سارے حساب چٹا کر سکے تو کتنا اڑا آئے۔ مگر تائی کیا دھتکتی رنگ ہو سکتی تھی ان کی؟

”بات سنو،“ مرتاب تائی نے پھر سے بچن میں جھانکا تو وہ اپنے خیالات کی بہکت اڑوسے چوکی۔

”فواد کہہ رہا ہے پیٹھے میں چاکلیٹ سونقے ہوتا چاہیے یوں کہ ابھی ساتھ ساتھ شروع کر دو اور ہاں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ بہت عرصے بعد میرے پیٹھے کی خاص پیٹھ کی آغوش کی ہے۔ بہت تان و خراور تنبیہ بھرے انداز میں کہہ کر وہ پلیٹ گئیں اور محمل کے ذہن کی جھٹکی رو ایسی ایک گتے پہ منجمد ہو

تاکہ وہ یوشن چھوڑ دے اور جو پندرہ سو روپیہ اس یوشن سے ملتا ہے وہ اسے نہ ملا کرے۔

اور یوشن کی اجازت بھی تو کتنی مشغول سے اسے ملی تھی۔ جب سب کے سامنے ہی اس نے پوچھ لیا تو شروع میں تو سب ہی اکھڑ گئے لیکن اس کا فقرہ کہ ”ٹھیک ہے“ ان کی تانخہ ہے، لائے آغا جان اسیرو بانی کو ملتی ہے، کیونکہ اگر مجھے راکٹ منی نہ ملی تو میں سدھ اور مرین کے ہر ہاتھ اور منگے جوڑے کو آگ لگا دیتا ہوں، کیونکہ اگر تائی جتنی جتنی ہو جتنی سدھ اور مرین کے عزیز دس منٹ کی بحث کے بعد اسے اجازت مل ہی گئی تھی اور ابھی جو اباں نے یاد دلایا کہ وہ لوگ ان کا مال کھاتے ہیں، تو وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ کچھ ایسا ضرور ہے کہ آغا جان اس میں سالہ لڑکی سے خائف ہیں۔ اگر بھی جو وہ اپنا حصہ مانگے کھڑی ہو جائے تو۔ تو کیا ان کا کیس اتنا کمزور ہے کہ وہ عدالت کا فیصلہ اپنے حق میں نہ کرا سکیں گے اور انہیں ہر چیز محمل کے چاٹنے کرنی پڑے گی؟ اور کیا وہ ہیں سالہ لڑکی اتنی اہمیت سے کہ وہ ان سب کو ان طرح کے اسٹے ماہر اور چالباز کھاڑیوں کو اپنی انگلیوں پہ نیچا سکے؟

جواب ایک زور دار قہقہہ تھا۔ وہ بھی اباں کے خلاف اٹھ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اگر بھی اس کے ہاتھ ان کی کوئی کمزوری لگ جائے، کوئی دھتکتی رنگ منے جا کر وہ اپنے سارے حساب چٹا کر سکے تو کتنا اڑا آئے۔ مگر تائی کیا دھتکتی رنگ ہو سکتی تھی ان کی؟

”بات سنو،“ مرتاب تائی نے پھر سے بچن میں جھانکا تو وہ اپنے خیالات کی بہکت اڑوسے چوکی۔

”فواد کہہ رہا ہے پیٹھے میں چاکلیٹ سونقے ہوتا چاہیے یوں کہ ابھی ساتھ ساتھ شروع کر دو اور ہاں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ بہت عرصے بعد میرے پیٹھے کی خاص پیٹھ کی آغوش کی ہے۔ بہت تان و خراور تنبیہ بھرے انداز میں کہہ کر وہ پلیٹ گئیں اور محمل کے ذہن کی جھٹکی رو ایسی ایک گتے پہ منجمد ہو



سامیہ جھوٹی مگر سامیہ اپنے بے حد لے قدر کے باعث  
 بڑی لگتی تھی۔ مہرین اس سے اسی باعث خار کھاتی اور  
 سامیہ بھی ماں کی طرح میٹھی میٹھی باتوں میں سارا دل  
 مہرین کو مزید احساس دلانی رہتی۔ خدا شکل کی ذرا اچھی  
 تھی۔ سامیہ رنگت پر بڑی بڑی آنکھیں اسے قدر سے  
 مٹا دیتی تھیں اور کبھی آرزو اس کو ناپسند کرتی تھی۔  
 شاید وہ جانتی تھی کہ فواد کے لیے اس کے مقابلہ پہ  
 سامیہ کمزور جبکہ خدا ایک مضبوط امیدوار تھی۔  
 فواد کی باتیں سدرہ اور مہرین تو لی اسے کر کے ہی  
 پڑھاتی تھیں۔ جھوٹی تھیں جبکہ بائیس سالہ سامیہ تیس  
 سالہ ندانی اسے کرنے کا کچھ اور تیس سالہ آرزو ماشرو  
 کے لیے یونیورسٹی جاتی تھیں۔ آرزو مہرین کی پاس  
 ہونے والوں میں سے تھی اور اس کے یونیورسٹی خراج  
 جانے کی بڑی وجہ آغا جان کی سفارشیں تھیں۔ یہ  
 سفارشیں سدرہ اور مہرین کے وقت بھی کام آجاتیں  
 اگرچہ انہیں پڑھنے کا رتی بھر بھی شوق نہ تھا۔  
 "بات سنیں۔" اس نے ہلکا ہر جھلک میں سب کو  
 مخاطب کیا۔ "رات کھانے کے لیے سو فٹے بنانا ہے  
 آپ لوگوں میں سے کوئی پہلپ کرے گا؟"  
 "نہیں۔" آرزو نے ریموٹ سے چینل بدلتے  
 استے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔  
 خدا اپنے ہاتھوں پر سے یہ کیس کھینچ رہی تھی  
 لمبی سی سامیہ فوراً "فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مہرین  
 نے چہرے کے آگے رسالہ کر لیا اور سدرہ بہت  
 انہماک سے اسی وقت تلی دی دیکھنے لگی۔  
 "چلیں فائن۔" وہ واپس بکٹن میں آگئی۔  
 ڈانکنگ ہال میں روز کی طرح کھانا کھایا گیا۔  
 محل ہمیشہ کی طرح سب سے آخری کرسی پر موجود  
 تھی جو آغا جان کی سربراہی کرسی کی بالکل سیدھ میں  
 تھی۔ سدرہ اور مہرین جیسے بچڑائی بھر رہی تھیں۔  
 "بیٹھا لے آؤ۔" کھانا ختم ہوا تو مستاب نکلی نے  
 محل کو اشارہ کر کے کہا۔ سدرہ ابھی جھوٹے برتن اٹھا  
 کر کچن کی طرف گئی تھیں۔  
 "میٹھا تو آج نہیں بنا۔" وہ بہت اطمینان سے یا آواز

مردیہ بیٹھی رہی۔ فواد کے اٹھنے کے بعد یقیناً "تالی  
 نے بہت سنا لیا۔ محسوس ہو فواد کے الفاظ کا اثر زائل  
 نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کی گھر میں ایک مضبوط  
 حیثیت تھی اور پہلی دفعہ کسی مضبوط حیثیت والے  
 نے محل اور سدرہ کی طرف داری کی تھی۔ سدرہ بہت  
 سی خواہشیں رات کو کرتے ہوئے سوتی تھیں۔  
 صبح کاغذ بس کے لیے وہ اسٹاپ پر رکھے پانی طرف  
 آئی تو فہم ابھی تک اوپر ہی اٹھا تھا۔ فواد نے بیٹھے  
 ہوئے اس نے سرسری سار کھا۔ وہ سیاہ فام لڑکی اسی  
 طرح بیٹھی تھی۔ گود میں رکھی کتاب کے کناروں پہ  
 مضبوطی سے ہاتھ جمائے خاموشی سے سامنے دیکھ رہی  
 تھی۔  
 وہ جھلی روکتی بیٹھی ہی تھی "اور بے دلی سے بس کا  
 انتظار کرتے لگی۔ اس نے وہی کل والا جاکر کاکرتا  
 جینز کے اوپر پہن رکھا تھا اور بال لٹوٹی پونی میں بندھے  
 تھے سوچیں فواد کے ارد گرد کھوم رہی تھی۔ صبح وہ  
 جلدی لگتی تھی تب تک وہ کچھ نہیں آیا ہو یا تھا۔  
 اس کا گھر وہ سری منزل پہ تھا جو کبھی تو غفران پچا ہفتہ  
 چلی کی آج کا گھر گھارے والا گھر فواد کا پندرہ تھا سو  
 وہ اس کو عرصہ پہلے لاٹ کر دیا گیا تھا۔ فضا پچی کی وہ  
 بیٹیاں اور ایک بیٹا حسن ہی تھے، سو وہ گھر ان کی  
 ضرورت سے زائد تھا اور یہ تو محل کا دل ہی جانتا تھا  
 کہ وہ گھر تو اپنے ہونایا ہی اس کے لیے تھا۔  
 سیاہ فام لڑکی اسی خاموشی سے سامنے دیکھ رہی  
 تھی۔ وہ زور ہونے لگی تو اوپر اوپر گردن گھمائی۔ سیاہ  
 کتاب دیکھ کر کل کا واقعہ یاد آیا۔  
 "یہ کتاب کب ملی تھی کو؟" بغیر تمہید کے  
 اچانک سوال۔ اس لڑکی نے اطمینان سے گردن اس  
 کی طرف موڑی۔  
 "دوسرا سال پہلے۔"  
 "یہ کس نے آپ کے لیے خصوصاً؟" چھوڑی تھی؟  
 "اور۔۔۔ اور اس کے بعد؟" یہ حیرت منی سوال پہ

"سے کول۔" وہ ذرا سا مسکرائی، "موتی آنکھوں کی  
 چمک بڑھ گئی۔  
 "آپ کو اچھا لگتا ہے؟" اس نے غور سے اس  
 چمک کو دیکھا۔  
 "بہت زیادہ۔"  
 "آپ اسے کیسے جانتی تھیں؟ میرا مطلب ہے یہ  
 تو صدر یوں پرانی کتاب ہے۔"  
 "بس میں جانتی ہوں۔"  
 "اور یہ کتاب۔۔۔ یہ آپ کو آپ کا ماضی حال اور  
 مستقبل کیسے دکھاتی ہے؟"  
 "اس میں سب لکھا ہے۔ گزشتے واقعات اور وہ جو  
 میرے ساتھ پیش آنے والا ہے اور مجھے ایسے موقع پہ  
 کیا کرنا ہے سب لکھا ہے۔"  
 محل کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ سیاہ فام لڑکی اسے  
 بہت عجیب بات بتا رہی تھی۔ جانے کیسی پر اسرار حید  
 بھری کتاب تھی۔  
 "آپ کو اس سے کتنا فائدہ ہوتا ہے؟"  
 "جتنا تمہاری سوچ سے بھی اوپر ہے۔"  
 "تو آپ کے تو بہت مزے ہوں گے، آپ اس کو  
 پڑھ کر سب کچھ جان جاتی ہوں گی۔"  
 "ہاں مگر اس میں کچھ عمل ہیں، پہلے وہ پر فارم  
 کرنے ہوتے ہیں، پھر ہر چیز دیسے ہی ہوتی ہے جیسے  
 اس میں لکھا آتا ہے۔"  
 "عمل؟ عملیات؟" وہ چونکی اندر کوئی الارم سا بجلا۔  
 یہ تو کوئی سفلی علم کی ماہر بیٹی تھی اسے ذرا احتراز برتا  
 چاہیے۔  
 "ہاں۔" سیاہ فام لڑکی مسکرائی۔ "جو وہ عملیات کر  
 لے۔" وہ اس کتاب کے ذریعے دیا پہ رائج کرتا ہے،  
 سب لوگ اس کی سطح میں آجاتے ہیں، اور ہر شے  
 اس کے لیے نسخہ ہو جاتی ہے۔ صرف میں نہیں، اگر  
 تم بھی اس کتاب کا خاص علم سیکھو تو تمہیں اس کے  
 الفاظ میں اپنا ماضی حال اور مستقبل نظر آنے لگے  
 گا۔"  
 "اور۔۔۔ اور اس کے بعد؟" یہ حیرت منی سوال پہ



سوال کیے جارہی تھی۔  
 ”اس کے بعد تم اس کتاب کو چھوڑ نہیں سکتیں“  
 تمہیں اپنی زندگی اس سے باندھ کر ہی گزارنی ہوگی۔“  
 ”اور اگر میں اسے چھوڑ دوں تو؟“  
 ”تو تم تباہ ہو جاؤ گی، تمہاری ہر چیز ہر محبت سب تباہ ہو جائے گا۔ اس کو لے کر تم چھوڑ نہیں سکتیں۔ یہ سب لٹا آسان نہیں ہے۔“  
 محل گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میری بس۔۔۔“  
 اسی بل بس قریب آئی نظر لگی وہ وہ ذکر بس کی طرف جالنے لگی۔  
 ”تم ایک دن ضرور آؤ گی میرے پاس“ سیاہ فام لڑکی مسکرائی تھی۔ ”تم ایک دن ضرور آؤ گی اگر یہ کتاب مانگنے آؤ گی۔ میں جانتی ہوں“ تم لوگوں کی مثال ہوئی ہو۔  
 تمہارا دل زخمی اور ہاتھ خالی ہیں اور جس دن یہ دل پوری طرح ٹوٹ جائے گا میں تمہیں یہ کتاب دے دوں گی۔ جاؤ تمہاری بس آگئی ہے۔“  
 وہ خوف زدہ سی بس کی طرف لگی تھی۔ آج راؤ پکڑ کر اندر چڑھتے تھے پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی نہ جانے کیا معرہ تھا۔

شام کو اس نے بہت محنت سے چاکلیٹ سو فلے بنایا اور جب وہ خوب ٹھنڈا ہو گیا تو ٹرے میں سجا کر اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگی ”ابھی دوسری سیڑھی پہنچی تھی کہ آرزو بچے آئی دکھائی دی۔“  
 ”یہ کس کے لیے ہے؟“ وہ ہاتھ پہلے والے لمبے بھر کو روکی ”فادی کے لیے ہے؟“  
 ”جی“ انہوں نے کل کھاؤ تھا میرے پاس تمام کہاں تھا“ آج بھی کسی کو یاد نہ آیا تو بتائی دیا۔“ اس نے بے نیازی سے شانے بٹنگ وہ دوسری سیڑھی پہنچے اٹھائے کھڑی ٹھہر گئی کہ آرزو بچے اترے اور وہ اوپر جا سکے۔  
 ”اور ذرا کی تیاری کر لی تم نے؟“ آرزو دینے سے اتر کر اس کے پاگل سامنے آکھڑی ہوئی۔

”اماں بتا رہی ہیں۔“  
 ”تو رہ نہ بتا لیا ہے؟ میں نے کہا بھی تھا کہ تم نے چیک کیا؟“  
 ”آپ سیدھے سیدھے کہہ دوں کہ میں چلی جاؤں اور آپ یہ ٹرے فون بھائی کو دے کر اپنے نمبر پر نہیں تو لیں پکڑیں۔“ اس نے ٹرے زور سے اسے بھائی۔  
 ”مجھے اور بھی کام کرنے ہیں“ اور کھٹ کھٹ یہ پڑھیاں اتر کر کچن کی طرف چلی گئی۔  
 ”پر مینز“ وہ برساتی۔  
 مگر محل کو معلوم تھا کہ اس کی بلند آواز فوٹو سن چکا ہو گا اور اب آرزو جو چاہے کر لے وہ جانتا تھا کہ کام کس نے کیا تھا اور غیر کون بنانا چاہ رہا تھا۔  
 اور پھر یہی ہوا۔  
 رات کھانے پہ جب سرٹ نے چاکلیٹ سو فلے لا کر رکھا تو فواد نے سب سے پہلے ڈالا۔  
 ”یہ تم نے بنایا ہے محل؟“  
 ”جی۔“ وہ سادگی سے بولی۔  
 آرزو نے ناگواری سے پہلو بدلا۔  
 ”بہت فینسی ہے“ تم ہی روز بھٹا کیوں نہیں بناتیں؟“  
 ”اتنی فارغ نہیں ہوں میں سو کام ہوتے ہیں مجھے“  
 انگریز ام ہو رہے ہیں میرے دل کرے گا تو نادیا کروں گی ورنہ سب جانتے ہیں محل سے یہ جی حضور ریاں نہیں ہوتیں۔ اماں ایک پھلکا مجھے اٹھاویں۔“ وہ مصروف سی اماں کے ہاتھ سے پھلکا لینے لگی جیسے اسے فواد کے تاثرات کی پرواہ نہ ہوئی۔  
 وہ تانیدار ”سرہلا کر سو فلے کھانے لگا مگر بار بار نگاہ ہلک کر اس کے منوی چہرے پہ جا چکی تھی جو بہت محن سی ابھی تک کھانا ہی کھا رہی تھی سو فلے کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

اس کے چہرے پہ پھیلا اشتیاق پھیکا پڑ گیا۔ اس نے قدر سے بے بسی سے ان کو دیکھا۔  
 ”مگر اماں! ابھی کیسے؟ وہ بارش۔۔۔ بعد میں کروں گی۔“ وہ مستانی۔  
 ”ہاں تو بارش کے لیے ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جاؤ“  
 شایاں جلدی کو اور نہ ان کے سوٹ پھر نہیں کتنے کاڑا تھا؟ وہ نڈا کے روپے کو انگوٹھوں میں مسل کر ستائی انداز میں پوچھ رہی تھیں۔  
 ”صرف ڈیڑھ ہزار کا تائی! میں کل ہی آپ کو بھی لے چلی ہوں“ وہاں بہت اچھے برٹس آئے ہوئے تھے“ آپ کا کھانا کھیں تو ویسے بھی بہت فینس ہے“



”آپ کیوں نہیں؟“

”کچھ نہیں، خیر، بناؤ کیونکہ اور کس دالے  
بہانا۔“ وہ اپنی پسند جان کر لیے ڈگ بھرتا ہر نکل گیا۔  
اس کے آنسو پھر سے بہنے لگے جانے کس بھون  
میں وہ یہ سوچ بیٹھی تھی کہ اگر وہ اس کی مٹھی میں آ  
گیا تو اسے اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ وہ سب ایک جیسے  
تھے بے حس، خود غرض، مطلق۔

اور جب تک پکڑے بنے، بارش ہلکی ہو چکی  
تھی۔ وہ سب لڑکے لڑکیاں برآمدے میں بیٹھے دامن  
میں ہی پکڑے جٹ کر گئے تھے اور اب حسن سب کو  
لانگ ڈرائیو لے جانے کا پلان بنا رہا تھا۔  
”تم لوگ بھی کیا یاد کرو گے، کس سخی سے پلاڈا  
تھا۔“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا فرضی کار جھاڑ کر  
کہہ رہا تھا۔

حسن فضا چچی کا بیٹا اور ندرا ساسیہ کا بھائی تھا۔ شکل  
میں ندرا سے مشابہ تھا، بڑی بڑی پرکشش آنکھیں اور  
ساقوں پر گھٹت۔ الہیت عادتوں میں وہ قدرے مختلف تھا۔  
اس نے فضا کی بیٹیوں زبان تو مستعار لی تھی، مگر کڑوا  
دل نہیں لیا تھا۔ وہ گھر کا واحد فرد تھا، بول کا بھی اچھا تھا،  
نرم گو، صاف دل، اور پینڈ سم۔  
ابھی بھی وہ آفس سے آیا تھا اور کوٹ کرسی کے  
پیچھے رکائے آستینیں فولڈ کیے بیٹھا وہ چٹکن کے باوجود  
سب کو آؤٹنگ پر لے کر جانے کی دعوت دے رہا تھا۔  
”کون کون چلے گا؟“ ساسیہ بلند آواز میں پوچھنے لگی  
تو محمل بھی دل میں چلتی خواہش کے باعث قریب آ  
گئی۔

”میں بھی چلوں گی۔“

سب نے ٹک کر اسے دیکھا تھا۔

کندھے پر بس لڑکائے بالوں کو ایک اسٹائل سے  
بینڈ میں جکڑتی آرزو نے، جو اندر سے باہر آ رہی تھی،  
قد رے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ”ان کو بھی یہ شوق  
ستانے لگے ہیں؟“ اور پھر سب ہی ساتھ ساتھ بولنے  
لگے۔

”تمہاری جگہ نہیں بنے گی۔“

”ہم بیٹی کی ہائی ایس لے کر جا رہے  
ہیں پوری ہیں۔“  
”تم باہر جا کر کیا کرو گی؟“ سدا  
مستاب بالی کی فونو کالی۔  
”بیٹا جان! آپ کے تو انگریز ام ہو  
چکی، بہت فکر مندی اور پیار سے اسے  
”خوب دل لگا کر رخصت“ آپ نے بہت  
ہیں، جاؤ شہنشاہی گورنمنٹ کم از کم وہ وہ  
ابھی شروع کرو گی تو رات تک پورا  
تائی مستاب نے فضا چچی کی  
انتظار کیا اور پھر تیزی سے بولیں۔  
”میں تم نے باہر کیا کرنا ہے  
بنائے گا؟ میں لگ ڈرائے کر کے  
پوچھنے والا ہوں ان کو۔ بس مفت  
جاتے ہیں۔“

فوانے لمبے بھر کو کچھ کہنا چا  
حسن جو خاموشی سے ساری کار  
کہہ اٹھا۔

”کوئی محل سے بھی تو پوچھتے  
ہیں، اب ہم اس سے پوچھ  
بولیں۔ حسن سمجھے بھر کو بالکل چپ  
بیٹے کے جھاڑے جانے پر واضح  
”جاؤ تم اندر جاؤ۔“ اسے  
مستاب سے مقابلہ کرنا ان کے  
وہ پیر پختی بھاگ کر چپن سے  
جھکائے پھوٹ پھوٹ کر رونے  
کالی دیر بعد روتے روتے  
ڈرائیو سے باہر نکلتی ہائی ایس  
اس میں ایک دو لوگوں کی  
تھی۔

بے اختیار اس کا دل  
میں زہر ملا دے اور کاش کہ



ساری رات وہ روتے



کر لیا تھا کہ وہ آئندہ اس سیاہ فام لڑکی کے قریب بھی نہیں جائے گی۔ سچ یہ بھی ہے کہ نہ ہی اس سے بات کرے گی۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ایک دفعہ پھر اس نے اس کی آفرین ملی تو شاید وہ اسے قبول کرے کسی ایسے گم نام راستے پہ نکل پڑے جہاں سے واپسی کا سفر ناممکن ہو۔

اس روز سدہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آ رہے تھے۔ خیر مسرت نے اسے تب ہی جب وہ گھر بھر کی صفائیاں اور لڑکیوں کی پھرتیاں دیکھ کر حیران سی ماں کی طرف آنی تھی اور نہ پہلے تو جب بھی بہن پر میں میں لاؤنج کا دروازہ آہستہ سے کھول کر آنی تو گھر میں سناٹا اور پرانی چھائی ہوتی تھی اور آج.....

بہن کی سامنے ہاتھ کے جھانڈے سے چھت کے چالے صاف کر رہی تھی۔ سدہ ڈراٹنگ روم کی ڈیوڑھیوں کو اسے سر نو ترتیب دے رہی تھی۔ بند لائیں کے سر پہ کڑی لائن کی صفائی ستھرائی میں مشغول تھی تو مہربان متاب تانی سے سر ہلاتے کوئی برائیت سن رہی تھی۔ ایک آرزو ہی تھی جو تیسری یہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے کچھ بھی کالوں پہ واک مین لگائے کسی میگزین کے ورق الٹ رہی تھی۔ بے پروا ہے نیاز اور مشغور شکر کہ وہ خوب صورت نہ تھی ورنہ شاید وہ آسمان سے نیچے اترتی۔

”رشتہ سدہ کا ہے اور یہ خود غرض خاندان سارے کا سارا لگا ہوا ہے۔“ متطلب؟

”لو نہ آہستہ بولو۔“ مسرت نے گہرا کر اوہ اوہ دیکھا۔ پھر آہستہ سے بتانے لگیں۔ ”دراصل بھابھی بیکر کا حفصہ اندازہ ہے کہ رشتہ سدہ کا ہی ہو گا۔ نعمان بھابی کی بیگم نے خصوصاً کسی کا نام نہیں لیا سو فہمہ کو شاید کچھ امید ہو۔“

”نعمان بھابی کی بیگم کون؟“

”تمہارے لپا کی دد کی رشتہ دار ہیں۔ ان کا بیٹا فرقان اریو ٹائیکل انجینئر ہے بہت اچھا کھانا ہے اور ایک بی بی ہے شادی شدہ۔ آسٹریلیا میں رہتی ہے۔ بیگم

نعمان نے کسی کے ذریعے کھلوایا ہے۔“

”اور یہ ساری لڑکیاں اس امید سے بھی ہوتی ہیں کہ شاید وہ ان کا رشتہ مانگ لیں۔“ وائٹ ریش۔“

بہن کراہنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

شام میں مسرت نے اسے چمن میں مدد کے لیے بلوا لیا تھا۔

”اچار گوشت، برانی، سب کباب، فراڈ چھلی اور کتنا کچھ کریں گی آپ؟“ وہ برتنوں کے دھکنے اٹھا اٹھا کر جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”یہ سب تو تیار ہے۔“ مسرت بیٹھے میں دو چیریں اور رشین ملا دینا دو اور چائے کے ساتھ اسٹیکس بھی۔“

”چائے بھی اور کھانا بھی؟“ وہ کمرے ہاتھ رکھے حیرت سے بولی۔ ”اتنا کچھ کس لیے؟ کیا اتنا رشتوں کا کال تھا سدہ وہاں کی کس لیے؟“

”او نہ آہستہ بولو۔“

”میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں؟ ابھی جا کر منہ

بھی کہہ سکتی ہوں۔“

”اور تمہارے کس سے؟ باتیں کچھ سننی پتی ہیں جس سے۔“ وہ جھکنے سے آواز دی بوس اور خاموش سی ہو گئی۔ پھر بند کی کہ کس کس کام میں جت لگی۔

چائے کی برائی اس نے بہت اہتمام اور محنت سے سجا لی تھی۔ اس وقت بھی وہ بچوں کے بل بیٹھی برائی کے کچلے حصے میں پیش میٹ کر رہی تھی جب متاب تانی کچھ کہتی ہوئیں چمن میں داخل ہوئیں۔ سدہ ان کے پیچھے تھی۔

”سب تیار ہے؟“

”جی۔“ اس نے ہنسنے پھٹنے گردن اٹھائی۔ متاب تانی قدرے غلٹ میں نظر آ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ سدہ اُٹھ کر آگے لے جاؤ اور مصافحہ کدھر ہے؟ میرا خیال ہے چائے کے بعد ہی بات کی کر دیتے ہیں مصافحہ تب تک میٹ کر لیتا۔

”وہ تو رشتہ مانگنے آئی ہیں تانی! بات اتنی جلدی کی کر دیں گی؟“ وہ حیران سی ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہوئی اور

تانی بھی کسی اور موڈ میں تھیں سوچنے لگیں۔

”ہاں تو اب مزید کیا انتظار، لڑکائیاں اچھا اور خوش شکل ہے۔ پھر ہمارے پاس کوئی کمی تھوڑی ہے۔ ممکن آرام سے مہینے دو تک کریں گے اور شادی سال ڈیڑھ تک ایسی دھوم دھام سے شادی کروں گی سدہ کی کہ زمانہ دیکھے گا۔“ ان کے انداز سے تکبیر کی بو آتی تھی۔

ایک لمحے کو محفل کا دل چلایا، نفیس سی وہ خاتون جو ڈراٹنگ روم میں بیٹھی ہیں وہ سدہ کو پائیند کر کے چلی جائیں اور تانی صدمے سے بھاری پرچائیں۔ آخر خود یہ غائب لوگ کسے آئے تھے تھے ہیں؟ مگر شاید اوہ تو سارے پلان بن چکے تھے۔

سدہ نازک پتیل کی ٹک ٹک کرتی ٹرائی دھکیلتی گئی اور وہ خالی پکن میں خاموشی سے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ مسرت بھی مہمانوں کے پاس نہیں چلے گئے تانی کو ان کے گھر کا فرد ہونے کا خیال آیا تھا اور ان کو وہیں بٹھا لیا تھا۔

”نشو۔“ محل نشو! ناعمد چچی نے زور کی آواز لگائی تو وہ تھری سے اٹھی۔

”نشو! کھانا کھانے کی گئی؟“

”ہاں! میں لاؤن میں بیٹھ کر کڑک کر بڑے آئینے میں خود کو دیکھا۔“

لوہی پونی ٹیل سیاہ جینز پہ لمبا سفید کرتا اور گردن کے گرد مخصوص انداز میں لپٹا ایک ٹائی لینڈ والی ڈیپٹہ بنے وہ بہت سے جوڑوں کے ساتھ چلائی گئی۔ یہ غالباً کچھلنے سے چھٹی بھر عید پہ بٹوایا گیا خوراک تھا جواب تک خاصا گھس چکا تھا۔

”خیر! کون سا میرے رشتے کے لیے آئے ہیں۔“ وہ شائے اچکا کر ڈراٹنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔

نفیس اور باوقار سی بیگم نعمان بڑے صوفے پہ ٹکٹف سے بیٹھیں مگر ان کے ہوئے تانی متاب کی بات سن رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر قدرے خوش دلی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”محل بیٹا! آپ اب آئی ہو جب سے پوچھ رہی تھی تمہاری بات کی۔“ وہ ایک دم گڑبڑا سی گئی۔

”منہل کر آگے بڑھ کر ملی۔“

”السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام،“ اتنی دیر سے پوچھ رہی تھی تمہارا۔“

”وہ میں۔“

”ہاں آئی تو بیٹا! تم اس اہتمام میں گئی ہوئی ہو گی۔ مجھے یاد ہے جب میں کرم بھابی کی عیادت کے لیے آئی تھی تو اس اکہل پتی نے سارا کھانا بٹایا تھا۔“ وہ اسے اپنے ساتھ بٹھا کر پیار سے دیکھتے دیرس پر لائی بات کر رہی تھیں۔

وہ گہرا کسمبھی تانی کے تھے نعوش کو وہ کبھی تو کبھی سدہ کی مختصر ہوئی رکھتے کو۔ وہ تو اس نشو دینے آئی تھی پھر اتنا استقبال چہ معنی وار۔

”آپ یہ ڈرامہ مکمل میں لیا تھا بھی ایسے۔“ تانی نے ان کی توجہ پانی چاہی۔

”ارے یہ تو میری شہرت ہے، محل! اتم نے بتائی ہیں نا مجھے یاد ہے تم نے اس دفعہ بھی کھانے میں یہ بیٹائی تھیں اور فری (بیٹی) اسپیشلی تم سے رپسی پوچھ کر گئی تھی۔“

اور اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

بے بسی وہ بے چارگی سے وہ بمشکل سر ہلا پاری تھی۔ اوہ تانی متاب پریشان ہو رہی تھیں۔ یہ تو بیٹہ سے ہو ناچلا آ رہا تھا۔ سدہ کے رشتے کے لیے آئے والی ہر مہمان کو وہ محل اور مسرت کی بیٹی کی جھڑپیں ”یہ میری سدہ نے بتائی ہیں۔“ کہہ کر پیش کرتی تھیں۔ مگر جانے کب وہ خاتون ان کے گھر کی ساری سن گن لے گئی تھیں۔

”بس بھابھی! بیچاں ماشاء اللہ سب ہی گھڑ ہیں ہمارے گھر میں۔“ نقشہ چچی نے بظاہر مسکرا کر بات منہلی مگر قدرے بے چین وہ بھی تھیں۔ کب کچھ بہت غلط تھا۔

”جی مگر یہ سب تو سدہ نے بتایا ہے۔ بے چارہ جس سے گئی ہوئی تھی۔“ مسرت نے جلدی سے کہا۔

”جی جی۔“ تانی متاب نے نوراً تاکید کی۔



”ویری گز سدرہ“ بیگم نعمان اب یاسک پھینچ لے رہی تھیں۔ ”یہ یاسک جیسے تو بہت اچھی بنائی ہے۔ سدرہ اب اس کی فلتنگ میں کیا کیا لالہ ہے؟“ اور سدرہ کے تو فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ یاسک جیسے نرم و لٹکا کیا گیا ہے۔ وہ ایک دم کھینچوڑی ماں کی شکل دیکھنے لگی۔

”دراصل میں کوئی گنگ کا بہت شوق رکھتی ہوں اور میرے بچوں کا بیسٹ بھی بہت اعلیٰ ہے، نعمان صاحب خیر منظور اور اچھے کھانوں کے رسیا ہیں۔ اس لیے ہمیشہ کہتے ہیں کہ ہم وہی ہوتا تو اس کے ہاتھ کا ذائقہ چکھ کر ہی رشتہ مانگتا۔ ویسے تو آپ کی ساری پچیاں ہی ماشاء اللہ بہت خوب صورت اور سلیقہ مند ہیں مگر محفل تو مجھے خاص طور پر عزیز ہے۔ سجدہ آیا سنے ذکر تو کیا ہو گا کہ میں کسی خاص مقصد کے لیے آ رہی ہوں تو اب یہی چوڑی کیا تمہید باندھوں مستاب آیا فرقان تو آپ کا دیکھا بھلا ہے اللہ کا شکر ہے اس نے ہر طرح سے نوازا ہے ہمیں۔ بس محفل کے لیے میں آپ لوگوں کے پاس سوال کرنے آئی ہوں اگر ہو سکے تو اسے میری بیٹی بنا دیں۔“

اور مستاب ناکی سے مزید سنا دھار ہو رہا تھا۔ ”محفل اہم اندر جاؤ۔“ انہوں نے خود کو ہیشکل نارمل رکھتے ہوئے اشارہ کیا تو وہ جو حق حق بیٹھی سن رہی تھی تیزی سے باہر نکل گئی۔

چچے کیا باتیں ہوئیں کس نے کیا کہا کب ان خاتون کو کھانا کھلانے بغیر رخصت کر دیا گیا اور تانی کے بند کرے میں سارے ہلوں کی کیا گفتگو ہوئی وہ ہر شے سے دور اپنے کمرے میں کان لپیٹے بیٹھی رہی۔ اس کا دل کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی جیسے بند غار میں روٹی اور ہوا کا کوئی وزن کھل گیا ہو۔ بے کیف اور دھیمی چمکی زندگی میں ایک دم ہی بہت خوشگوار اور سرسبز سا موزا کیا تھا۔ امیدیں پھر سے زندہ ہو گئی تھیں اور اسے لگ رہا تھا کہ ایک نئی زندگی باتیں پچھانے اس کے استقبال میں کھڑی ہے۔

”نہیں یار اب یہ سسلی ناراض نہیں ہوں۔ مجھے یاد آیا، مجھے ابھی میڈم مصباح سے ملنا تھا ایک کام کے لیے میں ذرا تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔“ محفل نے ہلکا ہر مسکرا کر کہا اور سڑ کر چل دی۔ جب وہ تیز تیز سر جھکائے چلتی تھی تو قوی پولی میل ساتھ ہی اوپر اوپر جھوٹی بہت اچھی لگتی تھی۔

چند قدم دور اس نے ذرا سامڑ کر دیکھا تاویہ بہت آرام اور آسناک سے بیٹھی اپنی فائل میں کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ تھک سے واپس آگے کو چلنے لگی۔ کتنی جلدی تاویہ، اس کی سوکانڈ ہیٹس فریڈ نے اس کی پینک مسکراہٹ کے ساتھ کے گئے آخری پتے پر پہنچ کر لپٹا تھا جیسے وہ واقعی ناراض نہیں ہے حالانکہ وہ بھی گھر میں اہل نہیں تو کھانے میں تاویہ محض سے وہ دل کی باتیں شیر کر رہی تھی مگر وہ نول ہے تو یہی سے سنی تھیں، کبھی کام میں مصروف ”ہوں ہاں“ کہہ دیا تو کبھی دستاوی نہیں۔

”اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ وہ سامنے والے برآمدے کے ایک تھماستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اسی سے سامنے ان کے سبزے کو دیکھتے سننے اور چمکی ان ہر سو گھم رہی تھی۔ گھاس پہ ٹوٹیوں کی صورت میں سفید یونیفارم میں بلبوس لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ کوئی کھانے پینے میں تو کوئی کپ شپ میں مصروف تھی سب کی اپنی اپنی دنیا تھی اور وہ ان میں گمن تھیں۔

”کیا یہی زندگی ہوتی ہے یا کیا اس کی زندگی کی سی مشکل زندگی کی اور کی نہ تھی؟“ اس نے آدروٹی سے سوچا تھا۔ ”کیا مجھے کبھی وہ خوشی نہیں ملیں گی جو میں چاہتی ہوں؟“ بڑا سا گھر ہے تھما دولت، خلعت، اثر و رسوخ محبت کرنے والا لالہ نقب بارنٹرمہ کیا یہ سب میرے قدموں میں ایک ساتھ ڈھیر ہو سکتا ہے؟ اس نے ستون سے سر ہٹا کر آنکھیں موند لیں۔ بند پکوں پہ نہرے خواب اترتے لگے تھے۔

”وہ ایرونا نکل انجینئر فواد میں ان میں سے کسی کی ہوں؟“ بڑا سا گھر ہے تھما دولت، خلعت، اثر و رسوخ محبت کرنے والا لالہ نقب بارنٹرمہ کیا یہ سب میرے قدموں میں ایک ساتھ ڈھیر ہو سکتا ہے؟ اس نے ستون سے سر ہٹا کر آنکھیں موند لیں۔ بند پکوں پہ نہرے خواب اترتے لگے تھے۔



”جیتے ہوئے محفل! بہت اچھے لوگ ہیں یہ۔ نعمان بھائی بڑے بھلے ہاں انسان ہیں اور ان کا بیٹا تو بہت ہی خوب ہے۔ اللہ نے ہماری سن لی ہے وہ ضرور ہم پر رحم کرے گا۔“

وہ کبھی کبھی بیٹہ کو اس کو جانے لگ جاتیں تو وہ خاموشی سے مسکراہٹ جائے سر جھکائے سنی چلی جاتی۔ اب تو گھر کے کام بھی آرام سے کر دیتی کچھ دن سے نائی کو جواب دینے بھی چھوڑ دی تھیں۔ پہلی دفعہ اس زمان سے نکلنے کی کوئی امید جو نہ تھی۔

سدرہ البتہ اسے اتھتے پیٹھتے بہت عجیب نظروں سے دیکھتی تھی۔ محفل پروانہ کرتی مگر اس روز تو حد ہی ہو گئی۔ وہ شام کی چائے کی برائی دھکیلتی باہر لان میں لائی تو سدرہ نے ایک دم اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔

”شاید ابھی تک ناراض ہیں۔“ اس نے سوچا اور پھر جیسے براوا کرنے کے لیے سب سے پہلے سدرہ کا کپ بنایا۔

”سدرہ آپ! اچائے۔“ اور بہت شائستگی سے مسکرا کر کپ بڑھایا۔  
 ”آئی؟ میں تمہاری آئی لگتی ہوں؟“ سدرہ نے کپ ہاتھ لیتے دور سے پوچھا۔ گرم آبی چائے محفل کے گھٹنے پہ گری وہ بلبل کر کھڑی ہوئی۔ کپ گھاس پہ جا گرا۔

”یوں لوگوں کے سامنے آئی کہہ کر تم یہ ظاہر کرتی ہو کہ میں پورھی ہو گئی ہوں ہاں؟“ سدرہ یک دم چلائے لگی تھی۔ ”مئی۔۔۔ مئی۔۔۔ مئی اس کو دیکھیں یہ ہمیشہ یہی کرتی ہے یہ ہمیشہ لوگوں کے سامنے جھکے بے عزت کرتی ہے۔“ سدرہ نے زور زور سے زونا شروع کر دیا۔

”اے ان کی تو عادت ہے یہ ہاں بیٹی تو اس گھر کی خوشی دیکھ نہیں سکتیں۔ سنہ میری بیٹی تو تم نہ کر اور اب کھڑی کیا ہو جاؤ اپنی محسوسات کے جاؤ میرے سامنے سے۔“ نائی متاب نے بھی بہت دنیوں کا غصہ ایک دم نکالا۔

وہ جو شاید ہی کھڑی تھی بھاگتی ہوئی اندر آئی۔

مسرت بھی پریشان سی لیکن میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے بھی سن لیا تھا۔ محفل کچھ کے بغیر اندر کر کے میں بند ہو گئی۔

اندازہ تو اسے تھا ہی کہ نائی کا سوڈا اس روز سے بیگم نعمان کی باتوں پہ خراب ہے مگر وہ کچھ کہہ بھی نہ رہی تھیں۔ جب ہی سادہ لی تھی۔ شاید اس بات پہ کہ اب وہ محفل کی ہونے والی سسرال بھی ان سے کیا پیگا لینا۔

مگر رات میں اس کی یہ خوش فہمی بھی دور ہو گئی جب اس نے لیکن میں نائی متاب کو مسرت سے کہتے سنا۔

”ہم نے تو اسی روز نعمان بھائی لوگوں کو انکار کر دیا تھا، محفل کی کون سا شادی کی عمر ہے ابھی گھر کی بڑی بیٹیاں ہیں پہلے ان کی ہوگی پھر ہی محفل کا سوچیں گے چائے آغا صاحب کے کمرے میں پہنچاؤ۔ وہ رات کا کھانا ہمیں کھائیں گے اور نینل لگا دو۔“ وہ حکم صادر کر کے بے نیازی سے باہر نکل گئیں لیکن کے دروازے پہ دھواں دھواں چہرے کے کھڑی محفل پہ بس ایک لمحہ آنکھ اٹھا لی تھی جبکہ اندر بڑھان کی کھینچ کھینچ کر محفل کو گھٹنا بھی جا رہا تھا۔ لیکن کے دل پہ انہوں نے اتنی بر چھپی پھیر دی تھی۔

اسے نہیں علم تھا کہ کیوں مگر وہ رات ویر تک برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی روٹی رہی تھی۔ اندر سب سو رہے تھے مسرت بھی سوئے چلی گئی تھیں وہ پر بھائی کا بہانہ کر کے باہر آئی تھی اور دیر سے اوھر بیٹھی بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

کچھ عمر کا پہلا خواب دیکھا تھا وہ بھی ایسے کربھی کر چکی ہوا تھا کہ روح تک بلبلانہ تھی۔ وہ اپنی پریشانی کو دل پھٹ رہا تھا کوئی اتنا بھی ظالم ہو سکتا ہے جتنی نائی تھیں۔ جتنے ہی سب لوگ تھے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بے خبر سوئے ان لوگوں کے کمروں کو آگ لگا دے یا چھری سے ان کی گردنیں کاٹ پیسکے۔

یا زہر دے کر سب کو مار دے اور آخر میں خود بھی چھٹانک لے۔ نفرت! بہت شدید نفرت محسوس ہوئی تھی اسے لیکن ان رشتہ داروں سے اس کا دل چاہتا تھا وہ ان گھٹیا اور کینے لوگوں سے دور چلی جائے جہاں اسے ان کی شکل نہ دیکھنی پڑے اور واقعی اب وہ چلی بھی جائے گی۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ بس ایک دفعہ اسے اس کا رشپ مل جائے جس کے لیے اس نے پرنسپل ہائی کمیشن کے اعلان کے بعد ایمائی کیا تھا کہ بھلے گھر کے جو حالات ہوں اس نے نفرت سے ایف ایس سی تک ہر بورڈ ایکڑام میں پورے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا۔ ایف ایس سی پر ہی انجینئرنگ میں ٹاپ کرنے کے باوجود اس کا انجینئرنگ کی طرف رجحان نہ تھا یا رہا نہ تھا نسولی ایس سی سائنس میں ایڈمیشن لے لیا تھا اور اسے امید تھی کہ اب بھی وہ ہی ٹاپ کرے گی اور اگر اس کا رشپ اسے مل جائے تو بہت آسانی سے اسے اس زمان سے چھٹکارا مل جائے گا۔

وہ آنسو پھٹکی کی پشت سے رگڑاتی اس سوچ میں غلطاب تھی کہ کوئی اس کے سامنے آکر ہوا نہ دے دیکھ کر کوئی اور سوچا ہو پھر انجان۔  
 وہ سیم اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔  
 ”تو سیم بھائی؟“ وہ کرنٹ کھا کر اٹھی اور دو قدم پیچھے ہٹی۔

وہ نائی متاب کا تیسرے نمبر کا بیٹا تھا۔ فائد کا چھوٹا اور ناگاہ و آوارہ بھائی۔ اس وقت بھی وہ اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ چائے کب اچانک آکر اوھر کھڑا ہوا تھا۔ کھلا گریبان، رنگ جینز، مگر دن سے لپٹی جین، بٹکے بال اور سرخ آنکھیں۔ وہ نشہ کرتا تھا گھر میں سب کو علم تھا۔ یہاں تک کہ دفعہ چالی اپنی بیٹیوں کو اس کے قریب بھی نہ جانے دیتی تھیں۔ خود حسن بھی احتیاط کرتا تھا۔ آرنڈ البتہ لاہرو اور بڑر تھی۔ ویسے بھی وہ سیم گھر میں بہت کم ہی نظر آتا تھا۔ محفل ہر ممکن احتیاط کرتی کہ اکیلے میں اس کے سامنا نہ ہو کہ اسے اس کی آنکھوں سے خوف آتا تھا۔ مگر آج جانے کیسے۔

”کیا کر رہی ہو؟“ وہ ایک قدم اوپر اسٹیمپ پہ چڑھا تو وہ بے اختیار مزید پیچھے ہٹی۔  
 ”نگ۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔“ وہ آغا جان آواز دے رہے ہیں۔ ”وہ ایک سو ملٹ کر اندر بھاگ گئی۔  
 ”ہو نہ۔“ وہ سیم نے مسخرانہ سر جھکا چند لمحے اوھر کھڑا سوچا رہا پھر باہر گئی کی طرف چل دیا۔

وہ صبح بہت بو جھل کی تھی۔ وہ بس اسٹاپ پہ بیٹھ آگئی بیٹھی موقوف آنکھوں سے دور افق پہ چلنے کیا تلاش کر رہی تھی بھائی کی صبح کے پرندے اڑ رہے تھے زرات بھر کے رونے کے باعث اس کے سر میں درد کی ٹپسیں اٹھ رہی تھیں اور اوپر سے وہ سیاہ فام لڑکی بھی نہیں لگی تھی۔

چائے آج وہ نہ پھر رہی تھی۔ ابھی تک کیوں نہ آئی تھی۔ صرف اس لیے محفل آج چندرہ منٹ پہلے ہی آئی تھی، تاکہ دس کے بجائے پچیس منٹ اس کے ساتھ مل جائیں مگر یہ تو اسے معلوم بھی نہ تھا کہ وہ آئی کب تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس کا انتظار کیوں کر رہی تھی۔ حالانکہ کوئی بات ایسی نہ تھی جسے وہ اس کے ساتھ شیئر کر سکتی، کسی مسئلے کا حل دریافت کر سکتی یا اس کے ساتھ بیٹھ کر دوسکتی۔ نہیں اس کے پاس چائے کو کچھ بھی تو نہیں تھا پھر بھی اسے اس کا انتظار تھا۔ وہ ہاڑیاں کھاتی یہ بندھی رشتہ واریج دیکھتی۔ لمحے سرکتے جا رہے تھے، پچیس منٹ ختم ہونے کو تھے مگر اس سیاہ فام لڑکی کا دور دور تک کوئی اندیشہ نہ تھا۔

بس کا ہارن بجاتا وہ شکست قدموں سے اٹھ کر چل دی۔ سنی چٹ خال رو گیا۔ صبح کے پرندے اپنے سفر کو نکل گئے اور سیلاہٹ بھر افق سنہری کرنوں سے جھینگنے لگا۔

وہ بہت آوازیں اس میں سوار ہوئی تھی۔ سارا راستہ خاموشی کی گردن موڑے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اس کی لمبی صراحتی ہانڈ سنہری گردن لڑکی کی پوئی



بیل کے باعث پیچھے سے بھی جھٹکتی تھی اور اسے بکسر مڑنا پڑتی تھی۔

بس کے رکنے سے قبل اس نے بیک میں سے ہارٹ مرن نکال کر دکھا اور پھر کچھ سوچ کر متورم سوچی آنکھوں کو چھپانے کو گھڑا کا جل ڈال لیا۔

”محمل! آج کا کابل مت ڈالا کرو۔ سائڈ مت کرنا مگر تمہاری آئینہ بالکل گولڈن کلر کی ہیں اور کابل میں بالکل ملی کی طرح لگتی ہیں۔ پونو ٹیٹ دو من! تادیہ دیکھ کر جس کر بولی تھی ”اور مجھے بلیاں بالکل پسند نہیں کھاؤ گی؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا چیس کا ایک بڑھایا۔

محمل نے ایک خاموش نگاہ اس پر ڈالی اور ”نو ٹھیک کنس“ کہہ کر سر جھکائے اپنی کتاب پر کچھ لکھنے لگی۔ سر جھکانے سے اس کی اونچی بولی نیل مزید اٹھ جالی اور بھروسے بال گردن پر کرتے دکھائی دینے لگتے۔

”مائی بلدیو! تادیہ نے شاید اچکا کر بیکٹ واپس لے لیا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے کچھ لکھتی رہی۔ وہ لائبریری میں تادیہ کو کل تائی اماں کے جواب والی بات بتانے آئی تھی مگر اس کا طعنےں کر دیں ایک دم ٹوٹ سا گیا تھا۔ بس چنگی بجاتے اس نے محمل کی خوب صورت بادامی سنری آنکھوں کو ملی سے مشابہہ قرار دے دیا تھا شاید اس لیے کہ عام سی صورت کی تادیہ جب محمل کے ساتھ چل رہی ہوتی تو ہست سے سر بڑ کر بے بیش ستائش نگاہوں سے محمل کو ہی دیکھتے تھے۔

درازدہ ”اسات“ لمبی گردن اور اونچی براؤن بونی نیل والی لڑکی جس کی سنری آنکھیں دھوپ میں اور بھی زیادہ چمکتی تھیں، پورے کان میں پاپو کر تھی۔ ایسے میں جب وہ کابل ڈال کر مزید خوب صورت دکھتی تو تادیہ سے کبھی کبھار پروا نہ ہوتا اور وہ کچھ ایسا ضرور کہہ دیتی جو محمل کابل توڑ دیتا تھا۔

اب بھی وہ تادیہ اپنی ہسٹ فرینڈ کے پاس روٹنے آئی تھی مگر تادیہ کے پاس پہلے اس کے

دکھنے کی فرصت نہ تھی وہ مسلسل اپنے نوٹس میں مگن تھی اور جب ذرا اور کو فارغ ہوئی تو اس کا دل کچھ ایسے توڑا کہ وہ پھر کچھ کہہ ہی نہ سکی۔

”ہاں“ تم کچھ بتا رہی تھیں۔“ وہ چیس کا ایک کتاب کی اوٹ میں کیسے مسلسل چیس نکال کر سنتری تھی ”تائی اماں کی کوئی بات تھی شاید۔“

”نہیں کوئی بات نہیں تھی۔“

”اچھا مجھے لگا۔“

”نہیں غلط لگا۔ میں چلتی ہوں ذرا اسے کچھ کام ہے۔“ وہ مصوف ہی کتابیں اٹھائے باہر نکل آئی۔

لگے دو روز یونہی محمل سے گزرے۔ پریشانی پاپو سی تا امید کی اور وہ کدھر کدھر کے مخفی خیالات میں گھری ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا سے رنگ ہی ختم ہو گئے ہوں۔ سب کچھ پیکا پیکا سا تھا اور دل کا بارغ و باران اجڑا ہوا اور پھر اچانک تیسرے دن وہ سیاہ فام لڑکی آئی۔

اس نے دور سے اسے پہنچے بیٹھے دیکھا تو یکدم غصے کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ وہ تیز تیز چلتی اس کے قریب آئی۔

”تم دونوں سے کہاں تھیں؟“ سیاہ فام لڑکی نے سر اٹھایا۔

وہ مت غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میرا کچھ کام تھا میں۔“

”تمہیں مڑا آتا ہے دو سروں کو اپنا انتظار گزارا کے؟

تھیں لگتا ہے میں تمہاری مدد کے بغیر مڑاؤں گی کہاں حالانکہ ایسا نہیں ہو گا۔ تم توجہ لینے کے لیے وہ باتیں کرتی ہو جس سے دو سرا تمہاری طرف کھینچا جائے مگر مجھے تمہاری بالکل ضرورت نہیں ہے اور نہ مجھے تمہاری پروا ہے اور نہ۔ اور مجھے تمہاری کتاب کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں نہیں مری تمہاری مدد کے بغیر دیکھو دیکھو لو میں زندہ ہوں۔“ تیز تیز بولتے وہ ہانپتے لگی تھیں۔

سیاہ فام لڑکی ذرا سا مسکرائی۔

”تو تم میرا انتظار کر رہی تھیں؟“

”نہیں ہرگز نہیں۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ ”مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”تم شاید بلند آواز میں اپنے دل کی آواز کو جھٹلا رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ مت کرو۔ اپنے دل کی سنو وہ تمہیں کچھ کہہ رہا ہے۔“

”مجھے ڈکھلے مت کرو۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم میرے ساتھ امید افزا نہیں کر کے اپنی کتاب مجھے پینا چاہتی ہو میں خوب سمجھتی ہوں تمہارا مقصد۔ مگر یاد رکھنا میں تم سے یہ کتاب ہرگز نہیں خریدوں گی۔“

”نہی میں نہیں یہ سچ رہی ہوں۔ لیکن ایک دن ایسا آئے گا جب تم خود مجھ سے یہ کتاب ماننے آؤ گی اور تب میں تمہیں فوراً تمہارا دل کی۔ ابھی تم سفر کے آغاز میں ہو اور جب تھکوی تو اس کتاب کے پیچھے آؤ گی۔ مجھے تمہاری کسی بات کا برا نہیں لگا۔ مجھے بس تمہارے تھکنے کا انتظار ہے جاؤ تمہاری بس آج ہی ہے۔“

اس وقت تو وہ غصے میں پلٹے ہی مگر سرسارون کی سوچی رہی کہ اس کو اس سیاہ فام لڑکی کو دیکھ کر ہو کیا گیا تھا۔ کیوں اس نے اس سے اتنا غصہ کیا؟ وہ کیا لگتی تھی اس کی؟ اس نے کیا کیا کیا تھا اس کا اور اسے غصہ کس بات کا تھا۔ یوں انجانے لوگوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک تو محمل ابراہیم بھی نہ کرتی تھی پھر اب کیوں؟

ندامت اور شرمندگی کے احساس نے اسے پورا دن جھکے رکھا وہ بچن کے قرام کام سے تو جی سے پھٹاتی رہی پڑھائی بھی ٹھیک سے نہ کر سکی پیچہ زبو رہے تھے اب بھی اس کے پاس پڑھنے کو بہت کچھ تھا، مگر سارا دن احساس جرم اسے اندر ہی اندر کھوکھے لگتا رہا اور جب رات کو اچانک سے رضیہ پیچھو کی آد کا شور اٹھا تو وہ مت سے دل سے لڑائی نہیں آئی تھی۔

”فائقہ! آج کل سارا وقت میرے ساتھ بچن میں گزر رہی ہے میں تو مری گئی ہوں مگر محمل ہے جو یہ مجھے کسی کام کو ہاتھ لگاتے دے۔ آج بھی بنگ بنائی تھی کہہ رہی تھی سارے ماموں خوں سے کھاتے ہیں

”نہیں دے آؤں۔ میں نے کہا خود ہی دے آؤ۔“

”ہاں میں تو جان ہے میری بیٹی کی اور سب ٹھیک ہے گھر میں؟“ فواد کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہا۔“

”میتاب تائی کے ہر لہو اندر داخل ہوئی رضیہ پیچھو نے بات کے اختتام پر اوپر اوپر دیکھ کر بظاہر سرسری سا پوچھا تھا۔ فواد تو نہ نظر آیا مگر محمل پر نگاہ پڑی تو خبر ہے پاپو کواری کھر گئی۔ شاید اس وجہ سے کہ ان کی آخری بات یہ ذرا سا استہزاء پر مسکرائی تھی۔

”لڑکی کوئی کام کانج بھی ہے نہیں ہے تمہیں؟

جب دیکھو لو کھا کی لوشا اور کدھر کدھر پھری ہوئی ہو۔ میری بھانجی کا بگڑا ہے جو مفت خوروں کو گھر میں رکھا ہے ورنہ میں ہوتی تو نہ ہوتی۔“

”نہیں اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی جیسے چوری پکڑی گئی ہو سب کو بکر نکستی بولے صوفیہ بیٹھیں۔

فائقہ بھی دونوں ہاتھوں میں ٹرے پکڑے جس سے دو ڈسٹے رکھے تھے، چلی آ رہی تھی۔ فیشن کے مطابق شہرت کے نیچے ٹراؤز اور لمبے بال کھلے تھے جن میں بچی کے بل صاف نظر آتے تھے۔ وہ مدد کی طرح خوب میک اپ کرتی تھی اور اس طرح شاید ذرا قابل قبول لگ جاتی تھی مگر جو وہ گھر سے مسکراے اور آئی میک اپ کے اوپر وہ بڑا سیاہ فریم کا چشمہ نہ لگایا کرتی۔

”یہ کدھر رکھیں مملی جان؟“ وہ رگ کر رہی تھی آواز میں پوچھ رہی تھی۔ ورنہ یہی فائقہ تھی جو کچھ عرصہ قبل بے حکم شریک کرتی تھی۔

”بچن میں رکھ دو۔ بلکہ محمل! تم لے جاؤ۔“

”لائیے۔“ محمل آگے بڑھی تو فائقہ نے قدر سے تذبذب سے مل کو رکھا۔

”دے دیں فائقہ بائی! فواد بھائی تو پیسے بھی ابھی افس سے نہیں آئے پھو پوچھ رہی تھیں ابھی ان کا۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر ٹرے لیے بچن میں رکھ آئی۔

”فواد بھی تک نہیں آیا؟“ پیچھو نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔ پھر فائقہ کو آنکھ کا اشارہ کیا۔



فورا "متاب تائی کے بالکل مقابل صوفے پہ مڑوب  
 کی بیٹھ گئی۔  
 "ہاں" کچھ کام تھا شاید اور تم ٹھیک ہو۔" تائی  
 ریوٹ اٹھا کر چیلن بدل دی تھیں "مراڑ میں عجب  
 شان ہے نیازی تھی۔ جن کے فواد چیسے بیٹے ہوں ان  
 پٹیلیوں کی مائیں بونہی مکیوں کی طرح جھجھاتی ہیں"  
 وہ رضیہ پچھو کے اطوار خوب سمجھتی تھیں۔  
 "یہ بڑنگ فالتھ بائی نے بنائی ہے پھپھو؟" وہ  
 واپس آکر ان کے سامنے صوفے پہ ٹانگ۔ ٹانگ رکھ  
 کر بیٹھ گئی۔ وہی چیز ہر آگروں میں منظر کی طرح چلتا  
 دیتا اور اونچی پونی ٹیل۔ یہ اس کا مخصوص حلیہ تھا۔  
 "ہاں تو اور نہیں تو کیا؟"  
 "اچھا آپ تو اس روزانی بانی سلمیہ سے بڑنگ خوا  
 رہی تھیں وہ جب میں آپ کے گھر گئی تھی تب تو  
 کہہ رہی تھیں کہ نہ آپ کو نہ ہی فالتھ بائی کو بڑنگ  
 بنانی آتی ہے فالتھ بائی؟" اس نے چوفا فالتھ کی طرف  
 موڑا "ابھی رہنمائی کی تھی ہے آپ نے؟"  
 "ہاں ہاں میرے ساتھ آج کل سب کچھ سیکھ رہی  
 ہے۔ بیٹھ کر مفت کی روٹیاں تو نہیں توڑتی۔" پچھو  
 چٹک کر پوچھیں۔ تائی متاب ریوٹ پکڑے چیلن  
 بدل دی تھیں۔ چرس پہ البتہ واضح ہے زاری چھائی  
 تھی۔  
 "اور آپ نے کس سے سیکھی؟ اپنی مائیں سے؟"  
 "زیادہ زبان نہیں چلنے لگی تمہاری محل! یہ تو  
 میری بھابی کا حوصلہ ہے کہ تمہیں برواشت کرتی ہیں  
 ان کی جگہ میں ہوتی تو وہاں میں گھر سے نکال دیتی۔"  
 "ان کی جگہ آپ کیسی ہو سکتی تھیں پچھو!  
 وہ سڑوں کے پیچھے جیس کرنا ایک آرٹ ہے اور یہ ہر  
 کسی کو تو نہیں آتا۔"  
 "ٹٹ اب محل! تائی نے غصے سے ریوٹ  
 رکھا۔ "زیادہ ٹیک بک کی تو تائیں تو ذکر رکھ دوں گی۔  
 ارے ہمہ نہ رکھیں تو کدھر جاتی تھیں؟"  
 "انگلنڈ۔" وہ آرام سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پاؤں  
 جھڑا رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" وہ سب جو تھکے  
 "میں نے اسکا ریشپ کے لیے ایلائی کر دیا ہے اور  
 بہت جلد میں تو لاں کو لے کر انگلینڈ چلی جاؤں گی سو  
 آپ ابھی سے ملازم ڈھونڈنا شروع کر دیں۔ آپ  
 بیٹھیں میں ذرا چکن دیکھ لوں۔" وہ اٹھ کر چکن کی  
 طرف چلی آئی "جانتی تھی کہ ان کے سروں پہ ہم پھوڑ  
 کر آئی ہے۔ مگر اس وقت ان سب کو ستانے کا دل کر  
 رہا تھا۔  
 کھانے ہی اس کی پٹشی ہو گئی۔  
 "تم نے کون سی اسکا ریشپ کے لیے ایلائی کیا ہے؟  
 متاب بتا رہی تھی کیا بات ہے؟" آغا جان نے جیسے  
 ایک دم یاد آئے پہ کھانے سے ہاتھ روک کر پوچھا۔  
 "اسکا ریشپ؟" آرنو نے ابرو اٹھائی "میرا اور سامیہ  
 باتیں کرتی تھیں کئی فضا تھی، فضا تھی نے حیرت سے گلاس  
 رکھا اور فواد فترا منہ میں ڈالتے ہوئے بری طرح چوٹکا  
 تھا۔  
 باقی سب بھی ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگے۔  
 بہت اچھیں سے بالو بریچا کر رائے کا ڈونگ اٹھا رہی  
 تھی۔  
 "جی آغا جان! پرنس بانی کمیشن کی طرف سے کچھ  
 اسکا ریشپس انڈس ہولی تھیں نائز کے لیے، میں  
 نے ایلائی کر دیا۔" اس نے ہر پچھو بھر کر رائے چاولوں پہ  
 ڈال رہی تھی۔ "امید ہے جلد ہی مل جائے گی۔ پھر  
 میں انگلینڈ چلی جاؤں گی سوچ رہی ہوں وہیں ساتھ  
 ساتھ جاب وغیرہ بھی کر لوں آخر خرچے بھی تو پورے  
 کرتے ہوتے ہیں نا؟" پچھو چاولوں میں ہلا کر رائے  
 کس کرتے اس نے لاہروانی سے اطلاع دی اور اسے  
 لگا تھا کہ ابھی گھر بھر میں طوفان کھڑا ہو جائے گا مگر۔  
 "ہوں ڈیری کڈ۔ ضرور ایلائی کرو۔" آغا جان پھر  
 سے کھانے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ اب کہ جران  
 ہونے کی بارے محل کی تھی۔ اس نے کسے بھر کو  
 ٹھٹک کر انہیں دیکھا اور پھر سہیل کر لئی۔  
 "تھینک یو آغا جان!"  
 اس کے الفاظ پہ جہاں مسرت طہینان سے کھانے

لگیں نہیں ٹھیل بہت سے لوگوں کی خاموش معنی  
 خیر نگاہوں کے چارے ہوئے تھے۔  
 وہ سر جھکائے چال کھاتی رہی۔ امید تو نہ تھی کہ وہ  
 آگئی۔ وہاں پر چل جائے تو ان سے جائیدادوں سے حصہ  
 کون مانگے کھرا ہو گا؟ ان کے لیے تو اچھا ہی تھا کہ وہ چلی  
 جائے۔  
 "یہ تو نہیں جھوٹوں گی تم لوگوں کو میں چلی بھی  
 گئی تو ایک دن ضرور واپس آؤں گی اور اپنا حصہ طلب  
 جہاں جائے سے تم خوف کھاتے ہو۔" اس نے دل ہی  
 دل میں تیرہ کیا تھا اور پھر حسب پالی کا جبک اٹھنے کو سر  
 اٹھایا تو یکدم جو کد  
 سبے تو جی سے کھانا کھانا فواد اسے ہی دیکھ رہا تھا۔  
 اسے سر اٹھایا کر فوراً اپنی بیٹی پہ جبک گیا اور پھر  
 میں پچھو نے اتنا ہی "میری فالتھ نے اسے جبک کیا  
 ہے۔" کہہ کر اسے روکنا چاہا وہ گری و تھیں کر اٹھ  
 کھڑا ہوا۔  
 "مجھے کام ہے چھو ہوں۔"  
 "ہاں بیٹا! تم کام کرو۔" متاب نے بھی فوراً اس  
 کی تائید کی تھی۔ اور پھر پچھو اس ہائیں کرتی رہ گئیں  
 اور وہ کبے لے ڈگ بھر بیا ہر کل گیا۔ محل کا دل یکدم  
 لا اس سا ہو گیا تھا۔ بہت نہیں کیوں۔  
 دور پہ پٹشی سیاہ فام لڑکی کو دیکھ کر اس کے  
 قدموں میں تیزی آئی۔ وہ سبک رفتاری سے چلتی پھرتی  
 کے قریب آئی۔  
 "گڈ مارنگ۔"  
 سیاہ فام لڑکی نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر ذرا سا  
 مسکرائی۔  
 "گڈ مارنگ فوٹو۔" وہ اسی طرح کتب کے  
 کنڈول پہ مضبوطی سے ہاتھ جمائے بیٹھی تھی۔  
 "میں دراصل۔۔۔" محل متذہب سی اس کے

ساتھ بیٹھی۔ "مجھے کچھ کل کے بوفے پہ بہت  
 شرمندگی ہے۔ میں کبھی بھی اتنی روڈ نہیں ہوتی اور۔۔۔"  
 "جائے دو مجھے برا نہیں لگا۔"  
 "نہیں۔۔۔ انی ایم سوری۔۔۔ وہ علی سوری۔۔۔ میں  
 کچھ پریشان تھی۔"  
 "میں نے تو تمہیں تمہاری ہر پریشانی کا حل بتایا  
 تھا۔ تم خود ہی اس طرف نہیں آنا چاہتی۔"  
 "نہیں وہ۔۔۔" اس نے بے ساختہ نگاہیں  
 پرائیں۔ "مجھے اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں  
 ہے۔" مگر اس کتاب کو تم سے ہے اس نے مجھ سے کہا  
 ہے کہ میں اسے تمہارے حوالے کروں۔"  
 وہ بری طرح چوکی تھی۔ پٹشی گفتگو میں بھی اس  
 نے اسے کوئی ایسی ہی بات بتائی تھی۔  
 "یہ سب یہ کتاب مجھے جانتی ہے؟"  
 "سو فصد جانتی ہے۔ تمہاری زندگی کی ساری کہانی  
 اس میں لکھی ہے۔ گزروے واقعات اور آنے والے  
 حالات۔"  
 "واقعی؟" وہ شدید سی اسے دیکھ رہی تھی۔  
 "جیسے یہی ہی ہے یہی تھی۔"  
 "ہاں اس میں سب لکھا ہے۔"  
 "کھنہ۔۔۔ تم نے میری زندگی کی کہانی پڑھی ہے؟"  
 "نہیں میں نہیں پڑھ سکتی۔"  
 "کیوں؟ کیا تم نے یہ کتاب پوری نہیں پڑھی؟"  
 "میں نے پوری پڑھ رکھی ہے مگر مجھے صرف  
 میری زندگی کی کہانی تھی ہے۔ تمہاری زندگی کی کہانی  
 صرف تم ہی لکھی۔"  
 "تم کیا کہہ رہی ہو میری کچھ سمجھ میں نہیں آ  
 رہا۔" اب کے وہ اتنی پریشان ہو گئی تھی۔  
 "آجائے گی۔ بہریت کچھ میں آجائے گی۔ اس  
 تھوڑا وقت لگے گا۔" وہ اسے دیکھ کر نہ گئی۔ وہ لڑکی  
 کون بھی کہیں سے آئی تھی۔







سیاق نام لڑکی ابھی تک نہیں آئی تھی، محل بار بار کلائی پہ بندھی تھی دیکھتی پھر بے چین نگاہوں سے گردن کو اڑھو اڑھو گھماتی۔ بھوری لوٹی پونی بھی ساتھ ہی جھولتی۔ اسے شہرت سے اس لڑکی کا انتظار تھا اور آج تو لگتا تھا جیسے وقت بہت دیر سے گزر رہا ہے۔ بالآخر وہ تھک کر بیچ پیٹھی اور سر دونوں ہاتھوں میں قہقہہ لیا۔

”کیا میرا انتظار کر رہی تھیں؟“ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کٹ کٹا کر اٹھی۔ وہ سیاق نام لڑکی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”میں تمہارا ہی سے کر رہی تھی“

”اور میں جانتی ہوں کہ کیوں؟“ وہ آرام سے بیچ پیٹھی بیٹھی، بیگ کا اسٹریپ کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھا اور کتاب احتیاط سے گود میں رکھی۔ پھر جیسے فارغ ہو کر محل کا رخ کر لیا۔

”تم تھک گئی ہو؟“

”ہاں میں تھک گئی ہوں۔ میں تھک آگئی ہوں۔ اس دنیا میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔“

”اوموں ایسے نہیں کہتے۔ ابھی تو تمہیں وہ کچھ لیتا ہے جس کی چمک سے تمہاری آنکھیں چکا چوندہ رہ جاتی ہیں۔ ابھی تو تم صبح راستہ پہ آئی ہو۔“

”مجھے صبح اور غلط کا نہیں پتہ ہی میں صبح اور غلط کی تفریق میں نہ رہتا جانتی ہوں۔“ اس نے بے اختیار نگاہیں چرائی تھیں۔ اپنے دل سے اپنے اندر بیچتے لگتے کہ احساس ہے۔

”کوئی بات نہیں شروع شروع میں یہ کتاب مشکل لگے گی، جیسے کوئی عذاب ہو، قید ہو، مگر پھر تم جلدی ہو جاؤ گی۔“ وہ ایسے ہی مسکرا رہی تھی۔

”یہ کتاب مجھ سے کیسے بات کرے گی؟“ محل حردہ سی اس کی گود میں رکھی کتاب کو دیکھ رہی تھی۔

”روز اس کا ایک صفحہ پڑھنا۔ اگر مشکل لگے تو میں تمہیں کچھ ایسے ٹوکوں کہ تمہیں اس کی جو اس کتاب کا علم سکھاتے ہیں۔ بالکل خاموشی سے، چپ چاپ اپنا کام

کرتے ہیں۔ میں تمہیں ادھر لے جاؤں گی، وہ تمہیں اس قدیم زبان کا علم سکھائیں گے جس میں یہ کتاب لکھی ہوئی ہے۔ پھر جب تم روز اس کا ایک ایک صفحہ پڑھنے کے قابل ہو جاؤ گی تو تم جانو گی کہ ہر صفحہ تمہارے yesterday کی رواد ہے اور تمہیں tomorrow کی تدبیر بتا رہا ہے۔“

”اور اگر میں ایڈوانس میں ایک صفحہ آگے پڑھ لوں تو مجھے اپنے آنے والے کل کا علم ہو جائے گا؟“

”نہیں، تم ایک دن میں پوری کتاب بھی پڑھ لو تو بھی وہ تمہارا yesterday کی رواد ہی رہے گا۔ لیکن اگر وہی صفحے تم آگے دن پڑھو تو وہ اس دن کے حساب سے تمہاری گزشتہ دنوں کی رواد بن جائے گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ الجھ سی گئی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی صفحے کا ایک دن میں ہی مطلب بدل جائے۔“

”اگر یہ نہ ہو تا تو کیا تم آج اس کتاب کی طرف یوں دیکھتی چلی آتی؟“

”نہیں، تو اتنی جگہ کہ رہی ہو؟“ وہ اندر ہی اندر غور غور بھی تھی۔

”تمہیں شک ہے کیا؟“

”نہیں مگر تم مجھے یہ کیوں دے رہی ہو؟ تمہارا اس میں کیا فائدہ؟“ اپنی دانست میں محل نے خلاصا عقل مدداندہ سوال کیا تھا۔

”میرا ہی تو اصل فائدہ ہے۔“ وہ پھر اسی پر اسرار طریقے سے مسکرائی۔ ”جو کچھ تمہیں حاصل ہو گا اس کا ایک شیئر تو مجھے ہی جائے گا۔“

”شیئر؟“ وہ دنگ رہ گئی۔ ”کیا مطلب؟ کتنا شیئر؟ کتنے شیئر؟“

”شاید آدھا، شاید اس سے کچھ کم۔ معلوم نہیں، مگر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے میرا حصہ مجھ تک پہنچ جائے گا، یہ کتاب خود میرے پاس آکر مجھے میرا حصہ دلاوے گی۔“

”اچھا۔“ وہ تھیری تھی۔ ”پھر میں یہ لے لوں؟“

”پہلے خوب اچھی طرح سوچ لو۔“

”سب سوچ لیا ہے۔“ وہ تھیری سے بولی اور کتاب پر ہاتھ رکھا مگر وہ اسے ڈاکٹس نہ لے جاتے۔

”پہلے جاؤ مگر اور کھانا، ایک سنت پڑا ہوا ہے جو میں تمہیں دے رہی ہوں۔ اگر تم نے وہ جینیں تمہیں کتنی ہو کر رہے اور وہی ہی کیا جیسے یہ کتاب تمہیں کے تو پھر سب کچھ بدل جائے گا۔ تم اس کتاب میں رہنے لگو گی، اسی سے بات کرنے لگو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یونانی ہو جاؤ گی، محروم ہو جاؤ گی۔ جو ملا تھا وہ بھی جائے گا اور جو پہلے سے تھا وہ بھی عذاب بن جائے گا۔ جاؤ کہ لے جاؤ۔“

اس نے سیاہ جلد والی بھاری کتاب اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی اور جب محل ایڑا نیچے لے کر اٹھا چلا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

”تھینک یو۔ کیا یہ مجھے تمہیں واپس کرنی ہوگی؟“

”نہیں۔“

”اور جب میں پوری پڑھ لوں تو پھر کیا ہوگا؟“

”پھر سے غور کرو۔ یہ کتاب بھی پرانی نہیں ہوگی۔“

”تھینک یو۔“ وہ کپکپاتی آنکھوں سے کتاب پرکے تیز تیز چلتی گھڑی سمت بڑھ گئی۔ کتاب کی سیاہ جلد سڑھکی، بے حد سرد۔ کوئی اسرار تھا اس میں کوئی قدیم راز، جسے وہ آج بے نقاب کرنے جا رہی تھی۔

جب اس نے گیٹ کھولا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگیں کتاب رہی تھیں اور دل سے دل تو ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر گرے گا۔ بوجھ بہت بھاری بوجھ تھا تو اس تھکی ہوئی لڑکی نے ہاتھ اندر ہی اندر اس کا دل ڈر رہا تھا۔

”کیا یہ کتاب میں رہے گی؟“ وہ تھیری سے کسی رستے کی طرف تو نہیں جا رہی۔ یہ سیاہ علم، سفلی عملیات یہ ابھی چھریں تو نہ تھیں مگر وہ کیوں اسے اٹھا لائی تھی؟

اس نے دنگ کر سوچنا چاہا، مگر اب واپسی کا کوئی

راستہ نہ رہا تھا۔

”دولت بچھاؤ۔“ محبوب قدموں میں سب دنیایہ راز۔

اسے بہت سی چیزیں اچھی لگتی تھیں اور وہ کتاب اس کے ہر مسئلے کا حل تھی۔ اسے جیمز لکھن کے بیٹے کا بھڑا گیارہواں شت یاد آیا کہ اسے رات فلو کی بات ہے سب کا رد عمل یاد آیا۔ اسے اپنی بے پناہ دولت بھی یاد آئی تھی۔ جس پر عیش کوئی اور کر رہا تھا۔ پھر وہ اس لڑکی کو وہ کتاب سب خزانوں کی تھی واپس کر آئی؟ پھر وہ نہیں رکی اور کتاب سینے سے لگائے، سر جھکائے تیز قدموں سے چلی لاؤنڈ میں داخل ہوئی۔

”کمال سے آ رہی ہو؟“

”ہاں، جو اپنے خیال میں گم تھی،“ آواز پہ گھبرا کر وہ قدم پیچھے ہٹتی۔

”اسے دیکھ رہی تھیں۔“

”یہ؟“ وہ مائی ادا۔ ”اس نے بے اختیار شک بول پڑا۔ زبان پھیری۔“ وہ تلو سے کچھ نوٹس کیے تھے۔ ذرا الشاپ تک تھی کچھ لمباں کو تیار کر رہی تھی۔

”ماں تمہاری ماں تو کس کی لینڈ لرنی ہے جس کی اجازت ملتی تھی۔“

”یہ؟“ وہ تائی۔ ”اچھا، اسد چچا کو بھی۔“ بتایا تھا۔

”یہ؟“ وہ تائی کے سامنے یوں بھگاری تھی۔

”اچھا جاؤ، سرنہ کھاؤ۔“ تائی بے ڈاری سے ہاتھ جھلا کر آگے بڑھ گئیں۔

وہ کمرے کی طرف لپٹی، اور جلدی سے الماری کھول کر ایک خانے میں سارے پیڑوں کے نیچے وہ سیاہ کتاب چھپا دی پھر الماری احتیاط سے بند کی۔ اوپر اوپر کھلے صدف شکر کہ کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

”محل! کیا ہر ماں نے پکارا تو وہ جلدی سے چہرے پہ آیا، پسینہ پوچھتی باہر آئی۔

”جی؟“

”سرت جو کچن میں سارے گھر کے ٹاشٹے بنانے میں مصروف تھیں، چین میں اٹھ پڑے ہوئے مڑ کر اسے

دیکھ کر اسے



وہ کھلا۔  
”تم تو کالج میں تھیں اتنی جلدی آگئیں؟“  
”جی ہاں۔“  
”خیریت؟“

”اوہو! آج سب کو میری کیوں فکر پڑ گئی ہے؟ ہمارے سے نوٹس لینے تھے، مل گئے تو آگئی۔“ وہ خواہ مخواہ ہی چڑھ گئی پھر اوپر اوجھڑتوں میں ہاتھ مارتی بظاہر کچھ تلاش کرنے لگی۔

”میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔ اچھا ہشتہ تو کر لو۔“  
”نہیں بھوک نہیں ہے۔“ وہ بس منظر سے ہٹنا چاہتی تھی سو اُن کا کہہ کر ہار لاون میں آگئی۔ ذہن ابھی تک الماری میں کپڑوں کے پیچھے چھپی کتاب میں اٹکا ہوا تھا۔

پھر گھر کے کام کاج، صفائی اور اس کے بعد مسرت کے ساتھ مشین لگاتے وہ میکاگی ایئرڈیز خاموشی سے کام کرتی رہی، مسلسل اس کا دل پلٹ پلٹ کر اس کتاب کی طرف جاتا تھا۔ وہ چند بار اندر آئی اور الماری کھول کر کپڑوں کے پیچھے ہاتھ چھتیا کر دیکھا۔ وہ سیاہ کتاب وہیں رہ گئی تھی۔

پھر سارا دن وہ سوچ ڈھونڈتی رہی کہ اسے جا کر پڑھے کچھ تو پتہ چلے۔ کوئی راہ تو نکلے، مگر کاموں کا بوجھ اور کچھ فطری سا خوف تھا کہ وہ اس کتاب کو نکالنے کی ہمت نہ کر سکی۔

رات کھانے کے بعد اس نے جب سب کو ڈائننگ ہال میں سو سوٹ ڈش میں مصروف پایا، تو بالآخر الماری سے وہ بھاری کتاب نکالی اور اسے سینے سے لگا کر دے بے پاؤں بیٹھیاں اوپر چڑھتی گئی۔

ڈائننگ ہال سے راستہ لاون تک جن کی طرف جاتی کتاب تائی نے چونک کر اسے آخری سیڑھی چھلانگ لگتے دیکھا۔

”یہ عمل کیا کرتی پھر رہی ہے آج؟“ انہوں نے پیچھے سے آئی ناہم دھجی کو روک کر سرگوشی میں پوچھا۔  
”ابھی کوئی کتاب پکڑے اوپر گئی ہے۔“

”اچھا؟“ وہ تجسس سی تائی کے قریب آئیں۔  
”دھاتی وڑھائی تو اب جسم ہے اور چھت پونہ بھی نہیں گئی پڑھنے، ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔“

اور ان کی سرگوشیوں سے بے خبر وہ باہر تیس پہ نکل آئی، آہستہ سے دروازہ بند کیا اور رنگ کے ساتھ نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔ کتاب گھنٹوں پہ رکھے وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی۔

محرومیوں، ہار سائیوں اور دکھوں کے اس کئی برس پرانے کرب کی اب جیسے ایشیا ہو چکی تھی۔ اس سے اب مزید برداشت نہ ہو، کتاب غلط ہو یا صحیح وہ زندگی سے اپنا حصہ ضرور وصول کرے گی۔

ایک ٹھوس اور قطعی فیصلہ کر کے عمل ابراہیم نے کتاب کی سیاہ جلد پر ہاتھ رکھا۔ وہ بے حد سرد تھی۔ ٹھنڈی اور پرسکون۔ وہ جلد پلٹنے ہی لگی تھی کہ ایک دم ٹیس کا دروازہ دھات سے کھلا۔

اس نے گھبرا کر سر اٹھایا اور ایک لمحے کو تو زمین آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔  
”اتنا جان! وہ توں چچا تائی کتاب کا حصہ چچی اور لڑکیاں اور مسرت بھی۔ سب ایک ساتھ باہر آئے تھے۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟“ اتنا جان غصے سے غرائے تھے۔ ”عمل! کیا کر رہی ہو اوپر؟“ وہ ہکا بکا منہ کھولے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”اوپر کیا بیٹھی ہو سائے آو؟“ تائی مستاب چمک کر بولیں، ”اور اس کی تو جیسے ٹاپوں میں جان نہ رہی تھی۔ پھٹکل اٹھی اور دو قدم آگے بڑھی۔“ کتاب اسی طرح دونوں ہاتھوں میں پکڑی تھی اور پورا جسم لرز رہا تھا۔

”وہ... اتنا جان! میں...“  
”میں پوچھ رہا ہوں اتنی رات کو اوپر کیا کر رہی ہو“

”مم... میں پڑھ پڑھ رہی ہوں۔“ لفظ لیوا پہ ہی دم؟ توڑ گئے اس کی ٹانگیں گانے کی گئیں۔  
”کیا پڑھ رہی ہو؟ اوپر کھاؤ۔“ اتنا جان کے لیے

کی فتح کم نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے کتاب لینے کو ہاتھ بڑھایا تو وہ دھک کر پیچھے ہٹ گئی۔  
”تک... تک کچھ نہیں کچھ نہیں۔“ اس نے کتاب پیچھے کرنی چاہی اور پھر اس نے دیکھا، اتنا جان کے پیچھے کھڑی مسرت کی آنکھوں میں آنسو تھے اور تائی قاتلانہ مسکراتی تھیں۔

”ارے ہم بھی تو دیکھیں، بھری رات میں اوپر کون سی کتابوں میں چھپا کر خط و کتابت ہو رہی ہے میں تو پہلے ہی کہتی تھی یہ لڑکی کوئی چاند ضرور چڑھائے گی۔“ اس کے ارد گرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔

”نہیں۔۔۔ تائی! نہیں۔۔۔“ وہ پچی پچی لگا ہوں سے انہیں دیکھتی تھی میں سر ہلا رہی تھی۔ ”میں نے کچھ نہیں کہا میں تو پڑھ...“

اتنا جان نے زور سے اس کے ہاتھوں سے کتاب چھینی۔ ”پڑھ رہی تھیں تو کھاتی کیوں نہیں ہو؟“ ایک غصیلی نظر اس پر ڈال کر انہوں نے کتاب اپنے سامنے کی۔

”میں بھی کھول کیوں پاؤں کو چھت پہ آجاتی ہے۔“ اس کے ساتھ ساتھ کلا کرتی سے تیر تیران جواتی تھی اور رہی ہے اسے میں بھی کھول کوئی تو ہے، اس کے پیچھے اتنا صاحب اس سے کہے کہ جس مردود کے لیے چھتیاں ڈالنے اوپر آئی ہے اسے کہے کہ ابھی آئے اور دو بول پڑھا کر اسے کے جائے خاندان، بحر میں بدنام کرے گی ہمیں کیا۔“

اور اسے لگا آج وہ واقعتاً بارگشتی ہے۔ اتنا جان کتاب کے صفحے پلٹ رہے تھے۔ ہر پلٹنے صفحے کے ساتھ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں گھٹی سے میچ لیں۔ آج وہ اسے یقیناً لکھ کر ڈالیں گے وہ سخی عملیات میں پڑ گئی ہے۔ کبھی نہیں بخشیں گے۔

”شرم نہیں آتی جیسے بگھنیا عورت!“ اتنا جان ایک دم دھات سے تو اس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ اسے لگا وہ لہرا کر گرنے کو ہے جسب۔  
”میں... میں نے کیا کیا ہے؟“ تائی کی ہکلائی آواز

”اس کتاب کا ہر صفحہ تمہارے گزرتے دن کی روداد ہے۔“

”یہ کتاب کبھی رانی نہیں ہوگی۔“  
”مہم سب کو اپنی گھٹی میں کر کے بیٹاپہ راج کر دے گی۔“ اس سیاہ قام لڑکی کا ایک ایک فقرہ ٹھپکے کی طرح

محمل نے جیسے کسی خواب سے جاگ کر سر اٹھایا۔ وہ کھلی کتاب ہاتھ میں پکڑے محمل سے نہیں تائی سے مخاطب تھے۔  
”جیسے شرم نہیں آتی اس نتیجہ پر کیا یہ الزام لگا کر ہم سب کو اکٹھا کر کے؟“ وہ دم موم ایسے الفاظ کہنے سے پہلے وہ اب چھت پہ پڑھ بھی نہیں سکتی۔“

محمل نے پلکیں نذر سے جھپکائیں یہ اتنا جان کیا کہہ رہے تھے۔  
”مگر اتنا صاحب! وہ اس کتاب میں...“

”دوب موم بے دین عورت! وہ قرآن پڑھ رہی تھی، تم قرآن کی حرمت کا تو پاس رکھ لیتیں۔“ انہوں نے سیاہ کتاب بند کی اسے چھو آنکھوں سے لگایا اور محمل کی طرف بڑھایا۔

”بیٹا! نیچے پڑھ لیتیں تو سب پریشان نہ ہوتے۔ یہ لو۔“ وہ اسے کتاب تھما کر ایک گھٹیلی نگاہ ان عورتوں پر ڈال کر واپس ہو لیے۔

”اسے تو اب چوروں کی طرح پڑھے گی تو بندہ شک تو کرے گا ہی، ورنہ میرا کیا دل غراب ہے کہ یوں کہتی۔“ تائی شرمندہ سی تھیں۔  
اتنا جان بھی بگھرا انہیں پونہ سی سب کے سامنے جھڑک دیا کرتے تھے، خصوصاً جب وہ اپنے رشتے داروں پہ بے دروغی سے لٹاتی تھیں۔

”اور نہیں تو کیا...“ آہستہ آہستہ سب نام سے پلٹ گئے۔

وہ اسی طرح ساکت سی کتاب ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ ٹیسرے خالی ہو چکا تھا۔ سب جا چکے تھے، پرسکون اور سرخرو مسرت تھی اور وہ اسی طرح پتھر کا پتہ بیٹے وہاں کھڑی تھی۔

”اس کتاب کا ہر صفحہ تمہارے گزرتے دن کی روداد ہے۔“

”یہ کتاب کبھی رانی نہیں ہوگی۔“  
”مہم سب کو اپنی گھٹی میں کر کے بیٹاپہ راج کر دے گی۔“ اس سیاہ قام لڑکی کا ایک ایک فقرہ ٹھپکے کی طرح



اس کے منہ پر برس رہا تھا۔

تو اس نے کہا: "خراش... خراش..."

اسے لگا وہ بھی اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گی۔

یونہی صدیوں اس اندھیرے میں پہنچی رہے گی۔

"دوسرے مذاق... فریب... مسخر قرآن کی

سے حرمی... اس سیاہ فام لڑکی نے کیا نہیں کیا تھا۔

انقلاب مذاق! ایک برطانوی حاکم کو سبز خواب دکھا کر

اسے اسی کی مقدس کتاب پکڑا دی؟ یہ ہوا کیا تھا اس

کے ساتھ؟

اس کے ہاتھ ابھی تک لرز رہے تھے نہایت

بے یقینی کے عالم میں اس نے سیاہ جلد والی کتاب کو چہرے

کے سامنے رکھا۔

سیاہ جلد صاف تھی۔ بے بارغ، بے لفظ۔

اس نے درمیان سے کتاب کھولی۔

اوپر عربی کی عبارتیں تھیں اور نیچے انگریزی کی۔

سب سے اوپر لکھا تھا۔

الکھف... The cave۔

اس نے چند صفحے آگے کھولے۔

الغکبوت... The spider۔

اس نے شروع سے دیکھا۔

المائدہ... The Table spread۔

محمل نے کتاب بند کر دی۔

آغا جان نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ قرآن تھا۔ ان کی

مذہبی کتاب، مقدس کتاب اور اس فرنگ نے کیسے

کیسے قہر ڈالے تھے اس کے ساتھ۔

برعزت کیا تھا اور وہ بھی صرف اور صرف محمل کی وجہ

سے اس میں اب کسی طرح تو غصہ اٹھنا تھا۔ مگر محمل

کوئی بھی جواب دے بغیر سر جھکائے تیزی سے اپنے

کمرے کی طرف بھاگ گیا۔

\*\*\*

صبح پھر جلدی آگئی تھی۔

سیاہ فام لڑکی آج بہت پہلے سے اس بچے بیٹھی تھی،

اسے دیکھ کر محمل کے قدم تیز ہو گئے۔

قدموں کی چاپ پہ ہی اس نے سر اٹھایا محمل نے

دیکھا، اسے دیکھ کر اس کی سیاہ آنکھوں میں امید کے

دیر جل اٹھے تھے۔

سڑک خالی تھی۔ دور نارجی سورج طلوع ہو رہا تھا۔

محمل اس کے بالکل سامنے آکھڑی ہوئی۔ سورج کی

نارنجی شعاعیں اس کے پیچھے چھب چھب گئیں۔

"جہیں شرم تو نہیں آئی ہو گی میرے ساتھ ایسا

بے ہودہ مذاق کرنے ہوئے؟"

سیاہ فام لڑکی کی نگاہیں اس کے ہاتھوں میں پکڑی

تھیں۔ ایک دم ہی اس کی آنکھوں کی جوت

چمک اٹھی۔

"کھینچو! پس کرنے آئی ہو؟"

"مصحف؟" اکھڑی اکھڑی سی محمل نے ابھرا

اتھا۔

"ہم ارب و رلد (عرب دنیا) میں قرآن کو مصحف

کہتے ہیں۔

"تم نے مجھے کیا قصہ کہانیاں بنا کر قرآن تمنا دیا۔ یہ

کوئی مذاق کرنے کی کتاب تو نہ تھی۔ یہ تو قرآن تھا۔"

"قرآن نہیں قرآن ہوتا ہے۔" وہ اواسی سے

مسکرائی تو محمل نے شانے اچکائے۔

"بہر حال تمہیں یہ پریکٹیکل جوک کر کے مجھے

شرمندہ کرنے پر شرم آئی چاہیے۔ میں تو کیا سوچ رہی

تھی اور تم نے مجھے ایک مقدس کتاب تمنا دی؟"

"تو تم کسی غیر مقدس چیز کی توقع کر رہی تھیں کیا؟"

"جی نہیں۔" وہ تھلائی پھر قرآن اس کی گود میں

رکھا۔ "یہ میرے پاس پہلے سے ہے، مجھے ضرورت

نہیں ہے۔"

"بیٹھ کر بات کرو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ اسی طرح بیٹھنے پہ ہاتھ

باندھے اکھڑی اکھڑی کی کھڑی رہی۔

"اچھا۔" اس نے نرمی سے مصحف کی سیاہ جلد پہ

ہاتھ پھیرا۔ "تو تم نے یہ پڑھ رکھا ہے؟" اس کی آواز

میں محمل کی ساری اواہی سمجھ گئی تھی۔

"ہاں اور بچپن میں ہی پڑھ لیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ

ہم شروع سے ہی مسلمان ہیں۔" وہ علالتا "بنا کر بولی۔

"اور تمہیں ہماری مقدس کتاب کے بارے میں غلط

فہمیاں ہیں۔ یہ کوئی فال نکلنے والی کتاب نہیں ہے نہ

تو یہ۔" اس میں جیسی یا تمہاری استوری ہے۔ لاجول والا

"اچھا۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔ "چلو پھر بیٹھو اور مجھے

بتاؤ کہ اس میں کیا ہے۔"

"اس میں احکامات ہیں، نماز پڑھنے کے جزیو

کے، وہ اس کے ساتھ چپ بیٹھ کر اسے بہت

دیر سے بتائے گی۔" اس میں پرانی قوموں کے قصے

ہیں قوم عاد، قوم ثمود اور بنی اسرائیل۔"

"بنی اسرائیل کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

"مطلب؟" وہ ہلکا سا گڑبلائی۔ "بنی اسرائیل کا

مطلب ہوا اسرائیل کے بیٹے؟" وہ پوچھ رہی تھی یا

بتا رہی تھی خود بھی نہ سمجھ سکی۔

"اسرائیل کا مطلب عبد اللہ ہوتا ہے۔ اہل اللہ کو

کہتے ہیں۔ یہ یعقوب کا نام تھا۔"

"اے ہاں حضرت یعقوب کا قصہ حضرت یوسف کا

قصہ سب پڑھ رکھا ہے میں نے سب پڑھ سے مجھے

ہمیں تو کورس میں پڑھایا گیا تھا یوسف اور زلیخا والا

قصہ۔"

"یوسف اور کس والا قصہ؟" سیاہ فام لڑکی کی

آنکھوں میں حیرت ابھری۔

"یوسف اور زلیخا والا قصہ۔"

"مگر مصر کی بیوی کا نام زلیخا تھا؟"

دیکھ کر اس نے کہا: "وہ کنفیو ڈو ہو گئی۔"

"کوئی دلیل ہے تمہارے پاس؟ کوئی حجت؟"

"دلیل؟ حجت؟" وہ فکر غمراں کا چہرہ دکھنے لگی۔

"ہمارے کورس کی گائیڈ بک میں لکھا تھا۔"

"کورس کی گائیڈ بک انسان کی بات ہے اور انسان

کی بات میں دلیل نہیں ہوتی۔ دلیل صرف قرآن یا

حدیث سے پیش کی جانی ہے کیونکہ دونوں مآخذ

خداوندی ہوتے ہیں قرآن اور حدیث میں اور نہ ہی

اسراغلیات میں، نہیں بھی بتایا گیا کہ اس عورت

کا نام زلیخا تھا۔" اس کا لہجہ نرم تھا۔ "مصر کی اس

عورت سے ایک غلطی ہوئی تھی ایک جرم سرزد ہوا

تھا مگر اللہ نے اس کا پردہ رکھ لیا۔ اس کا فعل تو بتایا مگر

نام نہیں اور جس چیز کا پردہ اللہ رکھے وہ کھل نہیں سکتا

مگر ہم نے "یوسف و زلیخا" کے قصے پر مجھو نہ رہ جا

کر سنا ہے ہم کیسے لوگ ہیں؟"

"ہیں؟ تو اس کا نام زلیخا نہیں تھا؟" وہ ساری غلطی

کھول کر حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"اس کا نام راز ہے اور میرا اور تمہارا راز یہ راز

نہیں کھولنا چاہتا۔ یوسف ہمیشہ رازی رہے گا۔"

"اچھا۔" اس نے شانے اچکائے۔ پہلی دفعہ اسے

اپنی علمی کمزوری کا خفیف سا احساس ہوا تھا مگر یہ ماننا اس

کی اتنا کی شکست تھی تو لاپرواہی سے اوجھڑا کر دیکھتے

ہوئے بولی۔

"بہر حال، مجھے افسوس ہے کہ تمہارے

کانیڈیٹ قرآن کے بارے میں غلط ہیں۔ یہ کتاب

وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو۔"

"اور اگر یہ وہ نہ ہو تو جو تم کہتے ہو تو؟"

"میں جانتی ہوں، مجھے سب سے پہلے

"تمہیں ہو کوئی اس اور کی طرف بلائے گا تم اسے

یہی کہو گی؟"

"مگر تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ یہ قرآن ہے۔ تم

نے تو کچھ اور قصے سنائے تھے آخر کیوں؟"

"اگر میں تمہیں بتا دیتی تو تم کہا کرتے تھے سے دور

بھاگ جاتیں۔"







بچنگ کا کچا کی چوڑیاں دلو کر اس کے بعد اصرار پالا آخر  
 فوٹو لے کر دی۔  
 ”میرا دل کرتا ہے حمل! میں نہیں پوری دنیا خرید  
 کروں ہوں۔ پتہ نہیں کیوں۔“ وہ فرسٹ سیٹ کا  
 لاک کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا اور وہ دین دروازے  
 کے پینل پر ہاتھ رکھے مگر غصہ ہی اسے دیکھنے لگی۔ یہی  
 سب تو چاہا تھا اس نے مگر بھی سوچا ہی نہ تھا کہ یہ اتنی  
 آسانی سے ہو جائے گا؟  
 پھر وہ اسے فیکٹری لے آیا۔  
 ”ہیڈ آفس میں پایا اور حسن ہوتے ہیں۔ اسد بچا  
 اور غفران بچا چاندی والی برانچ میں ہوتے ہیں جبکہ میں  
 فیکٹری سائیڈ پر۔ تم آج سے روز اوھر میرے ساتھ کام  
 کرو گی۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ سب کام سکھا دوں  
 گا۔ ٹھیک؟“  
 ”ٹھیک ہے مگر میں گھر میں کیا کروں گی؟“  
 ”تم ٹیوشن پڑھانے جاتی ہو نا تو بس تمہیں ایک  
 ٹیوشن اور مل گئی ہے جس کی بے سے تم نے اپنے لیے  
 اتنی شاہک کر لی ہے۔ سرسٹ جی کو شاہک کے بارے  
 میں یہی کہہ رہا اور باتوں کو کچھ دکھانے کی ضرورت ہی  
 نہیں ہے۔ رائٹ؟ اب چاہئے لوگ یا کالی؟“ وہ اپنی  
 سیٹ سمجھاتے بے نیازی سے برائیات دے کر فون کی  
 طرف بڑھا تو وہ طمانیت سے مسکرا دی۔  
 ”کالی۔“ اور اس کے مقابل کر سکی کی پشت سے  
 ٹیک لگائی۔  
 ”گڈ۔“ وہ بھی مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے وہ بہت  
 اچھا لگتا تھا۔  
 اس روز فواد نے اسے کوئی کام نہ کرنے دیا۔ بس  
 اوھر بچہ کرکھے آہر کر دیا اور سیکو کہہ کر اسے اپنے  
 سامنے بٹھا دیا۔ کام کرتے کرتے وہ گلابے لگا ہے نگاہ اٹھا  
 کر اسے مسکرا کر دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔  
 وہ دن اسے اپنی زندگی کا بہترین دن لگا تھا۔  
 ”اباں مجھے دوسری ٹیوشن مل گئی ہے عمو آسمندہ  
 صبح جایا کروں گی۔“  
 مسرت اپنے کاسوں میں اچھی تھیں مسودھیان نہ

دیا اور اس نے خاموشی سے سارے کپڑے اور چیزیں  
 الماری میں رکھ دیں۔  
 پھر روز کا بھی معمول بن گیا۔ نادیا کے والد کی  
 آئیڈی سے اس نے مینے بھر کر کچھ لے لی اور صبح  
 سے شام ڈھلے فوٹو کے ساتھ فیکٹری چلی جاتی۔ اس  
 نے اتنا جان سے پیسے ہاتھ چھوڑ دیے تھے اور جب  
 سدرہ کی منگنی کے لیے اتنا جان نے اسے کپڑے  
 بنوانے کے لیے چند سو دینے چاہے تو اس نے  
 بے نیازی سے انکار کر دیا۔  
 ”تھینک یو اتنا جان مگر میرے پاس پہلے ہی بہت  
 ہیں۔ تین تین ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ میرے خرچے  
 پورے ہو رہے ہیں۔ پھر بھی اگر چاہیے ہوں گے  
 تو آپ سے مانگ لوں گی۔“  
 اتنا جان اور تانی متا بہنے پھر بھی اس کے شام کو  
 گھر آنے پر اعتراض نہ کیا۔ حمل ان سے پیسوں کا  
 مطالبہ نہیں کرتی انہیں اور کیا چاہیے تھا۔  
 \* \* \*  
 میزبینوں کے ساتھ گئے قدرتی آسمان کے سامنے  
 کھڑی وہ کان میں بھرا پین دی تھی۔ بھرا چاندی کا  
 تھا، اس کے سلور چوڑی دار پانچا ہے جیسا اور سبز  
 قیص پہ بھی ایسا سلور کام تھا اور وہ پتوں تھا جیسے سبز  
 آسمان پر تارے بکھرے ہوں۔ جھوٹی آستینوں سے  
 اس کے گورے گرداز بازو نمایاں تھے اور نازک  
 کلا نیوں میں بھر بھر کے سلور اور سبز چوڑیاں۔ ہلکا سا  
 میک اپ اور سنہرے بھورے بال سیدھے شانوں پہ  
 بکھرے تھے۔  
 بھرا کان میں جا کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ  
 چوڑیوں بھرے دونوں ہاتھوں سے جھمکے کو کان کے  
 سوراخ میں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سب باہر  
 لان میں جمع تھے پہلنی کا فٹکشن شروع تھا اور ایک  
 اس کی تیاری رہتی تھی۔  
 ”اف او۔“ اس نے جھنجھلا کر جھکا کان سے ہٹایا۔  
 کان کی اوسر پر پڑی تھی۔

”عجب کیا کروں؟“  
 اسی بل آئینے میں اس کے پیچھے فوٹو کا چھوٹا بھرا۔  
 ”فواد بھائی؟“ وہ حیران سی تھی۔ ”آپ اوھر؟“  
 ”تو باہر؟“  
 ”میں تو اوھر ہو۔“ وہ اس کے بالکل سامنے آکر  
 ہوا۔ بلیک سوٹ میں وہ اتنا اسٹارٹ ہندہ بنا بلیک جھمکے  
 جیسے مہوٹ سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظریں ہلا  
 کر اسی بھرا گئیں۔  
 ”تم کتنی خوب صورت ہو حمل۔“  
 حمل کادل ندر سے دھڑکا۔ اس نے ہشمل پلکیں  
 اٹھا کر اسے ان ہی غمور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
 اس کی نظریں کی حدت سے اس کے رخسار سرخ  
 پڑنے لگے۔  
 ”فواد۔“ وہ جھمکا۔ پنا نہیں جا رہا۔ ”وہ گھبرا کر  
 جیسے اوھر دھڑکے۔“  
 ”اوھر دھکاؤ۔“ فواد نے اس کے ہاتھ سے جھکا لیا،  
 ذرا سا جھکا اور ایک ہاتھ سے اس کا کان پکڑا اور اسے  
 ”لو۔“ اس کی ہاتھ تھی اور تم نے پورا کان سرخ  
 کر دیا۔ اس نے نرم جے میں کئے ہوئے اس  
 کے بھورے بالوں کو چھوا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ بھی  
 سنہل کر جھمکے کا سہارا لگنے لگی۔  
 ایک دم ہی فواد کچھ کے ہاتھ پر نکل گیا، اور وہ جو  
 پچھلے لمحے کے فسوں میں کھوئی تھی چونک کر پڑی۔ وہ  
 دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔  
 ”یہ کیا؟“ وہ اچھے کر آئینے کی طرف پلٹی تو ٹھنک گئی۔  
 حسن میزبینوں کے اوپر بکھرا ٹیکسی لگا ہوں سے  
 اسے دیکھ رہا تھا۔  
 وہ گڑا کر جلدی جلدی بالوں میں برش پھیر کر  
 جانے لگی مگر حسن میزبیاں تیز تیز پھلا تلکا نیچے کیا  
 اور۔  
 ”اگر آج کے بعد میں نے تمہیں فواد کے دس فٹ  
 کے قریب بھی دیکھا تو تانکس توڑ کر گھر بٹھا دوں گا  
 تمہیں۔“ غصے سے اس کی کلائی پکڑ کر اس نے اتنی

زور کا جھکا دیا کہ وہ چیخ پڑی۔  
 ”حسن بھائی۔“  
 ”اٹنی جھپٹیں یا نہیں؟“ اس نے دوبارہ جھکا دے  
 کر اس کی کلائی چھوڑی اور ایک عصبی نگاہ ڈال کر بے  
 لہجے ڈگ بھرتا ہا ہر نکل گیا۔  
 وہ سارکت سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔ اس نے سبز  
 چوڑیوں والی کلائی تھامی تھی اور آدمی سے زیادہ  
 چوڑیاں ترتر ٹوٹ کر گرنے لگی تھیں۔ بہت سا کالج  
 اسے چھو گیا تھا اور جگہ جگہ سے خون کے قطرے  
 رسنے لگے تھے۔  
 ”حسن بھائی۔“ انہیں کیا ہوا؟“ وہ دکھ سے  
 اپنی زخمی کلائی دیکھتی رہ گئی۔ سبز کالج کے گلوے فرش  
 پہ پھرے تھے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
 پیسہ ہونے کا یہ مطلب تھا کہ جس کادل چاہے اس  
 پر ہاتھ اٹھائے؟ وہ آنسو پتی اندر کے دم کو ہشمل  
 برداشت کا حرم لگاتی جھک کر کالج چنے لگی۔ بل چاؤ رہا  
 تھا کہ خوب روئے مگر خود کو سمجھاتے وہ دوسری چوڑیاں  
 پہن کر باہر آ گئی۔  
 سدرہ بڑے صوفے پہ دامن کی طرح جی سنوری  
 بیٹھی تھی۔ عام سی شکل لی سدرہ بہت میک اپ کے  
 باوجود بھی عام لگ رہی تھی۔ اس کا منہ ترتر دے موتا  
 تھا اور خلاصا شرمایا ہوا بھی۔ اس میں کچھ ایسا نہ تھا کہ  
 کوئی متاثر ہو تا اور نہ اور سامیہ تو مسکرا مسکرا کر دل  
 چلے تبصرے بھی کر رہی تھیں۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ  
 متاثر نالی کی کسی سیکڑ گزن کا بیٹا تھا۔ نہیں اسلام آباد  
 میں ایک اچھی پوسٹ پہ کام کر رہا تھا۔ جیسے کب  
 رشتہ کیا اور بالی ہوئی اسے اور مسرت کو تو خیروں کی  
 طرح خبر دی گئی تھی۔  
 لان میں قسطوں اور روشنیوں کی ہمار تھی۔ وہ  
 جس وقت باہر آئی تو رسم پوری تھی اور سدرہ نہیں ایک  
 دوسرے کو مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ سب غصہ بول رہے  
 تھے۔  
 وہ خاموشی سے گھاس پہ چلتی ہوئی ایک کرسی پہ آ  
 بیٹھی۔ اس کادل اس اور آنکھیں غمگین تھیں۔



فواد بھی وہیں اسٹیج پر کسی کی بات پر ہنسا ہوا ہے  
 ہنسنے کو مٹھائی کھلا رہا تھا۔ حمل نے اُرد گرد مٹھائی  
 لگا ہوں سے دیکھا۔ اسٹیج کے سامنے گھاس پر ساڑھی  
 میں لمبوس تھڑے اپنی کسی جانے والی خاتون سے جسے  
 حسن کا تعارف کر رہی تھیں۔ حسن کے بازو کو تھامے  
 وہ بہت فخر سے اس کے متعلق بتا رہی تھیں اور وہ  
 مسکراتے ہوئے ان خاتون سے بات کر رہا تھا۔ اس  
 نے بھی بلیک ڈزموٹ پہن رکھا تھا اور بلاشبہ وہ بہت  
 گڈ لکھتھا تھا۔  
 حمل نے دیکھ سے اسے دیکھا۔ اس بل اسے حسن  
 سے بڑا متعلق اور دوغلا شخص کوئی نہ لگا تھا۔ حسن نے  
 اس کی نازک مٹھائی کھنٹیں۔ اس کے دل کو بھی زخمی  
 کر دیا تھا۔ سارے فنکشن کا مزہ خراب ہو گیا تھا۔ وہ  
 اتنی بد دل اور غم زدہ تھی کہ احساس ہی نہیں ہوا  
 وہ سیم کپ اس کے ساتھ اکھڑا ہوا۔  
 ”آج کتنوں کو گرانے کا ارادہ ہے سرکار؟“ وہ ایک  
 دم بہت قریب آکر بولا تو وہ اچھلی وہ اپنے لڑی لوفرانہ  
 انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”بڑے لشکارے ہیں پھوٹی کرن، خیریت؟“ وہ  
 معنی خیزی سے پھر مسکرا کر اُرد گرد کراچی اور لڑکیوں  
 کے گروپ کی طرف بڑھ گئی۔ ساتھ ہی بار بار پیچھے مڑ  
 کر دیکھتی۔ وہ سیم اوپر اُرد گرد کھوٹے مسلسل اسے اپنی  
 نگاہوں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔  
 وہ کبھی بچائی لوگوں میں ہی گھری رہی۔ وہ سب کرنز  
 بہت خوش اور ایک ساتھ حمل نظر آ رہے تھے۔  
 صرف وہ ایک فائو گروار تھی۔ حالانکہ کتنی ہی عورتوں  
 نے پوچھا تھا کہ یہ سبز اور سلور کپڑوں والی لڑکی کون ہے؟  
 وہ غصے ہی اتنی منفرد اور انگ مگر ہر شے سے بے خبر وہ  
 سارا وقت افسردہ ہی رہی۔  
 سدرہ کی پہلے یہ جتنے شخص اور مزے کا اس نے  
 سوچا تھا اس سے بڑھ کر وہ سدرہ ہوئی تھی۔



فواد اسے آفس میں چھوٹے موٹے کام دینے لگا

تھا۔ زیادہ تر اسے سپروائز پر ہی لگاتا کہ  
 ”یہ ڈرافٹ بنواتا ہے اپنی نگرانی میں فنانس کے  
 ڈاکر صاحب سے ہوا لاؤ۔“  
 ”اس چیک پر سائن کروانے ہیں“ مفتی صاحب  
 سے کہہ لاؤ۔“  
 اور یہ سارے کام بہت اعتنا طلب ہوتے تھے۔  
 اسے اچھا لگتا کہ وہ اس پر بھروسہ کرتا ہے اس کا خیال  
 کرتا ہے۔ دوسرے کا کھانا وہ اکٹھے ہی کھاتے باقی وقت وہ  
 اپنے آفس میں کام کرتا تو حمل اپنے کیمین میں بیٹھ کر  
 دوسروں کا بغور مشاہدہ کرتی۔ کبھی بھی اسے احساس  
 ہوتا کہ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی نہ تو وہ زیادہ کام  
 کے بارے میں سمجھ پائی ہے اور نہ ہی وہ اور فواد زیادہ  
 قریب آئے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کی پسند کی چیز منگواتا اس  
 سے اس کی اسٹینڈر اور مشاغل کے متعلق ہلکی چٹکنی  
 صاب شب کرنا اس شام آگینے کے سامنے کھڑے  
 ہو کر جھکا پستانے جیسی بے خودی اور ”جرات“ پھر  
 اس نے نہیں کی تھی۔

اس روز وہ صبح فواد کے ساتھ آفس نہیں گئی تھی۔  
 ”دوسرے اسٹیج پر آنا نہیں چاہیں چیک کرلوں گا“  
 آج مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ صبح دھڑے  
 سے کہہ گیا تھا۔ اور اب وہ مسووری دھڑکے انتظار  
 میں اوپر میز پر بیٹھی جانے لگی رہی تھی۔  
 جانے فواد کو کیا بات کرنی تھی؟ اتنا کیا خاص کام تھا؟

وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھی چائے کے سبب سستی  
 سوچے جا رہی تھی۔ نگاہیں بونسی ساتھ والوں کے لان  
 پر ہلک رہی تھیں۔ وہاں گھاس پر سفید چادریں پھینچی  
 ہوئی تھیں اور ان پر سفید شلوار قمیض اور ٹیوٹیل  
 والے مدرسے کے بچے بل بل کر پیارے پڑھ رہے  
 تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی میز تھی اس پر ایک بڑا  
 سا قرآن اور کچھ پیارے رکھے تھے۔ ساتھ ہی  
 اگر قیام مل رہی تھیں۔

وہ بلا ارادہ ہی بڑے بڑے قرآن کو دیکھے کئی ذہن  
 کے کسی نہاں خانے سے وہ چہرہ نکل کر اس کی آنکھوں  
 کے سامنے آیا تھا۔

سیاہ فام لڑکی کا چہرہ۔ سیاہ آنکھیں اور موٹے موٹے  
 سیاہی مائل ہونٹ۔ وہ کچھ کچھ کو سینے سے لگائے  
 نظر نہ لگتی ہوئی سڑک پر دوڑ جا رہی تھی۔ کبھی بھی اسے  
 وہ منظور آتا تو یوں لگتا کہ شاید۔ شاید جاتے سے  
 اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کیوں رو رہی  
 تھی وہ سمجھ نہ پائی تھی۔  
 اسی طرح بچہ بل بل کر پیارے پڑھ رہے تھے۔  
 اس نے دیکھا کونے میں بیٹھے ایک بچے نے پیارے  
 کا صفحہ لٹے ہوئے احتیاط سے اُرد گرد دیکھا اور پھر وہ  
 صفحے الٹ دیے۔ چند لمحے بعد اس نے پھر نگاہ اس  
 پاس گھمائی اور کسی کو متوجہ نہ کیا کرتیں گئے پھر سے  
 اٹھنے الٹ دیے اور پھر بلند آواز میں لہک لہک کر  
 پڑھنے لگا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی حمل ہنس دی۔ وہ چھوٹا سا بچہ  
 اپنی دانست میں اسے اُرد گرد کے لوگوں کو دھوکہ دے  
 رہا تھا یا پھر شاید رب کو وہ جان نہ پائی۔  
 سچے بہت آہستہ آہستہ اٹھ کر پیارے رکھنے لگے۔  
 یہاں تک کہ سارے پیاروں کا دل میں پھر لگ  
 گیا تو قادی صاحب نے قریب کھڑے ملازم کو  
 اشارے سے اپنی طرف بلا دیا۔  
 ”قرآن خوانی ہو چکی ہے۔ بریگزٹر صاحب کو بلا  
 دیجئے کہ دعا میں شرکت کر لیں۔“ ملازم سر ہلا کر اندر  
 چلا گیا۔

وہ فواد کو بھول کر دلچسپی اور تجسس سے رنگ پر  
 جھکی ساری کارروائی دیکھنے لگی۔ چائے کا کپ اس نے  
 ایک طرف ڈال دیا تھا۔  
 چند منٹ بعد ملازم برآمدہ عبور کر کے لان میں اتر  
 آیا۔ قادی صاحب جو منتظر سے بیٹھے تھے سوالیہ  
 نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔  
 ”سر کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑی ہیں دعا میں شرکت  
 نہیں کر سکتے مگر آپ کا حکم کہ آپ نے قرآن پڑھ  
 دیا۔ سر کہہ رہے ہیں کہ انہیں سکون نہیں ہے پانی  
 سب ٹھیک ہے بس یہی دعا کروائیں کہ انہیں سکون  
 مل جائے۔“

”سر کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑی ہیں دعا میں شرکت  
 نہیں کر سکتے مگر آپ کا حکم کہ آپ نے قرآن پڑھ  
 دیا۔ سر کہہ رہے ہیں کہ انہیں سکون نہیں ہے پانی  
 سب ٹھیک ہے بس یہی دعا کروائیں کہ انہیں سکون  
 مل جائے۔“

سیاہ فام لڑکی کا چہرہ۔ سیاہ آنکھیں اور موٹے موٹے  
 سیاہی مائل ہونٹ۔ وہ کچھ کچھ کو سینے سے لگائے  
 نظر نہ لگتی ہوئی سڑک پر دوڑ جا رہی تھی۔ کبھی بھی اسے  
 وہ منظور آتا تو یوں لگتا کہ شاید۔ شاید جاتے سے  
 اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کیوں رو رہی  
 تھی وہ سمجھ نہ پائی تھی۔  
 اسی طرح بچہ بل بل کر پیارے پڑھ رہے تھے۔  
 اس نے دیکھا کونے میں بیٹھے ایک بچے نے پیارے  
 کا صفحہ لٹے ہوئے احتیاط سے اُرد گرد دیکھا اور پھر وہ  
 صفحے الٹ دیے۔ چند لمحے بعد اس نے پھر نگاہ اس  
 پاس گھمائی اور کسی کو متوجہ نہ کیا کرتیں گئے پھر سے  
 اٹھنے الٹ دیے اور پھر بلند آواز میں لہک لہک کر  
 پڑھنے لگا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی حمل ہنس دی۔ وہ چھوٹا سا بچہ  
 اپنی دانست میں اسے اُرد گرد کے لوگوں کو دھوکہ دے  
 رہا تھا یا پھر شاید رب کو وہ جان نہ پائی۔  
 سچے بہت آہستہ آہستہ اٹھ کر پیارے رکھنے لگے۔  
 یہاں تک کہ سارے پیاروں کا دل میں پھر لگ  
 گیا تو قادی صاحب نے قریب کھڑے ملازم کو  
 اشارے سے اپنی طرف بلا دیا۔  
 ”قرآن خوانی ہو چکی ہے۔ بریگزٹر صاحب کو بلا  
 دیجئے کہ دعا میں شرکت کر لیں۔“ ملازم سر ہلا کر اندر  
 چلا گیا۔

وہ فواد کو بھول کر دلچسپی اور تجسس سے رنگ پر  
 جھکی ساری کارروائی دیکھنے لگی۔ چائے کا کپ اس نے  
 ایک طرف ڈال دیا تھا۔  
 چند منٹ بعد ملازم برآمدہ عبور کر کے لان میں اتر  
 آیا۔ قادی صاحب جو منتظر سے بیٹھے تھے سوالیہ  
 نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔  
 ”سر کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑی ہیں دعا میں شرکت  
 نہیں کر سکتے مگر آپ کا حکم کہ آپ نے قرآن پڑھ  
 دیا۔ سر کہہ رہے ہیں کہ انہیں سکون نہیں ہے پانی  
 سب ٹھیک ہے بس یہی دعا کروائیں کہ انہیں سکون  
 مل جائے۔“

”سر کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑی ہیں دعا میں شرکت  
 نہیں کر سکتے مگر آپ کا حکم کہ آپ نے قرآن پڑھ  
 دیا۔ سر کہہ رہے ہیں کہ انہیں سکون نہیں ہے پانی  
 سب ٹھیک ہے بس یہی دعا کروائیں کہ انہیں سکون  
 مل جائے۔“

”سر کہہ رہے ہیں کہ وہ بڑی ہیں دعا میں شرکت  
 نہیں کر سکتے مگر آپ کا حکم کہ آپ نے قرآن پڑھ  
 دیا۔ سر کہہ رہے ہیں کہ انہیں سکون نہیں ہے پانی  
 سب ٹھیک ہے بس یہی دعا کروائیں کہ انہیں سکون  
 مل جائے۔“



نی رہی۔

”او نہیں۔ میرٹ میں آج ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔“

”میرٹ؟“ لئے بھر کو تو وہ سانس لینا بھول گئی تھی۔ میرٹ میں ڈنر تو کیا اس نے تو بھی اندر سے میرٹ کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ لیکن پھر ڈنر کا لفظ اسے ذرا سا روشن کر گیا۔

”میں اتنی رات کو کیا کہہ رہا ہوں گی فلو ہائی؟“

”نہیں ہم جلدی آجائیں گے اور آج رات میں خود تمہیں گھر لے کر جاؤں گا تب کے سامنے لیکن آگ کو رس تمہارے جواب کے بعد۔“

”جواب؟ کس چیز کا جواب؟“

”کچھ پوچھنا ہے تم سے۔“

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کیا ہو وہ سمجھ رہی تھی؟

”جی ہاں؟“

”یہ تو وہی باتوں گا۔“ تو کچھ کپڑے لیتے ہیں تمہارے۔“ وہ کارپازک کر کے سیٹ بلیک بناتا تھا۔ ”مگر یہ ٹھیک تو ہیں۔“ اس نے معمولی سا احتیاج کیا۔

”او نہیں۔ آج تمہیں اسٹیشن تیار ہونا پڑے گا۔“ اس کے انداز میں نرم سی دھونس تھی۔ وہ ہنس کر ”اچھا“ کہتی بچھاڑ کر گئی۔

وہ لستہ ایک خاصے رنگ کے بوتھ تک لے آیا تھا۔ کپڑوں سے زیادہ کپڑوں کی قیمتیں ہوش اڑا دینے والی تھیں۔ وہ خود ہی آگے بڑھ کر کپڑے لوہراؤ بھر لٹ پلٹ کر دیکھنے لگا پھر زک کر پوچھا۔

”تمہیں ساڑھیاں پسند ہیں جمل؟“

”ساڑھیاں؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”جی مگر بہت

فارل ہے۔“

”کوئی اگر مگر نہیں یہ ساڑھی دیکھو کیسی ہے؟“

اس نے ایک سیاہ ساڑھی آگے کی۔ سیاہ فلوں کی ساڑھی پہ سلور نقش کش بھری تھی۔ وہ اتنی خوب

صورت جھللاتی ساڑھی تھی کہ نظرس خیر و کرہ تھی۔

”اچھی ہے مگر بہت قیمتی۔“

”تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے یہ بیک کر دے۔“

پھر بچھاؤ جوئے اور ایک نازک سا سلور غلوں والا آرٹیفیشل لیکن لینے خاصا وقت لگ گیا۔ وہ پھر ڈھلتے لگی تھی جب وہ چوڑی شاپ میں داخل ہوئے۔ گولڈ ایئر ڈائنمڈ چوڑی شاپ میں جمل کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ ”ہاں فلو اس کے لیے کچھ لٹا دیتی لینے جا رہا تھا؟ کیا وہ اس کے لیے اتنی خاصی تھی؟“

”ڈائنمڈ رنگز دکھائیے۔“ وہ کرسی پہنچ کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا قدرے حکم ورعب سے بولا تو جمل تو سانس لینا ہی بھول گئی۔ خدا اس طرح چمچر بھاڑ کر بھی مہربان ہوتا ہے اسے آج؟

”مگر بارش سار صاحب نے فوراً کچھ سیاہ کپڑے سامنے کیے اور جیسے جیسے وہ سیاہ کپڑے کھلتے جا رہے تھے، جگر تکر کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اس کی آنکھیں چند سیارہ رہی تھیں۔“

”Solitaire میں دکھاؤں؟“

”ہاں بالکل۔“ وہ تو بالکل چپ ہی چلی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ری ایکٹ کس طرح کرے۔

فلو کو کوئی رنگ پسند نہیں آ رہی تھی وہ اس سے رائے بھی نہیں لے رہا تھا۔ بس دھڑاؤ انگوٹھیاں رد کرتا جا رہا تھا۔

”یوں کرو تم پہلے تیار ہو جاؤ رنگ بعد میں لے لیں گے۔“ شاپ سے نکلے ہوئے اس نے گھڑی دیکھی۔

”میری چیز سے سات ایک مینٹک ہے بہت ضروری ہے۔“ اس نے نہیں کر سکا۔ ”مجھے سے سات تمہیں میرے ساتھ آؤں میں بیٹھتا رہے گا اور پھر سات بجے ہم آئیں میرٹ کے لیے نکلیں گے۔ سو تم ابھی تیار ہو جاؤ۔“

”مگر؟“ وہ واقعی حیران ہوئی تھی۔

”پارکر میں اور کدھر؟ میں نے تمہارے لیے پائنٹمنٹ سے لی تھی۔ تم صرف اندر جانا اور وہ تمہیں

تیار کر دیں گی۔“

وہ اسے قریبی پارک لے آیا تھا اور پھر ویسے ہی ہوا جیسے اس نے کہا تھا۔ جمل ایک گھنٹے بعد صبح دہ پارک کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی تو اسے خود رشک آیا تھا۔

سیاہ نقش کش جمل کی ساڑھی میں اس کا دراز قد بلی صراحتی کی گردن اونچے جوڑے کے باعث مزید نمایاں ہو گیا تھا۔ دلکش لک رہی تھی۔ جوڑے سے چند ایک لک رہی تھیں۔ لاسٹ لب اسٹک کے ساتھ بلیک اسٹوکی آئینز۔ اور سیاہ بلاؤز کی پھوٹی آستینوں سے جھلکتے اس کے بے حد گورے سر سے ہانڈ۔ ذرا سی صحت سے وہ اتنی حسین لک رہی تھی کہ خود کو دیکھ کر اس کا دل نہیں بھربا تھا۔

وہ باہر آئی تو وہ جو اس کے انتقال میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، بے اختیار سیدھا ہوا اور پھر جمل کی طرف سے مگر راؤ صاحب اتنی بھی کیا بھڑکے ہوئے تھے۔ اس نے ٹیک کر دوسری طرف سے سنا اور اسے ایس بی کا دل غ تو ٹھیک ہے؟ اس کا باب جاکر دوڑا ہو گا۔ گاہے گاہے ان کے مزار سے نہیں ہیں۔ پورے آگ ڈائریکٹرز میں سے کسی کے پاس اتفاقاً نہیں ہے کہ ان کی ایک کل پہ چلا آئے تھے ہی۔ ”لئے بھر کر اور پھر“ میں پچھو در میں آپ کو بتا ہوں۔“ کہہ کر وہ اب کوئی اور نمبر لائے لگا تھا۔ ”اے ایس بی ہاؤس بلاؤز چلے مسئلہ کیا ہے اس شخص کا۔“

جمل بدلی سی اس کے ساتھ گاڑی کے باہر کھڑی تھی۔ بجائے کیا ہوا تھا، دل میں عجیب عجیب سے دوسرے آواز تھے۔

”خیر بہت سے فلو ہائی؟“

”خیر بہت ہی نہیں ہے۔ اے ایس بی کا بچہ جان کو آ رہا ہے۔“ کتا ہے کتنی کے مالکوں کو بھیجے تو فائل امروہ ہوگی میں ملازموں سے بات نہیں کرنا۔ اب کس کو بھیجوں اور؟ وہ ابھی اسی وقت بلا رہا ہے اور اس کے گھر پہنچنے میں آقا جان یا حسن کو ڈیرہ کھنڈہ نو لگ ہی

ایک دم اسے فلو کے چرے پہ ابھری تھی کی لرو کھائی دی۔ ”آپ میٹر انٹرنیشنل میں یا تو میٹر انٹرنیشنل میں اس سے کیا غرض؟ آپ کو کیا ہے ملک صاحب اگر انہوں نے فائل سائن نہ کی تو جمل صاحب ہماری فیکٹری ڈوب جائے گی، ہم برباد ہو جائیں گے۔“ اس نے ٹیک کر دیکھنا سنا اور ایک دم جیسے بدگ۔ ”کیا مطلب؟ میں اس وقت کیسے آسکتا ہوں اتنی دور؟ میری مینٹک ہے صدق صاحب کے ساتھ مجھے سے سات میں ابھی اے ایس بی صاحب سے کیسے لے آسکتا ہوں؟ کیا بکواس ہے؟“ اس نے جھلا کر فون بند کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ وہ گھبرا کر قریب آئی۔

”معلوم نہیں اب کیا ہو گا۔“ وہ پریشانی سے کوئی دو سارا نمبر دیکھ کر کہنے لگا، ”لئے بھر کو تو وہ جیسے بھول ہی گیا تھا کہ ان کے ساتھ کھڑی ہے۔“

”جی راؤ صاحب میں نے ملک الیاس کو بھیجا تھا آپ کی طرف سے مگر راؤ صاحب اتنی بھی کیا بھڑکے ہوئے تھے۔ اس نے ٹیک کر دوسری طرف سے سنا اور اسے ایس بی کا دل غ تو ٹھیک ہے؟ اس کا باب جاکر دوڑا ہو گا۔ گاہے گاہے ان کے مزار سے نہیں ہیں۔ پورے آگ ڈائریکٹرز میں سے کسی کے پاس اتفاقاً نہیں ہے کہ ان کی ایک کل پہ چلا آئے تھے ہی۔“

”لئے بھر کر اور پھر“ میں پچھو در میں آپ کو بتا ہوں۔“ کہہ کر وہ اب کوئی اور نمبر لائے لگا تھا۔ ”اے ایس بی ہاؤس بلاؤز چلے مسئلہ کیا ہے اس شخص کا۔“

جمل بدلی سی اس کے ساتھ گاڑی کے باہر کھڑی تھی۔ بجائے کیا ہوا تھا، دل میں عجیب عجیب سے دوسرے آواز تھے۔

”خیر بہت سے فلو ہائی؟“

”خیر بہت ہی نہیں ہے۔ اے ایس بی کا بچہ جان کو آ رہا ہے۔“ کتا ہے کتنی کے مالکوں کو بھیجے تو فائل امروہ ہوگی میں ملازموں سے بات نہیں کرنا۔ اب کس کو بھیجوں اور؟ وہ ابھی اسی وقت بلا رہا ہے اور اس کے گھر پہنچنے میں آقا جان یا حسن کو ڈیرہ کھنڈہ نو لگ ہی



# خدا

لاہور

مارچ 2011 کا شمارہ "سیراندر" شائع ہو گیا ہے

مارچ 2011 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ اداکار "فیصل قریشی" کے حالات

☆ "صراطِ دوست کا حاصل" ہمارا کامل ڈول

☆ "انک آرزو شہبازی" سمیرا گل کا مکمل ڈول

☆ "مسافت طے ہوئی" سمیرا ممتاز خان کا دل

☆ "محبتوں میں حساب کیسا" منجھہ فیسم کا دل

☆ اس کے علاوہ ساس گل، حسین اختر، ریاض اور شازیہ صفی کے انٹرویوز

☆ "پیدائش" فروخت شوکت کا مکمل ڈول

☆ "مجھے ناسخ سے کہو" ام مزید کا مکمل ڈول

☆ "میں سناؤ صبحِ امید کا" فوزیہ غزل کا دل

شکلا وارڈول

☆ ہمارے ہی شمارے کی باتیں، انکشاف، تاہم، انٹرویوز، شازیہ، کی، دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ سنا کے بھی مشکل مسئلہ شامل ہیں

مارچ 2011 کا شمارہ آج ہی

اپنے قریبی ایک انسال سے طلب کریں

خود ہی سی بی سی کی اور بال بابت ہے بکھرے تھے بلکہ کوٹ میں بیٹوں جس کے اندر سفید شیش کے دو جن لوہے سے گئے تھے ایک ہاتھ میں اور دوسرے جس سے بھراؤ ان گلاس پکڑے وہ بغور اسے اندر آتے دیکھ رہا تھا۔

ایک لمبے کو تو محل کے قدم ڈنگ گئے اس کا پالا زیادہ تر گھر کے لوگوں سے ہی پڑا تھا۔ فوار اور حسن خوش شکل تھے کچھ دولت کی چمک دمک سے بھی اسٹافٹس لگتے تھے باقی اس کے بچاؤں میں بھی کوئی اتنی سٹارٹ کن شخصیت کا مالک نہ تھا جتنا صوفے پہ بیٹھا وہ مغرور سا دیکھنے والا شخص تھا۔ پنڈ سم۔ بے حد پنڈ سم۔ انا وجہ مراد اس نے پانی مرتبہ دیکھا تھا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مرعوب ہو گئی۔ وہ خاموشی سے اسے بغور جاچھی لگا ہوں سے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ آکر سوچی سامنے والے صوفے پہ بیٹھی اور فائل سامنے میز پر رکھ دی۔ لب اس کا اعتماد کی حد تک بحال ہوئے لگا تھا۔

"یہ فائل آپ کو ملانی تھی اے ایس بی صاحب" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھتے اس کے مقابل بیٹھی خامسے اعتماد سے بولی تو وہ ذرا سا مسکرایا، پھر سامنے ہاتھ پاندھے کھڑے سوڈو نوڈ خض کو دیکھا۔

"ان کو اتنا فوار کریم نے ہی بھیجا ہے رادو صاحب؟" مسکرا کر کہتے اس نے جس کا گلاس لیوں سے لگایا۔ محل نے ذرا جو تک کر رادو کو دیکھا۔

وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ کچھ تھا ان دونوں کی معنی خیز مسکراہٹ میں کہ دور اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بج رہا۔

"تو آپ فائل اپنا کر لے آئی ہیں؟" وہ استہزائیہ مسکراتی نگاہوں سے کہہ رہا تھا۔ محل کو الجھن ہوئے گی۔

"جی، یہ آٹا گروپ آف انڈسٹریز کی فائل ہے اور۔۔۔"

"اور آپ کی اپنی فائل؟ وہ کہاں ہے؟" اس نے

مذہب ہو گیا۔ یہاں تو پھر سوچا کہ پروپیٹ سے ایک سا تھ کر گیا۔

سارا راستہ وہ پچھلی سیٹ پہ ٹیک لگائے آنکھیں موندے اس ہیرے کی انگوٹھی کے متعلق سوچتی آئی تھی، جو فوار نے یقیناً لے لی ہوگی اور جب وہ تانی انہں کے سامنے کھڑا ہو کر محل سے شادی کی بات کرے گا تب تو مانو گھر میں طوفان ہی آجائے گا۔ مگر اچھا ہے۔ ایسا ایک طوفان ان فرخوٹوں کو لرزاتے کے لیے آتا چاہیے۔

وہ پڑ سکون، سسٹن اور پڑا تھا۔ گاڑی طویل ڈرائیو نے عبور کر کے پورچ میں رکی تو وہ ایک ستانی نگاہ خوب صورت سے لان پہ ڈالتی نیچے اتری۔

میں ڈور پہ ایک سوڈو نوڈ اوپنر عمر شخص جیسے منظر سا کھڑا تھا۔

"اے ایس بی مالوں واؤ۔۔۔؟" اس نے ذہن میں اندازہ لگایا اور فائل مضبوطی سے پکڑے اعتماد سے چلتی ان کے قریب آئی۔

"میں آٹا گروپ آف انڈسٹریز سے۔"

"جی میٹم محل اور ایس اے ایس بی صاحب اندر آپ کا فی اعتماد کر رہے ہیں۔ اس نے دروازہ کھول کر راستہ دیا۔ وہ لمبے بھر کو پچھلی اور پھر خود کو بیٹھے ہوئے اندر قدم رکھا۔

روشنیوں میں گھرا وہ بے حد نفیس اور قیمتی سامان سے آراستہ گھر اندر سے اتنا خوب صورت تھا کہ خود کو شہیدہ رکھنے کی کوشش کے باوجود اس کی نگاہیں جھپک جھپک کر اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اے ایس بی صاحب کدھر۔۔۔" وہ اندر آتے کا انتظار کر رہے ہیں۔ "وہ اس کے آگے تیز جیز چلتے ہوئے لاؤنج میں لے آیا۔ "سرا یہ بیچ گئی ہیں۔"

اس نے لاؤنج میں قدم رکھا تو سامنے بیٹھے شخص کو اپنی طرف متوجہ پایا۔

وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ تھوڑی

جائے گا اور اگر نہ پچھے کو پھر سوچا کہ پروپیٹ ڈوب جائے گا۔ "وہ جھپٹا کر بار بار کسی کو فون ملانا بہت ہے بس لگ رہا تھا۔" اب یہی حل ہے کہ میں ابھی اس کے پاس چلا جاؤں اور واپس آکر صدیقی صاحب سے میٹنگ کر لوں۔"

"اور ڈز کینسل؟" اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"مگر بڑے کا محل؟" اس نے ہاتھ روک کر محل کا تاریک پڑا چروکھا۔ "آئی ایم سوری میں یوں شہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میری مجبوری ہے وہ ملازموں سے بات نہیں کرے گا گھر کے بندے کو ہی جانا پڑے گا۔"

"میں بھی ملازم ہوں فوار بھائی؟" ایک خیال سا اس کے ذہن میں ابھرا۔

"کیا مطلب؟" وہ جیسے چونکا۔ "اگر۔۔۔ اگر میں آپ کے دو کاموں میں سے کوئی ایک کر دوں تب تو ہم ڈز پر جا سکتے ہیں نا؟" وہ ہچکچا کر بولی کہ کہیں وہ برائے نہ جانے۔

"ارے مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ تم بھی تو کہنی کے اوپر ذہن سے ہو تم بھی تو یہ فائل سامنے کر داسکتی ہو۔ بلکہ یوں کرتے ہیں ہم ڈرائیور کے ساتھ فائل لے کر چلی جاؤ، جب تک میں حدیقی صاحب سے میٹ لیتا ہوں اور پھر ڈرائیور تمہیں ہوسٹل لے آئے گا، ٹھیک؟" اس نے منہوں میں سارا پلان ترتیب دے دیا تو گہری سانس بھر کر رہی۔

"ٹھیک ہے میں پھر پیچ کر لوں۔"

"نہیں نہیں ایسے ہی ٹھیک ہے" اس طرح تو تم واقعی کوئی پڑا اعتماد ایکٹو کیٹو لگ رہی ہو۔ پے ساری برس دیکھن فوار کی ایسے ہی ڈریس آپ ہوتی ہیں۔ میں ڈرائیور کو کال کر لوں۔"

وہ مطمئن تھا مگر محل کو قدرے عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ اتنی قیمتی اور بھلائی سا ڈیجیٹل میں کسی فنکشن کے لیے تیار لگ رہی تھی، کسی آئینہ مثل معاملے کے لیے سوڈوں نہیں، لیکن اگر فوار کہہ رہا تھا تو ٹھیک ہی



گلاس سائیڈ پر رکھا اور قدرے جھک کر ہاتھ بڑھا کے  
 فائل اٹھائی۔  
 ”میری کون سی فائل؟“ کچھ تھابو اسے کہیں غلط  
 لگ رہا تھا، کیس کچھ بہت غلط ہو رہا تھا۔  
 ”آپ جائیں راؤ صاحب!“ اس نے فائل کے  
 صفحے پلٹا کر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور پھر فائل اس کی  
 طرف بڑھائی۔ محمل لےنے کے لیے اٹھی مگر بہت تیزی  
 سے راؤ صاحب نے آگے بڑھ کر فائل تھامی۔  
 ”اور جا کر آٹا فواد کے ڈرائیور کو لیں کہ فائل  
 اپروڈ ہے، مگر ان کو ریسول جانے لگی۔“  
 ”بہتر سر!“ راؤ صاحب فائل لے کر پلٹے تو وہ اٹھ  
 کھڑی ہوئی۔  
 ”مجھے دے دیں میں لے جاتی ہوں۔“  
 وہ دونوں ایک دم چونکے تھے اور پھر کرک کر ایک  
 دوسرے کو دیکھا۔ ہمایوں نے اشارہ کیا تو راؤ صاحب  
 سر ہلا کر ہاتھ نکل گئے۔  
 ”آپ پیسے مارا ام ڈرائیور دے آئے گا۔“  
 ایک دم ہی اس کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی زور  
 زور سے بجنے لگی تھی۔ اسے لگا وہ غلط وقت پہ غلط جگہ  
 اور غلط لوگوں کے درمیان آگئی ہے اسے وہاں نہیں  
 آنا چاہیے تھا۔  
 ”میں نہیں چلتی ہوں۔“ وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ وہ  
 تیزی سے اٹھا اور زور سے اس کو بازو سے پکڑ کر اپنی  
 طرف گھمایا۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔  
 ”زیادہ اوور سمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو  
 کہا جا رہا ہے ویسے ہی کرو۔“ اس کے بازو کو اپنی آہنی  
 گرفت میں دبوچے وہ غرایا تھا۔ مجھے بھر کو تو زمین  
 آسمان محمل کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔  
 ”چھوڑیں مجھے۔“ وہ منہ بھلی ہی نہ پائی تھی کہ ہمایوں  
 دائور سے اس کی دونوں بازوؤں کو ہاتھوں میں پکڑ کر اسے  
 جھٹکاتے کر اپنے بالکل سامنے کیا۔  
 ”زیادہ چالاک اور کھالی تو اپنے پیروں پہ گھر نہیں جاؤ گی۔“

”مہم۔۔۔ مجھے چھوڑیں۔۔۔ مجھے گھر جانا ہے۔“ محمل  
 نے اس کو پرے دھکیلتا چاہا مگر اس کی گرفت بہت  
 مضبوط تھی۔  
 ”گھر جانا ہے؟ گھر ہی جانا تھا تو یہ اتنے بناؤ سنگسار  
 کیوں کیے تھے؟ ہوں؟“ اس نے ہولے سے اس کی  
 تھوڑی کو انگلی سے اور کیا دوسرے ہاتھ سے کہنی اتنی  
 مضبوطی سے جکڑ رکھی تھی کہ وہ مل نہ پائی اور گھبرا کر  
 چروچھے کیا۔  
 ”میں فکشن پہ جاری تھی آپ مجھے غلط سمجھ  
 رہے ہیں میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ آپ فواد بھائی  
 سے میری بات کرائیں، انہیں بتائیں کہ۔۔۔“  
 ”بھائی؟“ وہ چونکا۔ ”آٹا فواد تمہارا بھائی ہے؟“  
 ”جی۔۔۔ جی۔۔۔ سہہ میرے بھائی ہیں آپ بے شک  
 ان سے پوچھ لیں۔ مجھے یہاں نہیں آنا تھا تو وہ بھائی کو  
 خود آنا تھا، مگر ان کی سیٹنگ تھی۔“ وہ ایک دم روٹنے  
 لگی تھی۔ ”آپ پلیز مجھے گھر جانے دیں میں غلط لڑکی  
 نہیں ہوں میں ان کی بہن ہوں۔“  
 ”جسٹ ہیل ری ہے۔“ راؤ بچھے آگے بڑھا تھا۔  
 ”اسی کو اور آٹا تھا۔ چار منٹ پہلے تو وہ مل تھی سر اور  
 اسی کے نام سے ہوئی تھی۔ کم عمر خوب صورت اور  
 آن چھوٹی۔ اتنا نے کہا تھا یہ ہماری ڈیپانڈ پروری اترتی  
 ہے۔“ راؤ کا لہجہ سیٹ تھا، محمل ابراہیم نام سے نا  
 تمہارا؟ تم آٹا کی بہن کیسے ہو سکتی ہو؟ وہ تین کروڑ کے  
 نفع کے پیچھے اپنی بہن کو ایک رات کے لیے نہیں بچ  
 سکتا۔“

(دوسری ادوار آخری قسط آئندہ ماہ)

سردق کی شخصیت

ماڈل	کرینا
ٹرائیوٹ	موسیٰ رضا
ایک آپ	دو زیوں پائلر

# دیکھیں براتوار کی رات

## 8:00 بجے

### فکار، بانمان، عجز، سوز، ارم، شین، اماشل، بینش، جبران، آرمین

#### میرا سائین

As B Production Presents

بہارِ حیات، مہاجرِ حیات

Keep Watching ARY Digital Network

ARY DIGITAL





کوئی دیوار ہے نہ در سائیں  
ہم فقیروں کا کیا ہے گھر سائیں  
آیلے پڑ گئے ہیں پیروں میں  
ختم ہوتا نہیں سفر سائیں  
کون رہتا ہے اسی غزلے میں  
دھونڈتی ہے کسے نظر سائیں  
اک قیامت گرد گئی مجھ پر  
اور مجھ کو نہیں خبر سائیں  
ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو  
اور ہونا ہے حدِ در سائیں  
رمزی آتم

### اک گلاب باقی ہے

جھیل کی ادا سی میں  
بے دلی کی دلدل پر  
بے خبر سے منظر میں  
درد کے سمندر میں  
ایک یاد باقی ہے  
آنکھ میں خزاںِ رت ہے  
گرد آؤتی رہتی ہے  
پھر بھی ایک کونے میں  
اک گلاب باقی ہے  
ایک یاد باقی ہے  
ارشد نعیم



مذتوں بعد شبِ ماہ اُسے دیکھا تھا  
دم بدم بڑھ رہی ہے یہ کیسی صدا شہر والو سنو  
پر کسی اود کے ہمراہ اُسے دیکھا تھا  
جیسے آئے رہے پاؤں سیل بلا، شہر والو سنو  
کیا خبر تھی کہ کہانی کوئی بن جائے گی  
یہ جو راتوں میں پھرتا ہے تنہا بہت ہے اکلا بہت  
میں نے کل بزم میں ناگاہ اُسے دیکھا تھا  
ہو سکے تو کبھی اس کا بھی ماجرا، شہر والو سنو  
وصل کی رات ستاروں نے بٹھا حُسن سے  
اس کے جی میں ہے کیا اس پر چھوڑا، دیکھیں کہتا ہے کیا  
گاہ دیکھا تھا مجھے، گاہ اُسے دیکھا تھا  
کس نے اس شخص پر کوہِ غم ڈھادیا، شہر والو سنو  
آج اک عمر کے بعد اُس سے ملا تھا لیکن  
عمر بھر کا سفر، جس کا ماحصل ہے اک لمحہ مختصر  
اپنے احوال سے آگاہ اُسے دیکھا تھا  
کس نے کیا کھودیا، کس نے کیا پالیا، شہر والو سنو  
اس کا کیا ٹھیک کہ لوگوں نے یک وقت جمال  
خاک اُڑاتی نہ تھی اس طرح تو ہوا اسی کو کیا ہو گیا  
سرمینخانہ و درگاہ اُسے دیکھا تھا  
دیکھو آوازِ دیتلے ہے اک سانچہ، شہر والو سنو  
جمال احسانی  
اظہر نہیں



## لکھنے کا

محل ابراہیم، آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد بایا آغا کریم اور چچاؤں کے رجحان پر بہت مسرت سیدھی سا جی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا خلق محل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً "نانی مستاب" کا رویہ بال بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محل بیوٹن سینٹر میں بڑھاتی ہے۔ آغا ابراہیم کے اس محل نما گھر میں آغا کریم اور مستاب "نانی فواد" خاتون و سہم سدرہ اور مریم کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے ہر وہاں بھائی آغا شقران اور فضلہ بیگم کے تین بچے حسن، ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعصہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو، معینہ اور معاذ ہیں۔ جبکہ رضیہ بیگم کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں "نانی مستاب" اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو، فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محل کو "نانی مستاب" کے خاندان کی اس دلچسپی رنگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو، سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور نہایت سے حید ہے۔

کار کھانے ہوئے ہر روز اسے ایک راسخ راسخ قائم لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی، حال، مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گریخت میں

## مکمل کتابوں





کرنے کا نسخہ ہے۔ محل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محل "تاکریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی ایک کارشپس مل جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایرینا ٹیکل انجینئر فرنان کارشپس سندرو کے بجائے محل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سناں سو گھ جاتا ہے۔ نائی منتاب فوراً افکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محل اور مسرت کو بہت رنج ہو آتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی کرتا ہے اور اسے فیکلٹی میں آنر شپ دینے اور جاب کرنے کے لیے اتنا جان سے بات کرتا ہے جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے شک اگر محل اس پر سرار لڑکی سے سنا جلدواری کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے محل ہی نائی منتاب سب کے ساتھ اسے رنگے پاٹھوں پر ملتی ہیں۔ لیکن یہ بتانا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ نائی منتاب اپنی بے عزتی پر بے حد غمگین ہوتی ہیں۔ محل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت سخت بھی مانتی ہے۔ اس پر وہ لڑکی بھی سی جاتی ہے۔

اتنا فواد سب سے چھپ کر محل کو فیکلٹی لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اسے پیش قیمت لمبوسات بھی دلوانے تاکہ سندرو کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن محل کو فواد کے سامنے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میرٹ میں ڈاکر کا تھا سندرو کے فواد محل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرنا ہے۔ راستے میں کسی ڈبل کے نہ ہونے پر نقصان کا دور بار چا کر محل کو کلاٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محل کو اتنا فواد کے اصل چہرے کا اور اک ہو آتا ہے۔ فواد نے اسے ایس بی کے سامنے محل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محل چکر اکر رہ جاتی ہے۔ سندرو اسے بتاتی ہے کہ اتنا فواد اس کا بھائی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

## دوسری قسط

اس کے ارد گرد جیسے دھمکے ہوئے تھے۔ اسے بہت زور کا چکر آتا تھا وہ گرنے ہی لگی تھی کہ ہائیوں نے اس کی دوسری گھنٹی سے پکڑ کر اسے گھڑا رکھا۔

"اب سید محی طرے بتاؤ کہ تم ہمیں بے وقوف بنانا رہی ہو یا آگاہے کہ ہمیں بے وقوف بنایا ہے۔ تم محل ایرانیم ہو اور وہ فواد کریم! وہ تمہارا بھائی ہے؟" اس نے عرصے سے لڑکیوں فراتیم کر رہا ہے پہلے تو بھی اپنی بہن کا سودا نہیں کیا۔

"نہیں۔" اس نے بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ فواد بھائی میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ۔ آپ میری ان سے بات کرائیں۔ آپ خود سن لیں تاکہ اور میرا دھڑک رہے ہیں

ہمیں فنکشن دینا چاہتا تھا۔"

ہر عام انسان کی طرح محل کو بھی جھوٹ کی بات چٹکنی حالت تو تھی ہی اور اسی پرانی عادت کا مکمل تھا کہ خود بخود اس کے ہاؤس سے ڈنر کی جگہ فنکشن نکلا تھا۔ کہیں لا شعور میں اسے احساس تھا کہ اگر وہ اپنے اور فواد کے خاص ڈنر کا کتنی قودا سے پری لڑی سمجھتے۔

"راؤ صاحب! اتنا فواد کو فون ملایں۔"

"راٹ سر! راؤ سوا جس نے نمبر ملانے لگا۔"

"اور پیکر کن رہیں۔" اس نے کہہ کر ایک گہری نظر محل پر ڈالی جو بے قرار اور ہراساں سی راؤ کے آتھ میں پکڑے فون کو کچھ رہی تھی۔

"جی راؤ صاحب۔ ایک دم کمرے میں فواد کی

تواڑ کو بھی۔" مل بھی گیا؟

"جی! وہ کہا ہے مگر راز سے تواڑ مت دیتے ہیں۔ آپ بات کر لیں۔" اس نے فون آگے بڑھا کر محل کے گلے سے لگایا۔

"ہیلو فواد بھائی! وہ روڑی تھی۔" فواد بھائی ایہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں آپ پتہ لڑان کو۔"

"کو اس مت کرو اور میری بات غور سے سنو۔ تمہیں وہ ڈانڈ رنگ چاہیے یا نہیں؟ چاہیے ہے تا تو جیسے اسے ایس بی صاحب کے ہیں کرنی چاہو۔"

"فواد بھائی! وہ محل کے گل چٹائی۔" یہ میرے ساتھ کچھ غلط کریں گے۔"

"وہ جو کرتے ہیں کرتے وہ صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ اب زیادہ بک بک مت کرنا، صبح تمہیں ڈرا پور دینے آجائے گے۔" سناؤں آسمان اس کے سر پہ ٹوٹے تھے۔

وہ سانس ہی کھری رہ گئی۔

"صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔" اس کی تواڑ اس کے ذہن پہ ہتھوڑے پر سارہی تھی۔

"اس ایک ڈانڈ رنگ کا لاراوا ہے اس نے تمہیں؟ اور تم تو کہتی ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے؟" فون اس کے کان سے ہٹا کر بند کرتے ہوئے ہائیوں نے طنز پر مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

وہ اسی طرح پتھر کا بے جان پرت کی کھڑی تھی اس کا ذہن ٹل لکھن، آگاہیں نسب بند ہو چکے تھے۔

"راؤ صاحب! پتہ کرائیں کہ یہ واقعی فواد کریم کی بہن ہے یا نہیں اور اس کی بات میں کتنی سچائی ہے؟ یہ تو ہم بعد میں خود معلوم کر لیں گے۔" محس، پھل۔"

اس نے زور سے تواڑ دی۔

اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔

ہلکت کھڑے وجود میں سے کسی قسمی جان آہستہ بہت نکل رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے

اندھیرے سیل چھانے لگے تھے۔

وہ کن میں دوڑتے ہوئے اندر آئے تھے۔

"محس! اسے اوپر والے کمرے میں بند کر دو۔" دھیان کرنا کہ بھاگنے نہ پائے اور پھل۔ اس سے پہلے کہ اس کا فواد محل ہو یا محل چکر اکر گری اور اگر اس نے اس کو وہ لول یا ڈنر سے تھام نہ رکھا ہو تا تو وہ بچے کر پڑتی۔

"محل! محل! وہ اس کا چوہہ تھپتھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی تھیں اور ذہن گہرے اندھیروں میں ڈوبنا چلا گیا۔

اس کی آنکھوں پہ کچھ نمی ڈالی گئی تھی۔ سلیپن کا احساس تھا یا کچھ اور اس نے ایک دم بڑھ کر آنکھیں کھولیں۔

"اندھ جاؤ! بہت سو لیا۔" وہ گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کر سامنے کر سی پہ جا بیٹھا تھا۔

چھوٹے تو وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی اور جب آہستہ آہستہ ذہن بیدار ہوا تو جیسے چونک کر سیدھی ہوئی۔

وہ بڑا سا پتھیش بند دوم تھا۔ یقینی صوفے، قالین اور بھاری خوب صورت پردے۔ وہ ایک بند پہ لیٹی تھی اور اس کے اوپر بند کور ڈالا ہوا تھا۔ سامنے کر سی پہ وہ اٹھنے اٹھنے کے طور کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ دے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

اسے یاد آیا فواد اسے کسی کمرے میں بند کرنے کی بات کر رہے تھے جب وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی۔ اب وہ کدھر تھی؟ اور اسے کتنی دیر بہت چکی تھی؟ کھر میں سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔

وہ گہرے آرتھر دے سیدھی ہو بیٹھی۔ ابھی تک اسی سیاہ جھلکاٹی ساڑھی میں لیوس تھی اور پویش کی لگائی ماری لائنیں دیسے ی کس کے گل تھیں۔

"مم۔ میں کدھر ہوں؟ کیا وقت ہوا ہے؟" جی ہو



گئی؟" وہ پریشان سی لہو لہو کر دیکھنے لگی تو سامنے والے کھاکہ پر نگاہ پڑی۔

ساتھ سے نہیں بچ کرے تھے۔

"ابھی صبح نہیں ہوئی اور آپ وہیں ہیں جہاں آنے کے لیے فلو نے تب کو ڈاکٹر زنگ کا علاج دیا تھا۔"

"مجھے فلو بھائی نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا انہوں نے کہا تھا کہ میں فائل سائن کروا کر واپس آ جاؤں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"میں کیسے مان لوں کہ تم جی کہہ رہی ہو آغا فلو تو کہتا ہے کہ تم اس کے گھر میں پلنے والی ایک یتیم لڑکی ہو نہ کہ اس کی بہن۔"

"یتیم ہوں تب ہی تو تم جیسے عیاںوں کے ہاتھ بچ ڈالا اس نے مجھے جو میرا سا کیا اور بھلائی تھی۔ تم سب گدھوں کا بس تیرہوں پہ ہی تو چلنا ہے۔" وہ پست پڑی تھی۔

"مجھے یہ آئسو اور جذباتی تقریریں متاثر نہیں کرتیں۔" وہ لب اعظمیان سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔

"مجھے صرف بچ سنا ہے اور ٹھیک ٹھیک ورنہ میں تھانے لے جا کر تمہاری کھال کو ہڑدوں لگا دوں گا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے وہ تمہیں کتنا شیرازہ دیا ہے کہ ہر کہہ رہا ہے اس نے تمہیں اور تمہارے اس گینگ میں اور کون کون ہے؟"

سگریٹ کا ایک کس لے کر اس نے وہاں چھوڑا تو لمبے بھر کو وہ جوئیں کے سرخوے ان دونوں کے درمیان جا مل ہو گئے۔

"مجھ سے قسم لے لوں یا نہیں؟"

"قسم لے لوں؟ واقعی؟"

"ہاں لے لیں۔"

"سو نہ توں کے سامنے عدالت میں اٹھاؤ گی قسم؟"

وہ ہانگ پہ ہانگ رکھے بیٹھا سگریٹ بول میں بجائے کس لے رہا تھا۔

"میں تیار ہوں۔ مجھے عدالت میں لے جائیں میں یہ سب گھرائے کو تیار ہوں۔"

"وہ تب ہو گا جب میں تمہارے کسے یقین کروں گا۔ یقین جو ابھی تک مجھے نہیں آیا۔" اس نے سگریٹ لٹش کرے پہ جھکی۔ راہ کے چند ٹکڑے ٹوٹ کر گرے۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا کسی گینگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھے فلو بھائی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"تم اسے بچانے کی کوشش کر رہی ہو میں جانتا ہوں۔"

"نہیں پلیز۔" وہ لطف انداز کر رہی تھی اور کھنٹوں کے کل اس کے قدموں میں آئی تھی۔

"اے ایس بی صاحب؟" اس نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں لا علم تھی کہ آپ کا کیا مقصد ہے کہ فلو بھائی کا کیا مقصد ہے میں میریٹ میں ذمہ لے جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" اس کی کھانچ شہری آنکھوں سے آئسو ٹوٹ کر گرنے لگی۔ "اللہ کی قسم یہ سچ ہے۔"

"اللہ کی قسم کھانے کے لیے آغا فلو نے کیا پیش کیا تھا؟ ڈاکٹر کا بیٹ؟"

وہی شہی پولیس آفیسر اور مخصوص طرز انداز۔ جتنا وہ شخص وجہ تھا اس کی زبان اس سے بڑھ کر کڑی تھی۔ حمل کا دل چاہا اس کا منہ لوج لے اور اگلے ہی بل وہ اس پہ جھپی اور اس کی گردن دوڑتی چلی مگر وہاں نے اس کی دونوں گلایاں اپنی گرفت میں لے لیں۔ اسی منکھش میں حمل کے دو عین اس کے گل سے گر گئے۔

"صرف آنکھیں نہیں تمہاری تو حرکتیں بھی بلہوں والی ہیں۔" وہ گڑبڑا "اور اس کو کھائیں ہے کچھ بے چارے۔" وہ ہاتھ کھڑا کیا پھر کھانے کے لیے بڑھوٹا۔

وہ تو قسم لے رہی تھی۔

"مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے گھر جانے دے۔ میں تمہاری

منت کرتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگا تو وہ غریب کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور پھر سے ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھ کو تو بدنام ہو جاؤں گی۔"

"میں نے کہا تھا بی بی اچھے یہ جذباتی تقریریں متاثر نہیں کرتیں۔" اس نے اپنے گل پہ ہلکا سا ہاتھ پھیرا۔

پھر استر ایتھ مسکرایا۔ پھر کہا۔ "تم مبارک ہو۔ میں شہیں گھر جانے والی گا مگر ابھی نہیں۔ ابھی تم کو ضروری رہو گی۔ کم از کم صبح تک۔"

"میں بدنام ہو جاؤں گی اے ایس بی صاحب رات گزر گئی تو میری زندگی بٹہ ہو جائے گی۔"

"ہو جائے مجھے پروا نہیں ہے۔" وہ سگریٹ جھک کر لٹش کرے میں پھینک کر دوڑنے کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھ جوڑے کھڑے رہ گئی اور وہ دوڑا نہ جاہر سے بند کر کے جاچکا تھا۔ دوڑنے کی جانب وہ پہلی اور دوڑنا تب زور سے کھینچا۔ جاہر سے بند تھا۔

"دوڑا نہ گھولو۔ گھولو۔" وہ دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دوڑا نہ جانے لگی مگر جواب نہ دیا۔

وہ سب لڑکی لڑکپن پہ قہقہے مانی گئی۔

فلو نے۔ فلو اس کے ساتھ ایسا کر سکا تھا؟ اسے یقین نہ آتا تھا اس نے کیا کیا تھا فلو کا جو اس نے چند دنوں کے عرصے میں کیا؟

وہ کھنٹوں پہ سر رکھے آئسو بھائی وہ شہر پار کر رہی تھی جب وہ اسے دیکھتے دیکھتے پونکھا اور چائے کا کپ لیتے ہوئے اس کی انگلیاں اس کے ہاتھ سے مس ہوئی تھیں۔

"تم عمر خوب صورت اور ان چھوٹی۔" آغا نے کہا تھا یہ ہماری شہنائی پوری اترتی ہے۔"

تو وہ اس سے پونکھا تھا کہ کسی عیاش شخص کی بھائی کی شہنائی اس کے گھر میں پلنے والی وہ یتیم لڑکی پوری کرے گی۔

اس کی خوب صورت ہو حمل اچھے پائی نہیں اس کے لیے کافی ل اور پھر اس کی وہ سادگی

شہنائی میں۔ وہ جان تھا کہ اس کی کمزوری کیا ہے اس نے اس کو اس کی من پسند چیزوں کی جھلک بھائی میں لٹک کر وہ جب اس کے گل قابو میں آئی تو فلو نے اسے لہو لہو بچا دیا اور وہ بھی لٹی بے وقوف اور سادہ تھی اسے یہ پتی نہ چلا۔ وہ اس کو آئسو میں لہو لہو کر چکر سائن کرانے لگا۔ بچ دیتا تھا اور کوئی کام تو اس نے حمل سے لیا تھا نہ تھا نہ تب بھی نہ سمجھ سکی؟

اور اب یہ شخص ہاتھوں واؤڈو میں جا رہی تھی کہ یہ آئی کون تھا اس سے یہ سب باتیں کیوں پوچھ رہا تھا اور اس کا کیا مقصد تھا اسے صرف علم تھا تو اتنا کہ اگر راست بہت ہی بوجھ اسے کوئی قبول نہ کرے گا اور قبول تو شاید اب بھی کوئی نہ کرے۔ کوئی فلو کے خلاف اس کی بات پہ یقین نہیں کرے گا کوئی اسے بے گناہ نہ سمجھے گا اور فلو تو شاید سرے سے عمری جانے کے وہ بھی حمل کو آئسو لے کر گیا ہے۔ خدا یا نہ کیا کرے؟

اس نے بیجا جو اٹھایا کہ قدرے دھندلا سا دھلائی رہا تھا۔ اس نے پکیں جھپکیں تو آنسوؤں کی دھندلی پڑ چکی تھی۔

مگر نہایت خوب صورتی سے آرام تھا۔ فیتی قالین خوب صورت فرنیچر اور بھاری ٹیلیں رہے۔

پروے؟ وہ چوکی۔ کیا ان کے پیچھے کوئی کھڑی تھی؟ وہ پردوں کی طرف دوڑی اور جھٹکے سے انہیں ایک رخ کھینچا۔ پردہ کھلا چلا گیا۔

یاہر تیرس تھا اور اس کی دو خیاں چلی ہوئی تھیں جن میں وہ بغیر وقت کے دو گن میں چوکس کر رہے دیکھ سکتی تھی۔

اس نے گھبرا کر پردہ برابر کیا۔

"اللہ تعالیٰ پلیز؟" وہ روکنا کرنے لگی اور جب دھا کرتے کرتے جھٹک لگی تو سہ ڈرنگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنا عکس دیکھا۔

وہ نے سارا اکھل بہہ گیا تھا، ہاتھیں متورم اور قدرے بھیاٹا۔ لگ رہی تھیں۔ جو ڈاؤن ہیلز پر



مردان تک آیا تھا اور ٹھنکے والی لٹوں کے بل سیدھے ہونے لگے تھے۔

جمل ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی اس کے باوجود ٹوکے اس بھیاںک روپ کا خدمت ادا شہید تھا کہ شہر میں تو اس نے بہت بار دی اور اعصاب جواب دے گئے، لیکن اب وہ کسی حد تک سوجنے بگھنے کے قابل ہوئی تھی۔ ٹوکے سارے بدلے کو وہ بعد میں چمکے گی، ابھی اسے اس اکھڑ اور سرد مراے ایس بی پی کی قید سے نکالنا تھا۔

اس نے ابھر اور دیکھا، کچھ خاص نظر نہ آیا تو پھر وارڈ روپ کھلا۔ اندر مردانہ کپڑے لگے ہوئے تھے۔ اس نے کچھ دیگر ڈانٹ پلٹ کیے اور سوچ کر ایک کرنا شلوار نکالا۔ برائون کرنا اور سفید شلوار۔ سب سے پہلے اس نے ساڑھی کے بوجھ سے نجات حاصل کی، پھر اس کمرے شلوار کو پین کر بال سیدھے کر کے جینز میں باندھے اور ہاتھ روم میں جا کر منہ اچھی طرح دھویا۔ باہر نکلنے کے لیے کسی مردانہ کو تلاش کی اس کی نگاہوں کو ہاتھ روم کی کوئی کھڑکی دروازہ نظر نہ آیا تو باہر ہی سی پینے ہی لگی تھی کہ ایک دم چو لگی۔

ایک دیوار میں شیفت تھا۔ اس میں سیمپو اور شیو کا سلمان رکھا تھا۔ شیفت کا اندر سے رنگ سہلی دیوار سے زیادہ چمکا سفید تھا۔ بھلا کیوں؟

وہ قریب آئی، سارا سامان نیچے اتارا اور پھر بغور اندر دیکھتے ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ اس خانے کے پیچھے دیوار میں بلکہ کارڈ بورڈ کے سفید پتے تھے جو میٹوں سے جڑے تھے۔ یہیں بھی اور تانہ لگ رہی تھیں۔

آگے کا کام بہت آسان تھا۔ اس نے سارے عمل کھول دیے، تاکہ آواز باہر نہ جائے اور تھوڑی سی محنت کے بعد پتے کھینچ کر ادا لے لیے۔ وہ جلدی میں لگائے لگ رہے تھے، سوائے زیادہ نور نہیں لگتا پڑا تھا۔

ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ اچھا، خاصی چڑی تھی۔

وہ اس میں سے با آسانی گزر سکتی تھی سب سے حد منظم سی ہو کر حمل نے کوئی کھولی اور جب باہر نکلا تو ایک لمحے کو دوسرے ایک کھڑکی سے دو فٹ کے فاصلے پر دیوار تھی۔ گھر کی چار دیواری کھڑکی اور چار دیواری کے درمیان صرف خلا تھا اور نیچے بہت نیچے کا فرش تھا۔ اس گھر کی چھت تیسری منزل پر موجود تھی۔ شاید اسی لیے انہوں نے کچے کے پتے لگا دیے تھے، اندازہ ہوگا کہ وہ سال سے نہیں چل سکتی۔

اس کا دل ڈوب کر ابھر گیا یہ آخری راستہ بھی بند ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ باؤس کی طرف بند کر کے کھڑکی بند کرنے ہی لگی تھی کہ سٹائپ میں ابھی سی آواز سنائی دی تھی۔

"آپ صحن میں کیا کر رہی ہیں؟"

"یہاں، وہ مریم مصباح نے کہا تھا کہ اولی مارنگ منہ پر لگاس رکھ کر پینکشن کرنا تو آواز اچھی نکلتی ہے وہی کر رہی تھی۔"

لڑکیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بہت قریب تھیں تو بہت دور بھی تھیں۔ وہ چوٹی اور پھر ہاتھ روم کی لاسٹ بند کی۔

باہر کا منظر قدرے واضح ہوا۔ کھڑکی سے دیوار کا فاصلہ دو فٹ کا تھا، مگر وہ دیواری کی منڈیر تھی اور وہ آوازیں کہیں نیچے سے نہیں تھیں۔ آ رہی تھیں۔ بالکل برابر سے تھی اس ہاتھ روم کے برابر سٹائپ کا صحن تھا۔

اگر وہ یہ دیوار چاند جائے تو؟

اس اچھوتے خیال نے ذہن میں سر اٹھایا تو اس نے سوائے اندر سے اور نیچے جھانکا، اگر کوئی تو نہیں ہے گی مگر موت اس ذات سے تو بہتر ہوگی جو صحن یا اس سے بھی بدتر گھر چھپنے پر اسے اٹھاتی پڑی گی۔

اس نے دونوں ہاتھ جو کھٹ پ رکھے ہی تھے کہ کمرے کا دروازہ کسی نے زور زور سے کھٹکایا۔ دروازے کی اندر سے کندی لگا چکی تھی۔ وہ کھول

نہا پارے تھے یقیناً "کسی نے مجھے کھاؤ لے ڈی آواز سن لی تھی۔ وہ لمحے بھر کو بھی نہ گھبرائی اور ہاتھ پر سنا کر دیوار کو ٹوکا۔ وہ قریب سی تھی۔

"الہم۔۔۔ انمول۔۔۔ برابر والے صحن میں وہ کھکاری تھی، اگلے اور لمحے اس کی مدھر مگر بلی آواز اندھیری فضا میں گونجنے لگی۔

"الہم جمل فی قلبی نور۔۔۔" اسے اللہ امیر سے دل میں نور ڈال دے۔

حمل نے دیوار پر دونوں ہاتھ رکھے اور نیچے دیکھے بغیر ابھی بھی لوہر دکھا۔

"وہی بھری نور" وہی سمی نور۔۔۔ (اور میری بھارت سے دعا ہے صحن میں نور ہو۔)

گھوڑے کی پیچھے سواری طرح سے وہ دیوار پر بیٹھی اور نیچے دیکھا۔ صحن کی فضا بہت قریب تھی۔ دیوار چھوٹی سی تھی۔

"صحن میں نور" وہ صحن بھاری نور۔۔۔ (اور میرے دائیں اور بائیں جانب نور ہو)

اس نے آہستہ سے دونوں پاؤں زمین پر رکھے۔ وہ باقی خیر برداروں کی محنت پر اتار آئی تھی۔ لمحے بھر کو وہ بے یقینی سی پلٹ کر دیوار کو دیکھنے لگی جس کے پار اسے ٹیس لی جھانکوں والو کا گھر تھا۔ بلکہ قید خانہ جس سے وہ کس قلع تھی۔ اسی بل دیوار کے پار سے وہ کبھی سی آواز۔۔۔ جھکی۔ یقیناً "کسی نے ہاتھ روم کی لاسٹ چابی اپنی ہے وقتی۔" اسے غصہ آیا۔ اسے ہاتھ روم کا دروازہ بند کر کے قلع کھول کر آنا چاہیے تھا مگر خالی آواز ہی تو تھی یا پھر اس لڑکی کی آواز کے لبوں میں کسی صوبی تھی کہ ہوش نہ رہا تھا۔

"وہی نور" وہی نور۔۔۔ (اور میرے لوہر اور نیچے نور ہو۔)

سوائے ایک برآمد تھا جس کے آگے کمر لگی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور دروازے سے کافی دور

ایک لڑکی زمین پر بیٹھی کمرے سے نیک لگائے۔ آنکھیں بند کیے غصہ پر لگاس رہے تھیں۔ "وہاں ہی نور" وہی نور۔۔۔ (اور میرے آگے پیچھے نور ہو۔)

وہ دیوار کے ساتھ ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھی کمرے تک آئی۔ وہ لڑکی دنیا و مائے اس سے بے خبر اپنی سنا جلت میں غم تھی۔

"راجہ جمل فی قلبی نور۔۔۔" (اور میرے لیے نور بنادے۔)

حمل چاب پیدائے بغیر کچے دیوار سے اندر رینگ گئی۔ لڑکی اسی طرح کمرے کی تھی۔

"وہی بھری نور" وہی نور۔۔۔ (اور میری زبان و اعصاب میں نور ہو۔)

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر اوپر کھٹک لیا۔ سارے گھر خالی تھا۔ بس دو در ایک فریق پر تھا اور اس کے ساتھ جانی دار الماری تھی۔ اندر جڑے میں مدھم چمکتی کے باعث اسے انتہائی نظر آیا تھا۔ وہ بہت آہستہ سے اٹھی اور دسپانوں فریق کی طرف بڑھی۔

"وہ صحن نور" وہی نور۔۔۔ (اور میرے گوشت اور لبوں میں نور ہو۔)

فریق اور الماری کے درمیان چھپنے کی جگہ تھی وہ جھٹ ان کے درمیان آ جھکی مگر سوائے ہی دروازہ تھا۔ وہ لڑکی وہاں آئی تو سیدھی اس پر نگہ پڑی۔ یہیں گھر سے پہلے چھپنے کی بجائے نیچے جلتا جا رہے۔

"وہ شہری نور" وہی نور۔۔۔ (اور میرے بال اور کھال میں نور ہو۔)

اندر جانے والا دروازہ بند تھا۔ اگر اسے کھولتی تو آواز باہر جاتی۔ وہ پریشان سی کھڑی ہوئی۔ تب ہی جانی دار الماری کے پینٹل سے کچھ نکلا نظر آیا۔ اس نے جھپٹ کر وہ انداز سیاہ چارٹ کا لباس۔

اس نے چاند کی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چال۔

"راجہ جمل فی قلبی نور۔۔۔" (اور میرے نفس میں نور ہو۔)



باہر وہ ہے خبری ابھی تک عارضہ رہی تھی۔  
اس نے کہا کھولا۔ وہ سیاہ عیال تھا اور ساتھ ایک  
گرسے اس کا رُف۔ محل نے کچھ نہیں سوجا اور عیال  
سنے لگی۔ ابھی اسے احساس ہوا کہ وہ مرنے لگا تھا۔  
فلواری میں کھڑی ہے اور ننگے پاؤں ہے۔ وہ عیال بھی  
اسے قیمت لگا تھا۔

”وا عظمیٰ نوراً“ (اور میری ہڈیوں میں نور ہو۔)  
اس کا رُف کو اس نے بیشکل پہرے کے گرد لپیٹا۔  
ملوث نہ تھی تو مشکل لگ رہا تھا اب اسے کسی طرح  
بچے جا کر سڑک تک پہنچانا تھا۔ آگے اپنے گھر کا راستہ تو  
آنکھیں بند کر کے بھی آتا تھا۔

”اللہم اعطنی نوراً“ (اے اللہ مجھے نور عطا کر۔)  
وہ اسی نرم میں بڑھ رہی تھی۔ محل خیزی سے  
عیالے کے ہن بڑھ کر کے سکارف پہ ہاتھ پھیر کر  
درست کر رہی تھی کہ ایک دم اسے بہت خاموشی  
لگی۔

باہر جن بہت چپ سا ہو گیا تھا۔ شاید اس لڑکی کی  
دعا ختم ہو گئی تھی۔

اس نے قدم گھبراہٹ قدم بے جا دیاڑی میں  
خیزی سے وہ دوا نہ کھولنا چاہا۔ اسی بل اس لڑکی نے پیچھے  
گھر کی جو کھٹ قدم رکھا۔

”السلام علیکم۔۔۔ کن؟“ چوکی ہی آواز اس کے  
عقب میں ابھری تو اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔  
دوا زے پہ ہاتھ رکھے رکھے وہ گہری سانس لے کر  
پلی۔

وہ سامنے شلوار قمیص میں ملبوس، سر پہ وہ پتہ لپٹے  
ہاتھ میں کتاب پکڑے ابھی نگاہوں سے اسے دیکھ  
رہی تھی۔

محل کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ رگے ہاتھوں پکڑی  
تھی تھی نہ اب کیا ہو گا؟

”وہ میں آپ کی آواز سن کر آئی تھی بہت اچھی  
تلاوت کرتی ہیں آپ۔“

”تلاوت تمہیں۔۔۔ وہ دھائے نور تھی۔ میری آواز  
بچے تک آ رہی تھی کیا؟“ لڑکی کا انداز سدا مگر محنت  
تھا۔ محل کا دماغ خیزی سے کچھ کر رہا تھا۔ اسے کسی  
طرح اس لڑکی کو پاؤں میں الجھا کر وہیں سے نکالنا تھا۔  
ایک دفعہ وہ سڑک تک پہنچ جائے تو آگے گھر کے تمام  
راستے آتے تھے۔

”خوب صورت آواز ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ میں  
تلاوت سمجھ کر آئی تھی۔ معلوم نہ تھا کہ آپ دعا مانگ  
رہی ہیں۔“

”دعا مانگ نہیں۔ یاد کر رہی تھی۔ آپ نے بتایا  
نہیں۔ آپ کا نام؟“

”شائستگی سے کہتی وہ لڑکی وہ قدم آگے آئی تو گھر  
سے چھن کر آئی چاندنی میں اس کا چہرہ واضح ہوا۔

پچھلی سپرد رنگت بے حد گہلی ہونٹ اور بڑی  
آنکھیں جن کی رنگت سنہرے پھر لال کی سی تھی۔  
گولڈن کرسل پہ پیلا لفظ محل کے ذہن میں آیا تھا۔  
اور اسے دیکھتے ہی وہ لمحے بھر کو چوکی تھی۔ بہت شدت  
سے محل کو احساس ہوا تھا کہ اس نے اس لڑکی کو پہلے  
کبھی دیکھ رکھا ہے۔ نہیں بہت قریب۔ ابھی کچھ وقت  
پہلے اس کے نقش میں یہ وہ عورتی سنہری آنکھیں  
تھیں جو شام تھیں۔

”میں محل ہوں۔“ جانے کیسے لہوں سے پھسل پڑا۔  
”مجھے دراصل راستے نہیں معلوم تو پھٹک جاتی ہوں۔“

”اوہ آپ ہاشل میں بنی آئی ہیں؟“ کہہ کر چلی۔  
اور اسے امید کا لکیر ہر نظر آیا۔ وہ شاید کوئی گرو  
ہاشل تھا۔

”جی میں شام میں ہی آئی ہوں۔ تیرا گرو ابراہیم الگوچی  
ہوں مگر مجھے جانے کا راستہ نہیں مل رہا۔“

”مجھے آپ کے روبرو تیرا ذکر۔۔۔ جی میں مانا ہے  
۔۔۔ اوہ آپ تجھے بڑھنے کے لیے انھیں ہوں گی یقیناً۔“  
”وہ خود ہی کہہ کر مطمئن ہو گئی۔“ میں بھی اچھے

کے لیے نیچے Prayer Hall میں جا رہی ہوں۔  
تپ میرے ساتھ آجائیں۔“

اس لڑکی نے آگے بڑھ کر دوا نہ کھولا۔ پھر گرائی  
موز کر اسے دیکھا۔

”میں فرشتے ہوں۔ آجائیں۔“ وہ دوا نہ کھیل کر  
آگے بڑھ گئی تو محل بھی متذبذب کیلے پیچھے ہوئی۔

سامنے سنگ مرمر کی طویل راہداری تھی۔ دائیں  
طرف اونچی کڑھکیں تھیں جن سے چھن کر آئی چاندنی  
سے راہداری کا سفید مرمر میں فرش چمک اٹھا تھا۔

فرشتے راہداری میں آگے تیز چلتی جا رہی تھی۔  
”وہ ننگے پاؤں اس کے تعاقب میں چلنے لگی۔

مروان کھلے پائے اس کے پاؤں میں آ رہے تھے، مگر  
اوپر عیال نے ڈھانپ رکھا تھا۔

راہداری کے اختتام پر بیڑھیاں تھیں۔ سفید چمکتے  
سنگ مرمر کی بیڑھیاں جو گولائی میں بیٹے باقی تھیں۔

اس کے عقب میں ڈیسے پیڑھے۔ رات کے اس پیڑ  
ذیلوں کا سنگ مرمر بے حد ہموں تھا۔ من گھڑا۔ وہ  
محسوس کیے بغیر تیز تیز بیڑھیاں اترنے لگی۔

تین منزلوں کے ذریعے ختم ہوئے تو سامنے ایک  
کشادہ برآمدہ تھا۔ برآمدے کے آگے بڑے

سفید ستون تھے اور سامنے لان نظر آتا تھا۔ بالکی چاندنی  
میں برآمدہ ہم تاریک سالک رہا تھا۔

ایک کونے میں چوڑی بے حد چوڑی بیڑھیاں  
بیچے جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ فرشتے ان بیڑھوں

کی طرف بڑی توجہ بھر کر دانت خوف آیا۔ وہ بے  
حد چوڑی بیڑھیاں خاصی پیچھے تک جا رہی تھیں۔

بدھ چاندنی میں چند زینے ہی رکھے تھے۔ آگے سب  
تاریکی میں گم تھا۔ جانے کیا تھا ہے؟

فرشتے کے پیچھے وہ سچ سج نیم تاریک زینے اترنے  
لگی۔ بہت پیچھے جا کر فرش قدموں سے آیا تو محسوس

ہوا کہ یہ نرم سا قہقہاں تھا جس میں اس کے پاؤں  
اچھل گئے تھے۔ وہ ایک بے حد طویل وعرض کمرے

میں کھڑی تھی۔ وہ کمرے میں عکس ہو رہا تھا۔ کچھ

پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ اوپر اوپر گردن گھمائی اندر سے اس  
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

فرشتے نے یو او پہ ہاتھ مارا۔ ہن دہانے کی آواز آئی  
اور اس نے ہی اسے جیسے پورا آسمان روشن ہو گیا۔ محل

نے گھبرا کر اوپر اوپر دیکھا۔

وہ ایک بہت بڑا سا بالی تھا۔ چھت گہرے فائوس اور  
اسیٹ لائٹس جھمکا اٹھی تھیں۔ بال چھ اوپے

ستونوں پہ کھڑا تھا۔ بے حد سفید ستون سفید دیواریں  
روشنیوں سے جھلکی لگتی چھت اور دیواروں میں

اونچی فائوس دندوز۔

”وضو کی جگہ وہ سامنے ہے۔“ فرشتے نے اپنے  
دیسے کو پین لگاتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا تو وہ جیسے

جو کی پیچھے ہٹا کر اس طرف بڑھ گئی۔

وضو کی جگہ نیم تاریک تھی۔ سنگ مرمر کی چوکیاں  
اور سامنے تو بیڑوں کا ایک ایک ٹاکی چمک رہا تھا۔ وہ ہر

ٹاکی کو ستائش سے دیکھتی ایک چوکی پہ بیٹھی اور جھک  
کر دیکھتی تھیں۔

فواد اور وہ اسے ایس بی۔ محل ابراہیم کو سب  
فراموش ہو چکا تھا۔

”سنو“ کھلے دوا زے سے فرشتے نے جھٹکا۔  
”بسم اللہ پڑھ کر وضو کر۔“

محل نے بوٹھی سر ہلا دیا اور پھر اپنے گلے ہاتھوں کو  
دکھایا جن۔ بوٹھی سے پانی نکل کر پھسل رہا تھا۔ وہ سر

جھٹک کر وضو کرنے لگی۔

فرشتے جیسے اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔  
محل اس کے برابر نماز کے لیے کھڑی ہو گئی شاید

تہجد پڑھتی تھی اس نے ہاتھ اٹھائے تو رات بھر کے  
تھکام و ناظرانہن میں ناز ہو گئے۔ روکی ایک تیز لہریں  
میں اٹھی تھی۔







بے رخی تھی۔  
 لی ذی لائق یا ملاوت ہوئی تو وہ چیل بدل دیا  
 کرتی تھی۔ یہ آواز کانوں پر بوجھ لگتی تھی۔ سپارے  
 پر دھناتھا ٹھن لگتا تھا اور جھرتو سوائے پیر کے اس  
 نے بھی نہ پڑھی تھی۔ اب وہی خبر ہانے کے لیے وہ  
 فرشتے کے برابر کھڑی ہو گئی۔  
 "میرے اللہ تعالیٰ مجھے گھروالیں بچا دے۔" وہ  
 پھر سے رو دینے کو تھی۔ "مجھے تیری قسم میں پھر بھی  
 فدا بخائی کے ساتھ بھی تھا۔ کسی ان کو اکیلے نہیں  
 ملوں گی۔ میں قسم کھاتی ہوں۔ آئی سوئے۔"  
 دنا بانگ کر دندے پر سکون ہوئی تو چہرے پہ ہاتھ  
 پھیر کر اٹھی۔  
 "ایک بات پوچھوں فرشتے؟" وہ دونوں ساتھ  
 ساتھ بال کی میز میاں چڑھ رہی تھیں۔  
 "ہر چہ؟"  
 "قسم کھانے سے اللہ مان جاتا ہے؟"  
 "قسم ناپسندیدہ چیز ہے یہ مقدم نہیں بدلتی۔ جو ہونا  
 ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔"  
 "اور اگر قسم خالی جائے تو؟"  
 "تو مرتے وقت تک اس کو بھانپنا ہوتا ہے۔" آخری  
 پڑھی جڑتے فرشتے ذرا سی چوکی۔ "کوئی اپنی سیدھی  
 قسم مت کھانا کہ یہاں سے ربانی ملے پہ تم فلاں کور  
 فلاں کام کرو گی۔"  
 "ربانی؟" برآمدے کی چو کھٹ پار کرتے محل  
 گزرا تھی۔ دل زور سے دھڑکا۔  
 "ہاں تمہیں گھر جانا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ آتی  
 ہوں۔" وہ ساکت سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔  
 "تو کب کیوں نہیں آؤ گی؟"  
 "آپ کو کسی پر چلا؟"  
 "ہاں یہ ہے محل کہ اول تو تہجد کے وقت یہاں  
 کوئی عبا یا پن کر نہیں گھومتا دوم یہ کہ تم نے میرا  
 عبا اور اس کا رقبہ پن رکھا ہے اور سوم میں نے  
 تمہیں صحن چلا گئے تھے لیا تھا۔"  
 محل نے بوکھا کر اپنے جسم پر موجود عبا کو دکھا

جس سے لمبی مروانہ شلوار کے پانچے ڈنڈے اور اسے جھانک  
 رہے تھے۔  
 "دراصل۔"  
 "ہاویوں کے ہاتھ دوم کی کھڑکی ہمارے جھنڈے کھلتی  
 ہے۔ اس نے تمہیں ہاتھ دوم میں بند کر دیا تھا؟ میں  
 اس سے بات کر دوں گی اسے ایسے نہیں کرنا چاہیے  
 تھا۔ تھوڑا سا فنک مزاج ہے مگر دل کا برا نہیں ہے۔ آؤ  
 ۔ پھر اس کی شاید شکل دیکھ کر وضاحت کی۔" ہاویوں  
 میز فرسٹ گزرتی ہے وہرا آوی نہیں ہے۔ آؤ۔"  
 اسی بل گیت کی سے زور سے بجا یا۔ ساتھ ہی شکل  
 بھی دی۔ فرشتے نے کمری سانس لی۔ "کوئی۔" اور  
 اس کا ہاتھ پکڑ کر گیت تک لائی "پھر ہاتھ چھو ڈکڑو واہ  
 کھولا۔  
 "فرشتے اور چہ۔"  
 "السلام علیکم اور یہ کیا غلط حرکت ہے؟ تمہیں  
 مسئلہ اس کے گزرنے کے ساتھ ہے تو اس کو ہاتھ دوم  
 میں کیوں نہ کیا تھا؟"  
 "بالکل ٹھیک کیا تھا ہے کہ چہ وہ؟" وہ جواباً بگڑ کر  
 بولا تھا۔  
 محل سہم کر قدرے اونٹ میں ہو گئی۔ یہ تو وہی  
 تھا۔ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی۔  
 "وہ میرے ساتھ ہے مگر تمہیں اس سے عزت  
 سے پیش آنا چاہیے تھا۔" فرشتے کے لیے میں بنی بلی  
 تھی تھی۔  
 "جو بھی ہے تم اسے۔"  
 "نہیں ہاویوں! تم اس کو خرم کی طرح ٹٹ مت  
 کرو۔ اس کا کیا قصور ہے؟ وہ تو اپنے بھائیوں جیسے گزرنے  
 پہ فرسٹ کر کے مصیبت میں مبتلا آئی تھی۔"  
 وہ حق دتی سے جا رہی تھی۔ ابھی تو فرشتے کو  
 بالواسطہ سب کچھ سنا آئی تھی اور سب فرشتے غلام کو  
 خرم کہہ رہی تھی اور اب ہاویوں کے سامنے اس کی  
 ٹاؤٹیوں پہ کیسے بر دال گئی تھی۔  
 "اس کا قصور یہ ہے کہ وہ غلام خرم کی گزرنے سے  
 اسے مل کر کہہ۔" اب کہ ہاویوں کو ادھر کا بچہ مروانہ

تھا۔ فرشتے اسے راستہ دینے کے لیے چو کھٹ پار کر  
 کے باہر چلی گئی تو وہ حرکتے دل سے گیت کی اونٹ سے  
 نکل۔  
 سامنے ہی وہ کھڑا تھا۔ یونیفارم میں لمبوس مکمل  
 طور پر تیار "کھڑے ہو اور ہاتھ میل لے۔"  
 "جب میں نے کلاس کی تھی کہ وہاں رہو تو تم نے  
 باہر قدم کیوں نکالا؟"  
 "تو کہ نہیں ہوں میں آپ کی جو آپ کا حکم ہوں۔  
 آپ ہیں کون مجھے حکم دیتے والے ہیں؟" وہ بھی  
 جواباً غرلی تھی۔  
 "ہاں؟ تم۔"  
 "نہیں منہل کہات کریں اسے اس نے صاحب!  
 میں مسجد کھڑی ہوں اور آپ آپ کا مجھ پہ کوئی زور  
 نہیں ہے۔" اس نے گیت کا نذرہ مضبوطی سے پکڑ  
 رکھا تھا۔  
 "تم۔" وہ کچھ سخت کہتے کہتے ضبط کر گیا پھر  
 فرشتے کی طرف پلٹا جو خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی۔  
 "اس سے کہو کہ میرے ساتھ آئے۔ میں اس کا  
 دشمن نہیں ہوں۔"  
 فرشتے نے خاموشی سے ہاویوں کی بات سنی اور جب  
 وہ چپ ہو تو وہ محل کی طرف مڑی۔  
 "اس کے ساتھ چلی جاؤ یہ تمہارا دشمن نہیں  
 ہے۔"  
 "مجھے ان بدلتی برابر محسوس نہیں ہے۔"  
 "ہو نا بھی نہیں چاہیے کہ تمہارے بھانجے جانے  
 اور پولیس سویا مل میں جانے میں فرق ہو گا۔ آگے تم  
 اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔"  
 بات کچھ ایسی تھی کہ وہ خاموش سی ہو گئی۔  
 "ٹھیک ہے آئیں۔" اس نے باہر قدم رکھے پھر  
 بات کر فرشتے کو دکھا جو گیت کے ساتھ سینے پہ ہاتھ  
 دھکے کھڑی تھی۔  
 اس کی پشت پہ وہ عالی شان تین مندرجہ عمارت تھی  
 جس کے اوپے سفید ستون بہت وقار سے کھڑے

تھے جسے کوئی بلند ولا سفید محل ہو اس کا گنبد نہ تھا  
 مگر فرشتے اسے مسجد کہہ رہی تھی۔  
 اس سے منہل بگڑ اپنی خوب صورت آرائش  
 کے ساتھ وہیں موجود تھا جہاں اس نے رات میں کھانا  
 کھا۔  
 "تھینکس۔" وہ کہہ کر رہی نہیں۔  
 ہاویوں سامنے کھڑی پولیس سویا مل کی ڈرائیونگ  
 سیٹ منہل کھا تھا۔ وہ اچھلے سے چلتی ہوئی کئی اور  
 فرشتہ زور محول کر نشست سنبھال۔  
 "آپ مجھے میرے گھر لے کر جا رہے ہیں؟"  
 "نہیں۔" سرو سے انداز میں کہہ کر وہ گاڑی سڑک  
 پہ ڈال چکا تھا۔  
 "پھر؟ پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"  
 "تھا۔!"  
 "مگر مجھے گھر۔"  
 "اپنی اچھے بحث پسند میں ہے خاموش رہو۔"  
 اس کو بھڑک کر ہاویوں نے امید اور پھکاری۔  
 وہ ہم آگھوں سے سامنے سڑک کو دیکھنے لگی۔  
 چلے اس کی قسمت اس کو اب اور کیا لیا دکھانے والی  
 تھی۔

آج تھا ابراہیم کی عالی شان محل نما کو بھی کے لان  
 میں صبح سے ہی سب جمع تھے۔  
 آقا کریم چہرے پہ ڈھیلوں عیش و غضب لیے  
 رحمت انداز میں کرسی پہ براہمن تھے۔ کتاب بانی  
 نقد اور ناصحہ جتنی قریب ہی کرسیوں پہ بیٹھی معنی  
 خیزی سے وہ ہم سرگوں میں کر رہی تھیں۔ غفران بچا  
 اور اسید چاچی اس ہی پریشان سے بیٹھے تھے۔  
 برآمدے کے عتھر فزینے پہ آرزو جیسی تھی۔ گھنٹوں  
 پہلیٹ رکھے وہ اپنی اہلی بے نیازی سے توس پہ جہم لگا  
 رہی تھی۔  
 اس کے پیچھے برآمدے میں بھی کرسیوں پہ باقی  
 لڑکیں بیٹھی کمر پھر کر رہی تھیں۔



حسن بھڑپ ساگھان پہ نکل رہا تھا۔ بار بار اپنے سیکل فون پر کوئی نمبر نہیں کرنا دیکھتا تھا۔ وہ سیم اپنے کمرے میں تھا اور۔

فواد آغا جان کے برابر کرسی والے اخبار پھیلائے سرسری سامنا کر رہا تھا۔ گاہے گاہے نگاہ اٹھا کر سب کے چہروں کے تاثرات دیکھ لیتا۔ اس کے انداز میں اطمینان و سرشاری تھی۔

پس ایک مسرت سمجھیں جو چکن میں کرسی پر بیٹھی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔ ان کی ساری زندگی کی ریاضت و لڑائی تھی۔ محفل کل ان کی ہی جانے کا کہہ کر یا ہر نکل تھی اور جب شام تک اس کی وہ بھی نہ ہوئی تو ان کا دل بٹھنے لگا تھا۔ سکتے تھے پڑھ ڈالے، لکھی دعائیں کر لیں مگر وہ نہیں نہ تھیں۔

ہات پھینچنے والی کہاں تھی بھلا؟ جب کو خبر ہوئی تھی۔ آغا جان تو مر رہا تھیں، غضب بن گئے تھے جانے کی بات کی تو فواد نے ہی انہیں سمجھایا کہ گھر کی عزت داؤ پر لگانے کا فائدہ کچھ ڈیور مزید انتظار کر لیتے ہیں۔

حسن اور اس کے چچا ساری رات اسے ہسپتالوں، مرنو خانوں اور مرگولوں پر گھومتے رہے تھے مگر جب تین بجے کے قریب وہ کام لوٹے تو گھر میں گویا صاف ماتم چھ لگی۔

عورتوں کی معنی خیز نگاہیں، مردوں کے ملامت بھرے فقرے مسرت کو اپنی روح میں گڑنے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ وہ اسی وقت سے روئے چلی جا رہی تھیں۔ کوئی صفائی، کوئی دلیلی نہیں، بس آنکھ میں آنسو اور لبوں پر وہ ایک ہی دعا کہ محفل کی لاش کسی ہسپتال، کسی شرفائے مل جائے مگر وہ نہ ہو جو ان کی ساری ریاضت ضائع کر دے۔

”جاگ جی کسی کے ساتھ گھرے میں تو پہلے ہی سستی تھی۔“ صبح کا سورج طلوع ہونے لگا تھا جب باقی مشاب کی آواز چکن میں سنائی دی۔

”فک تو مجھے بھی کی ہے“ ٹانگہ چینی نے بلند سی سرکشی کی۔ وہ سب رات سے جاگ رہی تھیں۔

البتہ حسن کے علاوہ دوسرے لڑکے یا بھوپوریند

لے کر ابھی بیدار ہوئے تھے۔

”پس آغا جان ایک دم دھماکے طعنے دیکھ کر چکن میں روٹی مسرت کے دل کر بیچ چڑھا تھا۔

سب نے چونک کر آغا جان کو دیکھا جن کا سرخ و سفید چہرہ غصے سے تھم رہا تھا۔

”اب اگر وہ زندہ اس دانیہ والیں تکی تو میں اسے نہیں دفن کروں گا۔ سن یا سب نے۔“

”ارے ایسی باتوں کا تو پیدا ہوتے ہی گنا گھونٹ دیا چاہیے۔ ابراہیم اس کو بھی ساتھ لے کر مرنا۔ ہماری عزت داؤ پر ڈال کر لے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ تو یہ تو بہ۔“

”غور کسی کے ساتھ پھر تھا۔ قرن اٹھ کر چھت پہ جاتی تھی تو یہ استغفار، تاکہ ہم اس پر شک نہ کریں۔ اسی لیے تو میں نے اس دن کہا تھا مگر کوئی سننے تو نہ تھی۔“

مشاب کو ان کا عہد یاد آیا تھا۔

”تم مرنا تو محفل خدرا مرنا دیکھو ایس نہ آؤ۔“ ان کے دل و دے سے چلا تھا۔

”آج کے بعد اس کا نام کوئی اس گھر میں نہیں لے گا اور اگر۔“ آغا جان کی بات اوجھڑی رہ گئی۔

کسی نے دادر سے گیت پڑھنا دیکھا ہی تھی۔

سب نے چونک کر گیت کو دیکھا۔ یہاں تک کہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی کوس کھائی آرزو نے بھی سر اٹھایا تھا۔

مسرت و حزن کے دل کے ساتھ کھڑکی میں تن کھڑی ہوئیں۔ صبح کے سلت بچے پہلے تو بھی اس طرح دھکندہ ہوتی تھی۔

”حسن اور دوا کو کھلو۔“ اسد بچانے کہنا تو حسن نے آگے بڑھ کر گیت کے بھونے دوا کے کے پیش کا بک کھولا اور پیچھے ہوا۔

دوا نے کھٹا چلا گیا۔ ایک سر میں پید ہاتھ دوا کے پیر دھرا اور پھر کھٹ پ اندر آتے پید تھے پاؤں دکھائی دیے۔

آغا جان بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی

سب بھی ساتھ ہی اٹھے سب کی نظریں گیت پہ جی تھیں چہل چھوٹے دوا کے کو کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔

سیاہ پاؤں تک آتا علیا اور چہرے کے گرد سختی لپٹا سرخی اسراف، ننگے پاؤں، سر جھکائے، محفل ابراہیم نے اندر قدم رکھا۔

”حسن اس سے کوریاں سے رخ ہو جائے ورنہ میں اس کا خون کروں گا۔“ آغا جان دادر سے دھاڑے تھے۔ ”ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے بے شرم لڑکی ورنہ۔“

”اب کے پاپ کا گھر ہے جو نکل جاؤں؟“

وہ جو گولن جھکائے اندر قدم رکھ رہی تھی ایک دم سر اٹھا کر اتنی سے خونی سے غرائی کہ کتے بھر کو سب بھونکا وہ گئے۔ مائی مشاب نے تو ششدر رہا وہ کمر نہ پتا تھا کہ کیا۔

حسن اٹھ کر محفل کو کھول کر رہا تھا فواد۔

فواد اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔

”اب پلٹ کر گیت کھول رہی تھی۔“

دوسرے ہی لمحے ان سے دو پولیس مہیا نکل آگے پیچھے ڈرائیو دے یہ اندر آئیں۔ کھانکھ دوا کے کتے اور سپاہی اتر کر تیزی سے اندر گھر پھیلنے چلے گئے۔

”دوسرے گھر کی تلاشی لو۔“ بلند حکیمہ کتاوہ ڈرائیو تک سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اترے۔ یونیفارم میں پولیس، چہرے پر ہم سی فائینڈ مشکر ایٹ لے کر کھائیں کھڑے ان پھر ہوئے لوگوں کے قریب آیا۔

وہ سب اندر آچکے اور غیر متوقع تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ مل سکا۔ فواد کوئی سب سے پہلے ہوش آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگی جا رہی تھی۔

”کیا کو اس ہے؟“ اس نے غرا کر ہاتھ پیچھے کرنے چاہے۔

”اس کو اس میں لکھا ہے کہ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری منسوخ ہو چکی ہے اور یہ کہ تمہیں فوری گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جائے۔“

”مسئلہ کیا ہے آفیسر؟ کیا کیا ہے میرے بیٹے؟“

”آغا صاحب! آپ کے بیٹے نے اپنی کزن۔“

”ہاں میں نے ایک نگہ محفل پر ڈالی جو گیت کے ساتھ بیٹھے ہاتھ باندھے کھڑی غرت بھری نظروں سے فواد کو دیکھ رہی تھی۔“ محفل ابراہیم کو اپنی ایک چھٹی ہوتی فائل نظر آنے کے عوض ایک رات کے لیے سچا اور ابھی ناشتہ کرتے ہوئے وہ غالباً اسی فائل کے پردہ ہوئے کا انتظار کر رہے تھے۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر میرا بیٹا۔“

”آپ کا بیٹا محفل علاقہ جلت کی لڑکیوں کے احوال اور خرید و فروخت میں ملوث ہے یہ آپ بھی جانتے ہیں اور ہم بھی۔ اس دفعہ انہوں نے چلائی کی اور اپنی کزن کا سودا کر کے اسے دھوکے سے متعلقہ پارٹی کے پاس بھیجا۔ البتہ آپ کی بیٹی پولیس کی حفاظت میں ہی رہی کیونکہ دوسرے پولیس کے پلان کے تحت تھا۔ آغا فواد نے گینگ کو منظر عام پر نہ لانے کے لیے چل تو اچھی چلی مگر حال کامیاب نہیں ہوئی۔“

”محفل کا اس سے ایس جی سے چکر تھا۔“ فواد خاموشی سے سن کر مسرت آرام سے بولنا میں نے انہیں رستے ہاتھوں پکڑا تھا اب اسے کڑوت پہ پرہ ڈالنے کے لیے مجھے پھنسا رہے ہیں تاکہ۔“

”خاموش ہو جائیں۔“ وہ بحث پڑی تھی ”ایک لفظ بھی آپ نے میرے متعلق کہا تو میں آپ کا منہ فوج لوں گی۔“ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا ”آپ کو انداز ہے؟“

”ارے یہ کیا چپ رہے میں بتاتی ہوں۔“ باقی مشاب جیسے ہوش میں آئی تھیں ”ایک دم بیٹھے ہاتھ بائو سنائے آئیں۔“ سارا فواد اسی لڑکی کا چایا ہوا ہے یہ میرے بیٹے کو پھنسا رہی ہے تاکہ اس کے اپنے کڑوت نہ کھلیں آغا صاحب۔“ انہوں نے تاکید طلب نظروں سے آغا جان کو دیکھا اور پھر اوپر گولن کھٹائی۔ سب خاموش کھڑے تھے۔ کسی نے ہل نہیں کی۔

”لو کی کا نام محفل ابراہیم ہے۔“ ہاں میں نے سوال کاٹن جا کر ان کے سامنے کیا اسپیکر سے آواز



کو بچنے لگی۔ فواد کی آواز۔ جو عداوت بچانی جاتی تھی۔  
 "تین تین" بچنے کی شام وہ آپ کے پاس ہو کر۔  
 معصوم "ان پھولی اور نو جوان ہے۔ آپ کی ڈیٹا پور  
 پوری اتنی ہے۔" اور ایک آہ۔

محمل کو اپنا چہرہ تھماتا ہوا غموس ہوا۔  
 ذرا سے دھڑکنے سے مختلف آوازیں گونجی تھیں۔  
 "فواد بھائی! یہ لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔"  
 "فواد بھائی! یہ لوگ میرے ساتھ کچھ غلط کر دیں  
 گے۔"

"جو اس بند کرو اور میری بات غور سے سنو۔  
 ہمیں وہ آئینہ رنگ چاہیے ہے نا؟ تو جیسے وہ کہیں  
 عمر کی جاؤ۔ بس ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ صبح  
 ہمیں ڈرائیو پر بیٹھنے آجائے گا۔"

دعاؤں سے من دیلا "اور مونا کل نیچے کیا۔ فواد نے  
 سر جھٹکا۔

"آؤ قانون کی عدالت میں قابل قبول نہیں ہوتا  
 اسے ایس بی صاحب۔"

"مگر کی عدالت میں تو ہوتا ہے۔"

اور وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ان سب کو سب سو گھٹیا  
 تھا۔ ہر شخص اپنی جگہ سناکتا متنازعہ کھڑا تھا۔

"کو کیوں گائیں ایک ایک کو کیوں گائے۔"

"کی کیوں تو ہمیں ایک لے عرصے تک خیل کی  
 دیواروں کو کھنڈ ہو گا۔"

"اسی دن کے لیے۔" حسن ایک دم تیزی سے

سامنے آیا۔ "اسی دن کے لیے کہتا تھا کہ اس سے دور  
 رہو! ساری دنیا جانتی ہے یہ کس فاش کا آؤ بی ہے۔"

لوگوں کا کاہنہ بڑھتا ہے "اسی لیے ہمیں منع کرنا  
 تھا۔"

"مجھے منع کر سکتے تھے اس کے ہاتھ نہیں توڑ سکتے  
 تھے؟ میری جگہ اپنی من ہوتی تو بھی کچھ نہ کرتے؟" وہ

جولہا "ایسے تین کر لیں کہ حسن کھڑا کا کھڑا گیا۔ محمل  
 بھی ایسے نہ بولی گئی۔

"محمل بس میں۔"

"مجھے آپ کی کوئی وضاحت نہیں چاہیے۔ آپ

سب ایک سے ہیں۔" اس نے منہ پھیرنا تھا جب  
 اس نے برآمدے کے ستون کے ساتھ ہڑ محمل کی  
 مسرت کو دیکھا جو جانے کب اور آگئی ہوئی تھیں۔  
 ان کے قریب برآمدے کی میز تھی یہ بیٹی آرزو بنا  
 بلک بھیکے مہوت ہی اس مشور اور وجہ سے اسے  
 ایس بی کو دیکھ رہی تھی۔ تو اس کا کھڑا اس کے ہاتھ میں  
 رہ گیا تھا۔

"آقا صاحب! انیس روکیں یہ میرے بیٹے کو  
 کہہ کر لے جا رہے ہیں۔" وہ فواد کو لے جانے لگے تو  
 نالی مستاب تھا ان کا ہاتھ جھوٹے روڑی تھیں۔  
 آقا جان چپ کھڑے تھے بلکہ غفران پچا آگے  
 بڑھے۔

"بھابھی بیگم! جو صلہ کریں ان شاء اللہ فواد شام  
 تک گھر پہ ہو گا۔" ان کی بات پہ ہاتھوں نے استہزائیہ  
 سر جھٹکا اور پلٹا۔

"ایک منٹ اسے ایس بی صاحب۔"

آقا جان ٹھہرے ہوئے انداز میں مخاطب ہوئے  
 جسے وہ چونک کر پلٹا۔

"یہ توئی رات باہر گزار آئی ہے ہم شرف توگ  
 ہیں اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آپ اسے بھی مجھے  
 ساتھ ہی لے جائیں۔"

محمل ساکت رہ گئی۔ اسے لگا وہ بھی اپنی جگہ سے  
 ہل نہیں سکے گی۔

"واقعی؟" ہاتھوں نے ابڑا اٹھائی۔

برآمدے کے ستون سے لگی مسرت کے آنسو پھر  
 سے اٹل پڑے۔

"جو آؤ! اس کے چاکر کہنے۔" مسکرایا۔

"ٹھیک ہے محمل بی بی! آقا نے مجھے آپ سلطان کواد  
 ہیں گو لای دیں اور فواد کریم کو ساری عمر خیل میں  
 سڑتے رہائیں۔ میں نے تو چاہا تھا گھر کی بات گھر میں  
 رہ جائے، لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کو ہم  
 ہو کہ فواد نے گھر کی بیٹی کا سوا کیا ہے تو ٹھیک ہے ہم  
 اس سلطان کواد کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ آپ اس بیٹی کو  
 سمجھا بچا کر راضی کر کے چپ کرائیں گے نہ ہی فواد

بھی باہر آئے گا۔ چلو محمل۔"  
 "ارے مجھ اسے ایس بی صاحب! محمل ہماری  
 بیٹی ہے بھائی صاحب! اس پر نئی ناراض ہیں ہمیں  
 نہیں ہے کہ یہ پولیس کی حفاظت میں رہی ہے عزت  
 سے کھرائی ہے۔" غفران پچا نے بوکھلا کر بات  
 سنبھالی۔

"نہ بھی ختم کریں پھر بھی محمل کو ہم نے مسجد  
 بجوایا تھا عورتوں کی مسجد ہے میری! اس اور بڑا خالی  
 ہے۔" اس نے آقا صاحب کو بغور دیکھتے ہوئے من پہ  
 زور دیا اور ایک سخت نظر ڈال پلٹ گیا۔

وہ ابھی تک ویسے ہی ساکت و ششدر کھڑی تھی  
 جیسے اسے آقا جان کے الفاظ کا ابھی تک یقین نہیں کیا  
 تھا۔

گازیاں گیٹ سے باہر نکل گئیں۔ غفران پچا  
 مونا کل پہ کوئی نمبر لائے لگ نالی مستاب زور زور سے  
 روٹے لگیں۔

"یہ سارا اسی منحوس کا یاد دہرا ہے۔ اسے گھر سے  
 نکال لے آقا صاحب! سخت نے میرے بچے کو مضایا  
 ہے نہ بچا ہے کے ساتھ کیوں نہیں مری؟"

وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھیں مگر حسن  
 درمیان میں آگیا۔

"کیا کر رہی ہیں آپ ناٹی لالہ؟" ان کے دونوں  
 ہاتھوں کو گرفت میں لیے اس نے بشکل امنیں باز رکھا  
 "بھلا ایک لڑکی کے کہنے پہ فواد کہیں جیسے اثر و رسوخ  
 والے شخص کے آدھنڈا ارشاد سن سکتے ہیں؟"

"یہ جھوٹ کئی ہے، میں اسے چان سے مار دوں  
 گی۔"

"محمل! اندر جاؤ۔" فہمہ چچی نے آہستہ سے  
 کہا تو وہ چوٹی اور پھر اندر کی طرف دوڑی۔

فہمہ اور فہمہ نے معنی خیز نگاہوں سے ایک  
 دوسرے کو دیکھا۔ آقا جان ڈرائیو سے کی طرف بڑھ  
 گئے۔ نالی لالہ ابھی تک حسن کے بازوؤں میں دوچھی  
 رہی تھیں۔

وہ بھاگتی ہوئی برآمدے کے سرے پہ رکی۔ ستون

سے لگی کھڑی مسرت نے منہ پھیر لیا اسے دھکا سا  
 لگا۔  
 "لالہ۔" اس کی آنکھوں میں مریض جیسے  
 لگیں۔  
 "اے محمل۔" آرزو نے اس کے کندھے پہ  
 ہاتھ رکھا تو وہ ذرا سا جھجکی۔

"یہ بیڑ سم آئیں کون تھا؟"

"یہ ہاتھوں تھا ہاتھوں داؤد۔"

"ہوں نا اس قسم کا گھر رہتا ہے؟"

"ہنرمیں میں سائے دیں چاہیے؟" وہ زور خند ہوئی تو

آرزو نے برا سامنے بٹایا۔ محمل اس کا ہاتھ جھٹک کر

ایک شکوہ کنال نکھلنے والی اندر بھاگتی گئی۔

"ہاتھوں داؤد۔" آرزو زور لب مسکرائی اور پھر  
 توں۔ کھلنے لگی۔

\*\*\*

گھر میں لگنے کی روز تک خاموشی بچانی رہی۔ بس  
 ایک حسن تھا جو ہر دم ہر ایک کے سامنے اس کا قطع  
 کرنا نظر آتا۔

"اگر محمل کی جگہ آرزو ہوتی تو بھی آپ کی نہیں  
 چچی؟" وہ فہمہ کی کسی بات پہ ٹھوکر کر دیا تو وہ جو سر

منہ لپٹے اندر پڑی تھی "جھگڑے سے ابھی اور تیزی سے  
 باہر آئی۔

"آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے ہر ایک کے  
 سامنے میری صفائی دینے کی۔" وہ لاؤنچ میں آکر ایک

دم چلا کر بولی تو سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔  
 "مگر محمل!"

"اگر ان لوگوں نے مجھے یونہی پورے خاندان میں  
 بے عزت کرنا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر عزت ایک دفعہ

چلی گئی تو میں کس عزت کو بچانے کے لیے کورٹ میں  
 چپ رہوں گی؟ میں بھی بھری عدالت میں سارے شہر

کو بتاؤں گی۔ سن لیں آپ سب۔"

ایسے پیچھے دھاڑ سے دواؤ بند کر کے اس نے پھر  
 سے خود کو کمرے میں قید کر لیا۔

\*\*\*



اندرو مسرت ہسٹری چادر درست کر رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر کھڑے بھر کو سراٹھایا۔ پھر واپس کام میں مصروف ہو گئیں۔

”آپ بھی مجھ سے ناراض ہیں املاں؟“ مسرت خاموشی سے کیجے۔ غلاف پر چھائی رہیں۔  
 ”املاں! اس کی آنکھوں کے گوشے جھپکنے لگے۔“  
 ”نیکے درست کر کے دروازے کی طرف بڑھیں۔“  
 ”میں نے کیا کیا ہے املاں؟“ وہ رو پڑی تھی۔  
 دروازے کی طرف بڑھتی مسرت نے گردن موڑی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا محفل!“ مسرت دونوں بعد وہ اس سے بولی تھیں۔  
 ”املاں!“ وہ ترپ کر کن کے قریب آئی۔ ”نواد بھائی نے مجھے فنکشن کا کہہ کر۔“

”مجھے پتہ ہے۔“  
 ”پتہ ہے مگر کیسے نہیں ہے؟“  
 ”بہ۔“

”پھر بات کیوں نہیں کرتیں مجھ سے؟“  
 ”میں برسوں ان کی خدمت کرتی رہی کہ شاید کبھی یہ ہمیں کچھ عزت دیں مگر میری بیٹی ان ہی کے بیٹے کو پڑوا کر اس کے خلاف کورٹ پھری میں گواہی دیتی پھر بس۔ پہلے زندگی کم مشکل تھی عمل جو تم نے مزید مشکل بنا دی ہے۔“ وہ جھکی جھکی سی پلٹ گئیں۔  
 وہ نرم آنکھوں سے انہیں جالتے ہوئے دیکھتی رہی۔  
 ایک غلط قدم اسے یہاں لا پہنچائے گا اس نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔



پھر کتنے ہی دن وہ عام کرتی رہی اس کے پاس روئے کو بہت کچھ تھا۔ پھر کئی دنوں بعد اسے اس عیالیا اسکراف اور موافقہ شلوار قمیض کا خیال آیا تو دونوں کو الگ الگ شاپرز میں ڈال کر فرشتے کو واپس کرنے لگی۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے ہاں وہاں کے منہ لٹنے کی فرشتے کو دے دیں وہی انکے پہنچا دے گی۔“

اس نے سوچا تھا۔  
 اس اسٹاپ کا شیخ اب ویران ہو گیا تھا۔ وہ سیاہ قام لڑکی مرکز کبھی واپس نہ آئی تھی۔ جلسے کن کبھی نہیں چلی گئی۔ وہ اکثر سوچتی رہ جاتی۔

پس سے اتر کر اس نے مرکز پہ کھڑے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ وہ دونوں عمارتیں ساتھ ساتھ تھیں۔ ہاں وہاں دانور کا بنگلہ سبز بیلوں سے ڈھکا تھا اور ساتھ موجود اونچے ستونوں والی سفید عمارت کوئی انشٹی ٹیوٹ تھا شاید۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس فضول انسان کا دروازہ کھٹکھٹانے کی۔“ میں مسجد میں ہی چلی جاتی ہوں۔“ وہ مسجد کے سیاہ گیت کے سامنے آئی۔ گیت کا سیاہ لہا چمک رہا تھا اسے اس جھپٹے لوہے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔

بلو جینز کے اوپر قمیضوں تک آتا کرتا گردن سے لپٹا دھپلے ”کوئی بھوری بولی تلخ ہنسنے لگتے پل والے وہ اپنے مخصوص جگہ میں گئی۔

گیت کے اس طرف ایک بورڈ لگا تھا جس کو وہ پہلے نہ دیکھ سکی تھی۔ اس پر واضح لکھا تھا۔

”No men Allowed“ (مردوں کا داخلہ ممنوع ہے)

ساتھ باوردی گاڑو بیٹھا تھا۔ اس نے ہماری سانس لے کر اندر قدم رکھا۔

برتا سا سر سبز لان۔ سامنے سفید سنگ مرمر کا چمکتا برآمدہ۔ برآمدے کے کونے میں دسویں طبقہ کے پیچھے کھڑی لڑکی جو سیاہ عیالیا کے اوپر سریشی اسکراف میں ملبوس فون کان سے لگائے کچھ جھٹک رہی تھی۔

سامنے سے سفید شلوار قمیض میں ملبوس ایک لڑکی چلی آ رہی تھی۔ اس نے عیالیا اسکراف لے رہا تھا۔ جیسے یونیفارم ہو۔ محفل کے قریب سے گزرتے اس نے مسکرا کر ”اسلام علیکم“ کہا۔  
 ”جی؟“ وہ چونکی۔ وہ لڑکی مسکرا کر اس کے پاس سے گزر کر چلی گئی۔

”ہیں؟ اس نے مجھے سلام کیوں کیا؟ کیا ہے مجھے جانتی ہے؟“ وہ اچھے ہی رہی تھی کہ ریشہ نشین کی آواز آئی۔

”اسلام علیکم۔“ کین آئی صلیب ہو؟“

”جی۔“ مجھے فرشتے سے ملتا ہے۔“ وہ ڈیمک کے قریب آئی۔

”فرشتے باقی کلاس میں ہوں گی۔ اندر کارڈیوڈ میں راسخہ فرشتہ ڈور۔“

وہ ابھر لوہو دیکھتی سنگ مرمر کے چمکتے فرش پہ چلتی جاری تھی۔ کارڈیوڈ میں پہلے کھلے دروازے پہ وہاں کی۔ اندر سے فرشتے کی مضبوط مگر خوب صورت گواز آ رہی تھی۔

”مرثیہ سے مراد بی اسرائیل میں ہونے والا وہ مرثیہ کا قیاس ہے۔“ مقرر کے مطابق پہلی دفعہ سے مراد ذکر کیا کا لٹل بجگہ وہ سری دفعہ سے عیسیٰ کے قتل کی سازش مراد ہے۔“

اس نے کھلے دروازے سے اندر گردن کی۔ سامنے بنے پلیٹ فارم پہ کرسی پہ وہ بیٹھی اسنے آگے میز پر کتاب کھولے مصروف سی پڑھا رہی تھی۔ اس کے سامنے قطار در قطار لڑکیاں کرسیوں پہ بیٹھی تھیں۔ عیالیا اسکراف میں اپنے بہت سے جھگڑے سرور حیرتی سے لکھتے قلم وہاں پلٹ گئی۔

برآمدے میں دسویں طبقہ کے سامنے دو اور سے لگے گاؤج پہ بیٹھ کر وقت کاٹتا ہے۔ سترنگ سوئچی کی ویروہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی پاؤں جھلاتی چوٹم چراتے ہوئے تنہیدی نگاہوں سے ارد گرد تزدنی لڑکیوں کا جائزہ لیتی رہی۔

وہاں ایک منظم سی چل پل ہمدردت ہو رہی تھی۔ وہ جیسے کوئی لوری ہی دیا تھی۔ یونیفارم میں ملبوس اوہر اوہر تیزی سے آتی جاتی لڑکیاں۔ وہاں ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اسٹوڈنٹس کی سفید شلوار قمیض اور اوپر کسی رنگ کا اسکراف تھا، جبکہ تمام پچھڑ اور آگوشلو کے سیاہ عیالیا اور سرنگ اسکراف تھے۔

کے عیالیا اور اسکراف لینے کا انداز ہے حد نفس تھا۔ بہت پر اعتماد، ایکٹو اور مصروف سی لڑکیاں۔ جیسے وہ الگ سی دنیا ہو لڑکیاں ہی چلا رہی تھیں۔ کچھ تھا اس مسجد میں جو محفل کو ہمیں اور نظر نہیں آیا تھا۔  
 ”اسلام علیکم۔“ اگر آپ پور ہو رہی ہیں تو اس کا مطالعہ کر لیں۔“

”شیوہ۔“ اس نے شال ڈاچا کر ریشہ نشین کے ہاتھ سے وہ پڑکھ لیں۔

چند منٹ پہلے ہی اسے بے اختیار وہ شام یاد آئی جب آغا جان نے ٹیبلر پہ اس سے وہ سیاہ جلد والا مصحف چھینا تھا۔

وہ قرآن کی ساتھ رانسلین تھی۔  
 وہ پونچھ دوڑ میان سے کھول کر پڑھنے لگی۔

”اور اس نے ہی غنی کیا اور مالدار بنایا ہے۔ اور وہی ہے جو شعری (ستارے) کا رب ہے اور بلاشبہ اس نے ہی اپنی قوم جادو کا لک کیا اور قوم نمود کو بھی۔ پھر کچھ بات نہ سمجھو اور ان سے پہلے قوم لود کو بھی۔ بلاشبہ یہ سب انتہائی ظالم و سرکش لوگ تھے۔ اور اسی نے پلانا اٹھی ہوئی بیٹیوں کو۔ پھر ان پر چھایا پھر چھایا تھا۔ تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں پہ جھگڑو گے؟ یہ تو تین سو برس پہلے تیسہ سہات میں سے۔ آئے والی قریب آئی۔ اللہ کے علاوہ کوئی ظاہر کرنے والا نہیں تو کیا تم اس قرآن سے تعجب کرتے ہو اور پڑھتے ہو؟  
 ”محفل؟“

وہ جو اہل کھو کر پڑھتی چلی جا رہی تھی، بری طرح چونکی۔

فرشتے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے قرآن بند کیا اور میز پر رکھ کر کھڑی ہوئی۔  
 ”اسلام علیکم۔“ کیسی ہو؟“ فرشتے اس کے گلے لگ کر الگ ہوئی اور اسے شانوں سے قلم کر مسکا کر دیکھا۔ وہ محفل سے واپس لگی تھی۔ شفاف سپید چو سریشی اسکراف میں مشید، اور وہ کالج سی بھوری تھی۔





## مرحباً اسپغول

- تیزابیت، پختی اور قبض کا قدرتی اور صحت مند علاج ہے۔
- اضافی کالسیوم کی مقدار کو کم کرتا ہے اور ہڈیوں سے روکتا ہے۔
- جسم میں ہائیڈروجن کی کوپرا کر رہا ہے۔
- موٹاپے کو کم کرتا ہے۔



دو چمچ روزانہ  
صحت کا خزانہ



”ٹھیک“ سب کیسی ہیں؟  
”الحمد للہ۔ اتنے دنوں بعد تمہیں دیکھ رہی ہوں۔“  
گھر میں سب ٹھیک ہے؟  
”جی۔“ اس نے لگا ہوا جھکاؤ اور بہت سی نمی اپنے اندر اتاری۔  
”چلو کوئی بات نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
”آپ کی چیزیں تمہیں میرے پاس۔“ اس نے شہر لوہ پر کیا۔  
”میں کبھی تم میرے لیے کوئی لکٹ لائی ہو۔“ وہ ہنسی اور شہر لوہے لپٹا۔ کوئی ٹکٹ نہیں بہت خالص سالانہ سنا اور خالص۔  
”لیکن اگر تم یہ رکھنا چاہو تو۔“  
”نہیں میں یہ عیال دیکھ نہیں سکتی۔“  
”تو براہم دین۔ بہت شکریہ۔“ وہ خوش دلی سے مسکراتی تو محل کو اچھا لگا۔  
بہت مذہبی لوگ عموماً ”اتنے عجیبہ اور سخت نظر آتے ہیں کہ جیسے ایک وہی ٹیک سوسن ہوں اور باقی سب گناہگار کافر۔ اسے ایسے لوگوں سے شدید جڑھوٹی تھی جن کے سامنے اسے لگے کہ یہ مجھے بہت گناہگار سمجھ رہا ہے مگر فرشتے اور اس کی مسجد کی لڑکیاں اس روایتی آج سے بہت مختلف تھیں۔  
”یہ لڑکیاں۔“ اس نے دوسرا اشارہ سامنے کیا۔  
”ہاں ہاں؟“  
”جی۔“  
”اچھا“ ہاں کبھی شہر میں ہوتا ہے کبھی نہیں۔ میرا اس سے ایڑیوں کو ٹکٹ نہیں رہتا۔ میں بھول بھی جاتی ہوں بہت۔ اگر تم یہ اس کے چوکیدار کو دے دو تو وہ بچھا دے گا۔“  
”فرشتے! انہوں نے آپ کو اپنی اور فلو بھائی کی ڈیل کے بارے میں بتایا تھا؟“  
”ڈیل نہیں وہ دراصل اتنا فواد سے بہت تنگ تھا اور اسے اس کے ٹیک کی کسی لڑکی کے ذریعے پکڑنا چاہتا تھا۔“  
”وہ ٹیک کی لڑکی کی قریع کر رہے تھے تو آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں ان کی کرن ہوں؟“  
”تم نے خود بتایا تھا جب ہم یہ یہاں میں سب پر پڑھ رہے تھے۔“  
”اٹھ! کئی دن کی ابھرنی سلجھ گئی۔“ میں تو ٹیک کی لڑکی نہیں تھی پھر انہوں نے فواد بھائی کو کیسے اڑست کر لیا؟  
”یہ تو تم ہاں سے پوچھنا۔ میری تو عمر سے اس سے بات نہیں ہوئی۔“  
”ٹھیک۔“ لاہتے کو جن فرشتے میں پھر اس کی۔“ اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کا ہاں سے زیادہ رابطہ نہیں رہتا مگر اسے فواد کے کیس کی ہر بات معلوم تھی۔ عجیب بات تھی۔  
”تو میں دعا کروں گی کہ تم کبھی ہمارے ساتھ آکر قرآن پڑھو۔“  
”معلوم نہیں۔ شاید میں کچھ عرصے تک انگلیڈ چلی جاؤں۔“  
”اوہ۔“ فرشتے کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔  
”آپ کی مسجد میں قرآن پڑھاتے ہیں؟“  
”ہاں۔ یہ دراصل ایک اسلامک اسکول ہے۔“  
”ہوں میں چلتی ہوں۔“ وہ اسے لان تک چھوڑنے آئی۔  
”تمہیں کبھی کسی نے اس کتاب کی طرف نہیں بلایا محفل؟“ جاتے سے اس نے پوچھا تو اس کے برتنے قدم رک گئے۔  
”یادوں کے روئے پہ ایک سیاہ قلم چڑھایا تھا۔“  
”بلایا تھا مگر میں نے دل کا انتخاب کیا اور میں خوش تھی۔ اس نے کہا تھا یہ کتاب سحر کر دیتی ہے اور مجھے سکور ہونے سے ڈر لگتا ہے۔“  
”کتاب سحر نہیں کرتی پڑھنے والا خود کو سحر زدہ محسوس کرتا ہے۔“  
”ان دنوں میں کیا فرق ہے؟“  
”بہت ہے۔“ لفظوں کو الگ الگ پکھنا سیکھو ورنہ زندگی کی سمجھ نہیں آئے گی۔“  
فرشتے چلی گئی اور وہ شہر اٹھائے خود کو کھینچتی باہر



ساتھ والے کھلے گیت میں اندر جاتی گاڑی کے بھر  
کوڑی۔ شیشے نیچے ہوا۔ سر پہ کیپ لودو جیسے چرسے پہ  
ڈارک گلاسز لگائے اس نے اسے دیکھا تھا جو گیت کے  
سامنے کھڑی آنکھیں سکڑے اسے ہی دیکھ رہی  
تھی۔ وہ چونکدار کو کچھ کہہ کر گاڑی زن سے اندر لے  
گئی۔

چونکدار بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا۔  
”صاحب کہہ رہا ہے آپ کو اندر ڈرائنگ روم  
میں بٹلے وہ آتا ہے۔“  
”تمہارے صاحب نے سوچا بھی کیسے کہ میں اس  
سے ملنے آتی ہوں۔ ہائی فٹ۔ یہ پکڑو اور اپنے  
صاحب کے منہ پر ہارٹ“ فیصے سے اس کی آواز بلند  
ہونے لگی۔ سارا لیا دھڑا اسی شخص کا تھا اسے اس پر  
بے طرح غصہ آیا تھا اس نے شاپر اسے تھمایا۔  
اسی پل وہ کیپ ہاتھ میں لیے تیزی سے چٹانوں  
تک آیا۔

”نکلان! یہ بند کرو اور پھول سے کوئی چائے پانی کا  
بندوبست کرے“ مہمان ہیں اور آپ پلیز اندر  
آجائیں۔“ شائستہ دھواں لیمو وہ قطعاً ”مختلف لگ رہا  
تھا۔

”مجھے اندر آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“  
”لیکن آٹھ فوٹو کے باہر آنے کی خبر سننے کا تو ہو گا۔“  
اور وہ جلد بزدل سی سوچتی رہ گئی تو وہاں نے مسکرا کر  
سر جھٹکتے راست چھوڑ دیا۔

دن کی روشنی میں اس کا لافونج انتہائی نفیس تھا جتنا  
اس رات لگا تھا۔

لوچی دیوار گیر کھڑکیوں کے بجائے سی گرین پردے  
نفاست سے بندھے تھے ”سہری روشنی چھن کر اندر آ  
رہی تھی۔“ کونوں میں بڑے بڑے مغلیہ طرز کے  
سہری مکوں میں گئے پودے بہت تروتازہ لگ رہے  
تھے۔

”بیٹھے۔“ وہ ہاتھ سے اشار کرنا سامنے صوفے پر  
بیٹھا۔ اس کے چرسے پہ کھڑکی سے روشنی سیدھی پڑ

”تھیک یو۔“ وہ ذرا شکف سے بٹھکی۔ اس کا  
صوفہ اندر چرسے میں تھا۔ ہمایوں کو اس کا وجود بھی اسی  
تار کی کاغذ لگا تھا۔

”آپ نے جو بھی کہنا ہے ذرا جلدی کہیے۔“  
”ذرا جی ہیں؟“ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رہے ٹیک لگائے  
مختلط سا مسکرایا۔

”میں ڈرتی نہیں ہوں، بلکہ آپ کو بے حد ناقص  
اعتبار سمجھتی ہوں۔“

”شوق سے سمجھیں، مگر میں نے آپ کو انوائس  
کیا۔ آپ کورٹ میں میرے خلاف بیان نہیں دے  
سکتیں۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ میں آپ کے خلاف بیان  
دے رہی ہوں؟“

”آپ کے نام نے۔“  
”محل نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ یاست کچھ  
کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

”وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کورٹ میں یہ بیان دیں  
گی کہ میں نے آپ کو جس بے جا میں رکھا اور حقیقتاً  
وہ آپ اس کے لیے ہاروا لیں گے۔“

”آپ کو کیوں لگا کہ انہیں مجھ پر ہاروا ڈالنا ہے؟“  
”وہ آپ مطمئن سی ٹانگ پہ ٹانگ رہ گئے پاؤں جھٹ  
رہی تھی۔ انداز میں ہلکا سا حشر تھا۔ ہمایوں ذرا چونک کر  
سیدھا بول۔

”دیکھا مطلب؟“  
”جس بے جا میں تو آپ نے مجھے رکھا تھا اے  
ایس بی صاحب۔“

”مس محل ابراہیم! اتنی آسانی سے اسٹے پر  
بیان نہیں دیے جاسکتے۔ حالانکہ آپ جانتی ہیں کہ  
میں بے قصور ہوں۔“

”بے قصور؟ اگر آپ مجھے گھر جانے دیتے تو میں  
یوں بدنام نہ ہوتی۔“

”بیٹھے آپ بے ہوش ہوئیں، حالانکہ اس وقت  
آپ ایک اے ایس بی کی تحویل میں تھیں ہمایوں

داؤد کی نہیں۔ اگر آپ مسجد کی چھت نہ چھلنا چکیں تو  
میں آپ کا پھیلنے کے کرات میں ہی آپ کو اکیلے گھر  
چھوڑ آتا۔“

”مجھے کمرے میں بند کرتے وقت تو آپ نے کسی  
بیان کا ذکر نہیں کیا تھا۔“

”مجھے قانون مت سکھائیں۔ وہ میرا تفتیش کا  
طریقہ تھا۔“

”اور آپ کے اس طریقے میں بھلے کوئی بدنام ہو  
جائے؟“

”تو ہو جائے مجھے پروا نہیں۔“  
”آپ۔“ اس کا دل چاہا وہ کہے اس کے سر پہ

چوڑوے۔  
”میں اس وقت آپ کو آپ کے گھر نہیں چھوڑا تھا  
سکتا تھا، ہم فوٹو کو میل دے رہے تھے۔ میں جانتا تھا  
آپ مسجد میں اور پھر سے پہلے مسجد کے دروازے  
میں کھڑے ہوئیں ازاں ستنے ہی آپ کو لینے آیا تھا۔“

”مجھے آپ کی کہانی نہیں سنی۔“ وہ ہر جتنی اٹھی۔  
”وہ ابھی تک بارش میں تھی جس سے اس کے چرسے  
کے نشوونما دھڑکنے لگے۔

”نہ سیں۔ مگر میرا کارڈ رکھ لیں۔ ہو سکتا ہے آپ  
کو میری مدد کی ضرورت پڑے۔“ اس نے ایک کارڈ  
اس کے ہاتھ میں گویا زبردستی رکھنا چاہا۔

”مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے پکڑ لیا مگر  
جتنا نہ بھولی اور پھر اسی طرح کارڈ پکڑے باہر نکل گئی۔  
وہ لافونج میں تڑا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی  
روشنی ابھی تک اس کے چرسے پہ پڑ رہی تھی۔

\*\*\*

لافونج میں سب بڑے موجود تھے۔ سر جھٹکائے  
کارڈ کو احتیاط سے پاٹ میں چھپا کر اپنے کمرے کی  
طرف چلے گئی۔

”محل! مغفرائیچا نے قدرے رعب سے پکارا۔  
”کنا جانے تو اسے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا تھا وہ اس دن  
سے اس سے مخاطب نہیں ہوئے تھے۔

”جی؟“ وہ ناگواری سے رہی۔  
”کہہ کرے آ رہی ہو؟“  
”میرے کونائے مٹی بھی تھامے؟“

”واٹ؟“ مغفرائیچا غصہ ناک سے اس کی  
طرف بڑھے۔

”جی آپ کے فوٹو اتنا کے خلاف میرے کونائے مٹی  
تھی۔ کیوں؟ نہیں کونائے مٹی؟“ وہ ان کے بالکل سامنے  
کھڑی بلند آواز میں لالچا مٹی سے بولی تھی ”میرے گھر سے  
آئندہ سوال جواب مت کیجئے گا میں جدھر بھی جاؤں  
میری مرضی۔ آپ لوگ ہوتے کون ہیں مجھ سے۔“

”چلنے کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پہ پھینک دیا تھا۔  
وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور چرسے پہ ہاتھ  
رکھے۔ مٹی سے مغفرائیچا کو دیکھا۔

”میرے کونائے مٹی؟“ اس نے اس کو بالوں  
سے پکڑ کر فوٹو سے جھٹک دیا۔

”ہاں ہاں کونائے مٹی۔“ مجھے نہیں روک سکتے آپ  
لوگ۔“ وہ محل چھوڑ کر چلائی تھی۔

وہ سرے ہی کے اسد پچا ایسے اور پھر ان دونوں  
بھائیوں نے کچھ نہ دیکھا۔ تاہم تو اس پہ پھینچوں کی  
بارش۔ یہ کر دی۔

آقا جی بڑے صوفے پر خاموشی سے ٹانگ پہ  
ٹانگ چڑھائے بیٹھے اسے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ہائی  
مہتاب، ناعہ اور فنیہ بھی قریب ہی بالکل خاموش  
بیٹھی تھیں۔ سائید بکن کے کھلے دروازے میں کھڑی  
تھی۔ لوہے سبز جھول سے نڈا اٹھا رکھ رہی تھی۔

وہ اسے ہر طرح کا کیاں دیکھتے مارنے چلے گئے۔ وہ  
صوفے پہ بے حال سی گری جی جی کر رہی تھی مگر  
ان دونوں نے اسے نہیں چھوڑا۔

”بیول! کونائے مٹی؟“ وہ دونوں بار بار کی پوچھتے  
یہاں تک کہ محل ہی محل میں جواب دینے کی  
سکت نہ رہی تو انہوں نے ہاتھ روک دیا۔ صوفے کو  
ایک ٹھوکر مار کر مغفرائیچا باہر نکل گئے۔

”ای! ای!“ وہ صوفے پہ گری منہ پہ بازو رکھے  
تھی کھٹی سسکیوں سے دو رہی تھی۔ مسرت اور







اسے یہ نہیں بتانا چاہیے تھا۔  
 ”ہماروں کو تمہاری بہت فکر تھی۔“ وہ لوہاں گری  
 پہ آ بیٹھی تھی۔  
 ”انہیں میری نہیں اپنی فکر ہے۔ بہت خود غرض  
 ہیں آپ کے کرنا۔“  
 ”جائے دو۔“ وہ نرمی سے مسکرائی۔ ”کسی کے  
 پیچھے اس کا برا ذکر نہیں کرتے۔“  
 ”تو بھی ہے۔“ اس نے شانے اچکے۔ ”یہاں وہ  
 اپنے کرنا کی برائی نہیں کر سکتی تھی۔“  
 ”اچھا یہ تاؤ۔“ وہ ذرا گری پہ آگے کو ہولی ”آگے  
 پڑھائی کا کیا یہ گرام ہے؟“  
 ”تمہارے یونیورسٹی جوائن کر لی ہے۔“  
 ”تو ابھی گریموں کی چیٹھوں میں کوہرا سکول آجائو“  
 قرآن پڑھنے۔  
 ”اے۔۔۔ نہیں۔۔۔ ایک دو کلی۔۔۔ میرے پاس  
 قرآن کے ترشے والا۔ گھر میں پڑھ لوں گی۔“  
 ”کی ایس سی میں کون سا ہیجکٹ تھا؟“  
 ”ہیجکس۔“  
 ”کس سے پڑھا تھا؟“  
 ”کان میں پڑھ رہی تھی اور شام میں ایک بائی کے  
 پاس ٹیوشن لینے جاتی تھی۔“  
 ”تمہارے کسی ایک بھی تو سہی تمہارے پاس پھر دو  
 دو جگہ سے کیوں پڑھا؟ گھر پر نہ کر لیتیں۔“  
 ”گھر میں خود سے کیسے پڑھا جاتا ہے اور۔۔۔ پھر  
 رک گئی اور جیسے سمجھ کر گری سانس لی۔“ قرآن اور  
 نصائی کتابوں میں فرق ہوتا ہے۔“  
 ”اسی لیے ہم چار سال کی عمر سے گھنٹوں نصای کو  
 پڑھتے رہتے ہیں۔“ اور قرآن کو بوجھاپے کے لیے رکھ  
 چھوڑتے ہیں۔“  
 ”مگر قرآن کو اللہ نے آسان بنا کر اتارا ہے تاکہ ہر  
 کوئی سمجھ سکے۔ مہتمس شیپر کے بغیر سمجھ میں نہیں  
 آتا۔“  
 ”قرآن آجاتا ہے؟“  
 ”ہاں کیوں نہیں۔“

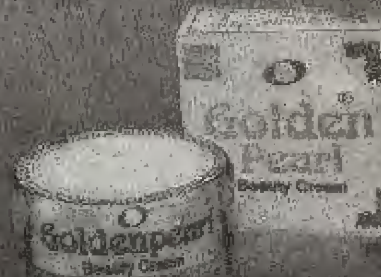
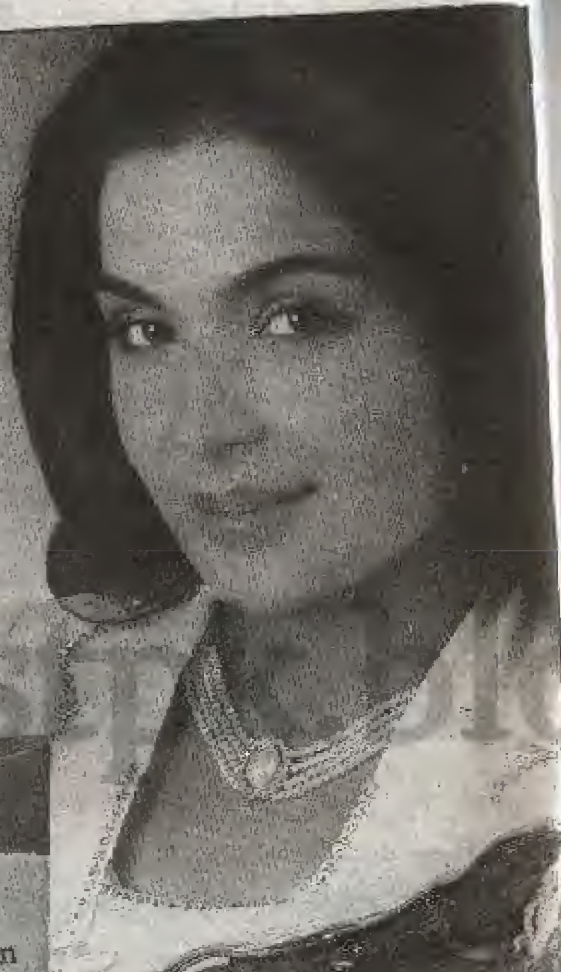
فرشتے نے گری سانس لی اور جھک کر یہ اسے  
 ایک سیاہ جلد والی دھڑ کتاب نکالی۔  
 ”یہ انجیل مقدس کا ایک قدیم حصہ ہے۔ اس میں  
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیش گوئی ہے۔ کافی  
 دلچسپ ہے یہ حصہ۔“ اس نے ایک صفحہ کھول کر اس  
 کے سامنے کیا۔ ”محمل نے کتاب اپنی جانب ہٹا لی۔  
 ”اس کی امت کی انجیل ان کے سینوں میں ہوں  
 گی۔“ وہ بے اختیار دیکھی۔ ”انجیل؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”انجیل کی جتنی مراد ہے قرآن مجید یہ یہاں سے  
 راجع۔“ فرشتے نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ ”خود طوطی پیدا  
 انگلی جس کا گلابی باغ غنمت سے تراشیدہ تھا۔ اس  
 نے انگلی میں زمرہ جڑی چاندی کی انگوٹھی پہن رکھی  
 تھی۔  
 ”اچھا۔“ وہ دوسرے پڑھنے لگی۔  
 ”وہ بازار آدمی میں شور کرنے والا ہو گا نہ بے ہودہ کو  
 ۔۔۔ ہم احمد ہو گا ولادت مکہ ہجرت طیبہ اور ملک شام  
 ہو گا۔“ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھنے والا ہو گا اس  
 کے اذان دینے والے کی پکار دو۔“ آفتاب کی بجائے گی۔“  
 ”وہ رک کر جیسے اچھ کر پھر سرور سے دیکھنے لگی۔  
 ”ملک شام ہو گا؟“  
 ”بعد میں مسلمانوں کی حکومت شام تک پھیل گئی  
 تھی اسی طرف اشارہ ہے۔“  
 ”پھر آفتاب کے سایوں پر نظر رکھنا۔۔۔؟“  
 ”نمازوں کے اوقات کے لیے۔“  
 ”پھر اذان دینے والا۔۔۔؟“  
 ”ہلال۔“ فرشتے جواب دیتے ہوئے مسکرائی۔  
 ”مگر پڑھ کر پڑھو کی تو یہ سوال کس سے پوچھو گی؟“  
 ”قرآن کی تفاسیر بھی تو پڑھ سکتے ہیں۔“  
 ”علم پڑھنے سے نہیں سمجھنے سے آتا ہے۔“  
 ”آخر گھر پر پڑھنے میں کیا ہے؟“  
 ”سہی کو خنجر کے پاس جلا کر تاسے میری جان خنجر  
 موی کے پاس نہیں آتے۔ اچھی کو اپنی کے علم کے  
 لیے اتنی ہی سزا کرنا پڑتا ہے۔“  
 ”آپ۔۔۔ آپ کی ساری بات ٹھیک ہے مگر ہنر

میری بات بھی ٹھیک ہے۔“  
 ”مذہب بین بین ڈانگ لا الی حواء ولا الی حواء۔“  
 فرشتے بین کو انگلیوں کے درمیان گھمائی مسکرا کر گری  
 سانس لے کر بولی۔ ”وہ ان کے درمیان تذبذب میں  
 ہیں نہ لوہر کے ہیں نہ دوسرے کے ہیں۔“  
 ”آپ نے عربی میں کچھ لکھا کتاب عام پڑے کو  
 عربی کہاں سمجھ میں آتی ہے؟ قرآن اردو میں کیوں  
 نہیں اترا؟“  
 ”اچھا سوال ہے۔“ وہ اپنی نشست سے اٹھی اور  
 سامنے کتابوں کے ریک کی طرف گئی۔ پھر سیدھی  
 کھڑی کتابوں کی جلدوں پہ انگلی گزرائی کسی کتاب کو  
 تلاش کرنے لگی۔  
 ”تو تمہارا نقطہ یہ ہے کہ صرف خالی محاورے ترجمہ  
 دیکھ کر قرآن پڑھنا کافی ہے۔“ اس نے ایک کتاب  
 پہ انگلی رکھ کر اسے کھینچ کر باہر نکالا۔  
 ”یہ سورہ بنی اسرائیل میں ایمان کے آدم کو سجدہ  
 کرنے سے انکار کرنے کا قصہ ہے۔ یہاں ایمان نے  
 اولاد آدم کے لیے کیا لفظ استعمال کیا ہے۔ پڑھو۔“ اس نے پڑھا  
 ترشے والا قرآن اس کے سامنے کھول کر رکھا اور اپنی  
 زمرہ جڑی انگوٹھی والی انگلی ایک لفظ پر رکھی۔ ”محمل  
 بے اختیار قرآن پڑھ لگی۔  
 ”لا تحسبن آیتہ میں ضرور قایم کروں گا۔“ اس  
 نے لفظ اور ترجمہ دونوں پڑھے۔  
 ”رائٹ۔“ اگر آیتہ میں اور ضرور کے جملہ کو نکال دو  
 تو تین حرفی لفظ رہ جاتا ہے۔ ح ن ک۔ یعنی حنک۔  
 حنک کے تین معانی ہوتے ہیں۔ کسی چیز کو خوب  
 پار کی میں سمجھنا۔ مذاہن کا حکمت کا عقاب کرنا اور  
 محوئے کے جزوں کے درمیان سے لگام گزار کر  
 گھوڑے کو قابو کرنا اردو میں اس کا لکھا ہے قابو کرنا۔  
 جسے انگریزی میں کنٹرول کہتے ہیں۔ جبکہ عربی کی  
 وسعت ہمیں بتاتی ہے کہ شیطان کس طرح جاری  
 نفسیات سمجھ کر ہمارے ایمان کا صفایا کر کے ہمیں  
 لگام ڈالتا ہے اور وہ لگام عموماً منہ کے راستے سے ڈال  
 جاتی ہے اور قرآن اسی لیے عربی میں اترا اور۔۔۔ تم

میری بات سے پور پوری ہو۔ چلو جانے دو۔ ابھی  
 تمہارے پاس ٹائم ہے اس لیے کہہ دی تھی ورنہ  
 بعد میں دنیاوی تعلیم میں کچھ کر تمہیں اس کا وقت  
 نہیں ملے گا۔“  
 ”یعنی آپ بھی ٹیکسٹ بکس مولویوں کی طرح دنیاوی  
 تعلیم کو گناہ سمجھتی ہیں؟“  
 ”میں دنیاوی تعلیم میں کچھ کرنا بہت بڑے گناہ  
 سمجھتی ہوں۔“  
 ”اچھا میں چلتی ہوں۔“ وہ بیک کندھے پہ ڈالنی  
 اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 ”ہاں۔“ ہمیں دیر پوری ہے گھر میں سب پریشان  
 ہو رہے ہوں گے۔“  
 ”پریشان و پریشان کوئی نہیں ہوتا۔“ قیہوں کی پروا  
 کسی کو نہیں ہوتی۔“  
 ”کون۔۔۔؟“  
 ”میں ابیر سے لیا نہیں ہیں۔“  
 ”گھر کا یہ تمہاری؟“  
 ”میں سال۔“  
 ”پھر تو تم ٹیکس نہیں ہو۔“ تیم کو اس نابالغ بچے کو کہتے  
 ہیں جس کا باپ فوت ہو جائے بلوغت کے بعد کوئی  
 شہی نہیں ہوتی۔ اپنی اس خود تری کو اپنے اندر سے  
 نکال دو محمل۔“  
 ”آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ محمل بے یقینی سے پچھے  
 دہنی اور چہرے کے اسے یو کی بے اعتدال نگاہوں سے دیکھ  
 کر نابالغ کے قہری سے باہر بھاگ گئی۔  
 فرشتے کی بات نے ایک دم اسے بہت ڈسرب کر دیا  
 تھا۔  
 ”بھاڑ میں تھی ڈسٹری میں جیم ہوں!“ وہ قہری  
 سے راہداری عبور کر کے برآمدے میں آئی۔ آگے  
 نکل ہی نہ پائی تھی کہ ریسپنڈنٹ نے روک دیا۔  
 ”اسلام علیکم۔“ یہ آپ کا لائٹ میں قاریم فرشتے ہلالی  
 نے کہا تھا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے۔“  
 ”آف! وہ گری سانس پھر کر دیکھ کے قریب آئی۔  
 ”دیکھا ہے۔“



**Goldenpearl®**  
COSMETICS



”بس دیکھ کرو ایس کردوں گی مجھے مولوی نہیں بننا“  
”اس نے سوچا۔“  
”سناچ کون سا ہے؟“ وہ اب پرانے کھٹن کے  
صفے پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔  
”علم الکتاب۔ پرسوں وہی کلاس ہے۔“  
”تیس فرشتے کو صاف انکار کردوں گی، بھلے وہ برا  
منائے۔ بس پورا دیکھ کرو ایس کردوں گی۔“ وہ سوچ  
رہی تھی۔  
”تو یہ فارم فل کر کے کدھو نہ ہے؟“  
”اسی ایس ہے۔“  
”اور کیس؟“  
”علم کی نہیں نہیں ہوتی۔“  
”پھر بھی کچھ چار جز تو ہوں گے۔“  
”ہم تو ان پر نہانے کے چار جز نہیں لیتے۔“  
”تو نہ لیں، مجھے کون سا ادھر داخلہ لیتا ہے۔ میں تو  
پورا دن کھانا کھا لیت کر تو ان نہیں پڑھ سکتی۔ کئی  
ایم سوچی فرشتے انہیں یہ نہیں کھاتے۔ اس نے  
خود کھائی کی تھی۔“  
”مگر بس منٹ بعد وہ فارم فل کر رہی تھی۔“

وہ بیک کو اسٹوپ سے تھامے، ہاتھ گرائے یوں  
جھکے جھکے قدموں سے چل رہی تھی کہ بیک ٹکٹا ہوا  
زمین کو چھو رہا تھا۔ کالوں کے گتے درخت خاموشی سے  
جھکے کھڑے تھے۔ وہ آہستہ سے بچا پہ جائی بھی جو آج  
بھی اواس تھا۔ وہ فارم جمع کر کے فرشتے سے بغیر وہیں  
سے نکلی تھی ابھی تک وہی سوچ رہی تھی تب ہی  
کئی کے دہرے دوڑتے قدم اس کے قریب ست  
پڑے۔

”کیسی ہو؟“ کوئی اس کے پاس آکھڑا ہوا۔  
اس نے ہولے سے سر اٹھایا۔  
”ہاں بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ  
ٹراؤڈز پر رلب سی سفید شرٹ پہنے تھے گے کیلے بل  
لوہ پر سے نہی پھولی سانس بھیجے خیر جاگنگ کرنا دھ

”کیا فرق پڑتا ہے آپ کو؟“  
”فرق تو پڑتا ہے۔ تمہیں یوں دیکھ کر مجھے یقین ہے  
کہ تم میرے خلاف کورٹ میں پیش ہونے کے لیے  
تیار ہو گئی ہو۔“  
”ہو یا نہ ہو گا تمہارا کیا کردار۔“  
”کچھ نہ کرو۔“ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ حمل چھو  
موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جو سامنے تھے وہ خوں کی بازو  
دیکھ رہا تھا۔ ”جب تک تم عدالت میں جاؤ گی، ہمارا  
پھندا اٹاؤ کی گردن کے گرد مزید تنگ ہو چکا ہو گا۔ بس  
ابھی ان کی پانچ جاؤ کورٹ میں پہنچاؤں۔“  
”استغفر کر لیں سب مجھے اپنے اپنے مقاصد کے  
لیے۔“ وہ دھک سے سر جھٹکی اٹھی اور زمین پر گرا بیک  
اسٹوپ سے اٹھایا۔  
”مگر وہ ہو گئی ہو بہت اپنا خیال رکھا کرو۔“  
”آپ کی نظر میں بھی غرض پوشیدہ ہے۔ کاش میں  
آپ کے خلاف بیان دے سکوں۔“ وہ تیز قدموں  
سے سڑک آگے بڑھ گئی۔  
وہ شاٹ آؤ کا کرکٹ کی طرف آیا۔ گیٹ بند کرتے  
ہوئے اس نے نگاہ بھر کر گردن موڑ کر اسے دیکھا ضرور  
تھا جو سر جھکا کے تیز تیر سڑک کے کنارے چلتی جا رہی  
تھی۔ اس کی بھوری اونچی پونی ٹیل گردن پر برابر جمول  
رہی تھی۔  
”ہاں یوں پلٹ کر دیکھو یہ جاگنگ کی طرح بھارت  
ہوا اندر رہ رہ گیا۔“  
”درختوں کی بازو اور پتھر کھینچ پھر سے بران ہو گئے۔“

”ہیلو!“  
وہ بید سے ٹیک لگائے، گھٹنوں پر پرانے کھٹن  
رکھے سر سری سا پڑھ رہی تھی جب وہ اٹھ کھڑا۔ آواز  
پہلے سے سر اٹھایا۔  
”جو کھٹ میں آواز کھڑی تھی۔ یہ ٹراؤڈز کے اوپر  
سیلو کیس سفید شرٹ تھے اس کا مخصوص ایکسپریس ٹرک



لباس تھا۔ کئے ہوئے بال شانوں تک آتے تھے۔ سچی مکمل کی طرح بھنوس اٹھاتے وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیسی ہو؟“ اندازہ مستانہ تھا۔ محل بٹھکل سنبھل جاتی۔

”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟“ وہ سیدھی ہو بیٹھی اور پراسپیکٹس یا محسوس انداز سے ایک طرف کھسکا دیا۔

”فت!“ وہ بے تکلفی سے اس کے پیٹ کے کنارے تک گئی۔ اندر آتے ہوئے اس نے وردانہ پورا بند کر دیا تھا۔ محل بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی جو علوانا بالوں میں اٹھکیں چلائی اپنی بلی بھنوسوں کو سیکڑے کر کے کاجازہ لے رہی تھی۔

”کتنی چھوٹا کمر ہے تمہارا محل؟“ ایٹ لیسٹ اتنا جان کو نہیں پراپر پندرہ سو فٹ چار سو فٹ تھا۔ بعض دلع تھا جان بہت زیادتی کر جاتے ہیں۔ ہے؟“ اس نے رائے مانگی۔ محل نے ایک نظر وردانہ کو دیکھا وہ بند تھا۔

”معلوم نہیں۔“

”تم کو تو سن رہا ہے کہ تمہیں پورا روم ملا دوں؟“

(یہ خیال اتنے سالوں میں تو آپ کو نہیں آیا۔ آج کیوں؟)

”اس اوسکے میں خوش ہوں۔“ اس نے پھر سے بند وردانہ کو دیکھا۔ ”مجھے اتنا جان سے کوئی شکایت نہیں۔“

”خیر“ اتنا جان کی ہی کیا بات۔ خود فواوے تمہارے ساتھ کئی زیادتی کی۔ کم از کم گھر کی عزت کا تو خیال کیا ہوگا۔“

”آپ کو؟“ آپ کو میرا یقین ہے؟“ اسے جھکا کا تھا۔

”آف کورس۔ فواو کو کون نہیں جانتا اور آپ تو یہ لوگ تمہارے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔“

”کیسی سازشیں؟“ وہ تھکا ہوا۔

”یہ تم سے اس اے ایس بی کے خلاف بیان دلوائیں گے کیا نام تھا اس کا؟“ اس کا اندازہ بے حد سرسری تھا۔

”ہاں! ڈاکٹر۔“ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔

”ہاں اسی کے گھر فواو تھیں لے گیا تھا۔ کدھر رہتا ہے وہ؟“ آپ آرزو بہت سی لاپرواہی سے کہتی اوھر لوھر زیادہ دیکھ رہی تھی۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا آرزو بانی کہ وہ کس کا گھر تھا۔“

”معاذ نبیر ہو گا تمہارے پاس؟“

”جی ہے۔ آپ کو چاہیے؟“

”ہاں پتا؟“ آرزو یکدم الرٹ سی ہوئی۔ سارا سر سرسری بن اڑا چھوڑ گیا۔

”دن فائیو؟“ کل کر لیں یہی نمبر ہوتا ہے پولیس والوں کا۔“ اس نے مسکراہٹ دلائے پراسپیکٹس پھر سے اٹھالیا۔

”خیر“ رہے وہ۔ مجھے کام ہے۔ چلتی ہوں۔“ آرزو ناگواری سے کہتے ہوئے تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔

”ان کا بھی کیا معاملہ ہے؟“ فت ہال کی طرح فواو اور ہاویوں کے درمیان لڑھکاتا رہا ہے۔ یونہی۔“ اس نے استہزاء سے سر جھٹک کر پھر سے پراسپیکٹس اٹھا لیا۔

\*\*\*

آج کتنے ہی دنوں بعد وہ خود سے ناشتے کی میز پر موجود تھی۔ کسی نے اس کو مخاطب نہ کیا وہ خود بھی خاموشی سے تیز تیز لقمے لے رہی تھی۔ یونیفارم کی سفید شلوار قمیض پہنے اور بلی پنک اسکارف گردن میں ڈالے بالوں کی اوچی پونی تیل بنائے وہ اپنی پلیٹ پر چھٹی تھی۔

”محل!“ فٹہ جی نے خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔ وہ بخور سے دیکھ رہی تھی۔ ”مکالمہ خواتین کر لیا ہے؟“

تو سن یہ جیم لگاتے حسن نے چونک کر اسے دیکھا وہ سر جھکا کے ٹائٹ میں مگن تھی۔ اوچی بخوری پونی سے

ایک لٹ نکل کر محل کو چھوڑی تھی۔ فٹہ کے پکارنے پر اس نے گردن اٹھائی۔

”نہیں۔ ایک انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن لیا ہے۔“

”کیا پڑھتی ہو اوھر؟“

”میں پتا ضروری نہیں سمجھتی۔“ وہ کرسی دھکیلتی اٹھ گئی تھی۔ حسن کی نگاہوں نے دور تک اسے باہر جانے دیکھا تھا۔

اسکول کی ایک رابڈری میں لگے ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اسکارف کو سر پر رکھا اور جیسے کے گرد فاسٹ سے لیپٹ کر پین لگائی یوں کہ دکانی سنہری رنگت والا چہرہ بلی پنک بخوری ہالے میں مقید ہو گیا۔ اوچی پونی تیل کے باعث پیچھے سے اسکارف فٹہ سے اوپر اٹھ گیا۔

”ہوں ٹائٹس۔“ وہ خود کو سر اٹھاتی واپس برآمدے تک آئی۔ گھر سے اسکارف لے کر اتنا سے عجیب سا لنگ رہا تھا سو میں آکر اس نے اسے سر لیا تھا۔

برآمدے سے چوڑی بیڑھیوں پر پھل میں جاتی تھیں۔ ساتھ ہی جوتوں کا ایک پڑا تھا۔ اس نے جوتے دیکھے اتارے اور شے پاؤں سنگ مرمر کے ٹھنڈے زینے آڑنے لگی۔

وسیع و عریض prayer ہال بھرا ہوا تھا۔ قائلین چ سفید چادریں چھٹی تھیں۔ ان پر بہت سیلے سے محفوں میں ڈیک لگے تھے وہ ڈیک زمین سے بازو بھر ہی اٹھتے تھے جیسے عوامی مدر سول میں ہوتے ہیں۔

”ٹیسکوں کے پیچھے سفید یونیفارم اور بلی پنک اسکارف سے ڈھکے سر والی لڑکیاں سفید چادروں پر دوڑاؤ موٹری بیٹھی تھیں۔

محل نے بہت سے آخری بیڑھیوں پر پاؤں رکھا۔ وہ ہال کے آخر میں تھی۔ اس کے سامنے ان ساری صفوں میں بیٹھی لڑکیوں کی پشت تھی۔ سامنے اوسکے پلیٹ فارم پر میڈم کی کرسی اور ٹیبل تھی۔ ان کے پیچھے دیواریہ لکڑی کرائی اور ہال تھی۔

”قرآن ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سن کر رہے ہیں۔“

اسے لگا وہ ان لڑکیوں کی طرح بچے نہیں بیٹھ سکے گی۔ سوال کے آخر میں دیوار سے لگی کرسیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اس کی کتابیں خاصی انٹریسٹنگ تھیں۔ کتاب الطہارۃ، کتاب الزکوٰۃ، کتاب العلم، کتاب ہلال صلوٰۃ، کتاب ال حیا، کتاب الحج و عمرہ۔ بچوں نے چھوٹے کتابچے تھے۔ ہائی ایک سیارہ تھا۔ سیارہ سیارہ بہت بڑے سائز کا ہر سیارے پر بیٹھی بڑی پانی عری کی سطور تھیں اور ہر دو کے درمیان میں خلل لائیں تھیں۔ غالباً ”فولس لینے کے لیے۔“ عری کے ہر لفظ سے اس کا اردو ترجمہ ایک چوکور خلتے میں لکھا تھا یوں ہر لفظ الگ الگ نظر آتا تھا۔

دو دس منٹ لیٹ تھی۔ میڈم مصیبت کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔

”سب سے پہلے تو آپ لوگ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہاں آپ کو دین پڑھایا جائے گا مذہب نہیں دین اور مذہب میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دین religion کو کہتے ہیں اور مذہب عقیدے یا اسکول آف تھات کو“

دین پڑھنے سے قبل ایک بات ذہن میں نقش کر لیں اور گروتے باندھ لیں۔ دین میں دلیل صرف قرآن کی آیت یا حدیث صلی اللہ علیہ وسلم سے دی جاسکتی ہے۔

اب وہ سورۃ فاتحہ سے آغاز کر رہی تھیں۔

”الحمد للہ۔“ محل کے الفاظ تین یا چار حروف سے بنتے ہیں جنہیں ہم روٹ روٹ کرتے ہیں۔ الحمد میں ”حم“ کا روٹ دوڑا حکیم دال (ح م د) ہے یعنی تعریف اسی ”حم“ سے جلد ”حماد“ ”حمید“ ”محمّد“ ”محمود“ بنتے ہیں۔ جلد ”تعریف“ کرنے والا ”احمد“ تعریف والا ”محمّد“ خوب خوب تعریف والا ہے۔ جب آپ قرآن کو سنیں روٹ ڈالیں جن سے پڑھیں گے تو آپ ان انجوائے کریں گے کہ بس۔ جیسے ”سبح“ ”کادش“ ”سجد“ ہے اس سے مسجد ”ساجد“ ”سجد“ بنتا ہے۔

پڑھانے کا انداز دلچسپ تھا۔ محل تیزی سے نوٹس لے رہی تھی۔ اس نے بار بار سوچا کہ یہ فیصلہ صحیح تھا یا



غلط مگر اندر سے وہ تہذیب ہی رہی تھی۔

اگلے کچھ روزوں پر اجماع میں اتنی مصروف رہی کہ فرشتے سے مل ہی نہ سکی۔ تجویز "تفسیر حدیث کی برصالی۔ برصالی ٹھیک تھی اور بس ٹھیک ہی تھی۔ کوئی غیر معمولی چیز تو اسے ابھی تک نظر نہ آئی تھی۔ الہیاتی رائے بھی تھی کہ قرآن میں وہی کچھ تھا جو اس نے سوچا تھا۔ لہذا حکم کا ذکر کا وہ مال خرچ کرنے کی تاکید۔ مومن "کافر" سابق کی تعریف وہی مذہب کے منافقوں کا ذکر۔ یعنی اب مسلمان ہیں "انفاق تو پرہیز ہی رکھا تھا۔ ہاں وہ باتیں تو ہرگز نہ تھیں جس کا ذکر وہ سیاہ فام لڑکی کیا کرتی تھی۔

الہیت و قرآن کو بہت دھیان سے برحق الفاظ کے معنی یاد کرنے کی کوشش کرتی تو اس میں "اور دعوت دروازہ بھٹکتی۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا غلط قرآن پر حقیقی الفاظ کو جھول لیا کرتی تھی۔

مثلاً "ب (بازی) لی ہوتا ہے" مگر وہ بازی (بے) برحق تھی اور یہ ساری امیال "کالی" دریاں جو تیسری قرآن سکھاتی ہیں "وہ عموماً" غلط نقطہ سے مجھل جاتی رہتی ہیں۔ اس میں اور کثرت کا فرق ہی نہیں پتہ چلتا۔ جب ہم زبردستی کو بہت لبا کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم قرآن میں ایک حرف کا اضافہ کر رہے ہیں۔ زور کو کھینچ کر لطف کا اضافہ کر رہے ہیں۔ قرآن میں تحریف کر رہے ہیں۔ معانی بدل رہے ہیں۔ اگر بڑی کو تو خوب برٹس اور امریکن بے میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن جس کو عربی اب ویسے میں پڑھنے کا حکم ہے اور جس میں زبردستی کو اصل سے زائد کھینچنا بھی حرام رہے گی۔ غلطی شمار ہوتی ہے اس کے سیکھنے کو اہستہ ہی نہیں دیتے۔

مسجد میں ایک اور عجیب و غریب واقعہ اسے شروع میں تو عجیب ہی لگا اور بعد میں اچھا۔ وہاں ہر کسی کو سلام کیا جاتا تھا۔ راہداروں میں سے گزرتے "بیڑیوں" یہ اترتے چڑھتے "جو بھی لڑکی نظر آتی اس کو مسکرا کر سلام کیا جاتا۔ بچلے کسی کو آپ جانتے ہیں یا نہیں مگر سلام فرض تھا۔ کسی کو مخاطب کرنے کے لیے بھی

ایکسکیز "کی ایک اسلام علیکم کمرے کا خطاب کیا جاتا۔ ایک سیکورڈی کمرے کا معانی "کس غلطی کی باتیں ہو ہوئی تھیں؟ وہاں کیوں نہ دیں؟" فرشتے نے بہت پہلے اس کرتایا تھا تو وہ سوچتی رہی تھی۔

ان تمام سوجوں کے برعکس محمل قرآن کو عزت دیتی۔ اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں بیٹ پر بیٹھی صبح کے نوٹس پڑھ رہی تھی۔ جب دروازہ ہولے سے کھلا اس نے جرت سے سر اٹھایا۔ یہ کھنگھنا کر کون آئے گا بھلا اس کے کمرے میں؟

"ہی؟" دروازہ ہولے سے کھلا۔ وہ الجھ کر آہستہ آہستہ کھلتے دروازے کو دیکھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ پورا محمل گیا اور اسے بھر کو تو وہ سن ہی ہوئی پھر جیسے بو کھلا کرے اتنی۔

"آ۔ آتاجان۔ آپ؟" وہ دلچسپی میں کھڑے تھے اطراف کا جائزہ لیتے کمرے ہاتھ پاتھ اندر داخل ہوئے۔

"آپ۔ آپ یہیں آتاجان! پھر ہاں کمرہ تھا" وہ انہیں گہلیں آتائی۔ چلری سے سیپارہ پور شایستہ پر رکھا اور بیڈ کی چادر ٹھیک کی۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"کوہر کو پتا مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" یہ اس واقعہ کے بعد پہلی دفعہ تھا جب وہ اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ اور انداز میں خاموشی بڑی تھی۔ وہ کسی معمول کی طرح ان کے سامنے آ بیٹھی۔

"جنگ تھی۔" "محمل!" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے آہستہ سے بولے۔ محمل سانس روکے ان کو دیکھنے لگی۔

"تو اسے تمہارے ساتھ برا کیا بہت برا۔ میں تم سے اس کی طرف سے متعلق نہ لگتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں آتاجان پلیر۔" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ تو وہ موم کی طرح کھلنے لگی۔ بے اختیار ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"تمہارے ساتھ بہت زیادتی ہو گئی تھی میں جانتا ہوں اور اب میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہی؟" وہ کچھ کچھ نہ پاری تھی۔

"میں چاہتا ہوں تم سے تمہارا حصہ الگ کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم اس کی دیکھ بھال کر سکو۔ فطری رسمت کی تم مالک ہو۔ تم وہ حصہ لے لو۔ میں نے وہاں کو بچہ زنیار کرنے کا کہہ دیا ہے۔"

وہ حقیقی ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"میں آج چاہتا ہوں کہ تمہاری باتیں آپ کریں۔" بعض دفعہ اپنے حقیقی کی بات اس کے لیے میں کہنا آسان ہوتا ہے۔ نسبت اپنے مخالفین کے سامنے۔ وہ اور کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ اس ایک تک انہیں دیکھنے لگی جو اس کے سامنے بیڈ کی پائنتی پیٹھ تھے۔

"میں آج چاہتا ہوں کہ کھڑے سائن کر دیتا ہوں مگر تم میری ایک شرط ہے۔ یہ میرے لیے ہے کہ ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر بھی نہیں پڑیں۔ وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے وہ دم سلاستہ ان کی منتظر تھی۔

مگر قرآن کے خلاف نہیں بلکہ اسے ایس بی ہاویوں کا ذکر کے خلاف انہوں نے جرم کیا ان کی کوٹ میں۔

وہ اندھ کھلے سب اور بھٹی جی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"توالت نے ہمیں تارن خوسہ دی ہے اب اگلے ماہ کی تاریخ میں چاہتا ہوں کہ تم عدالت میں اپنے بیان سے نہ پھو تاکہ میں چاہتا ہوں کہ کھڑے تمہارے حوالے کروں۔ جیسے ہی تم کو عدالت میں بیان دے گی میں دستخط کروں گا۔"

وہ اندھ کھڑے ہوئے وہ انہیں دیکھنے کے لیے گردن بھی نہ اٹھا سکی۔

"تمہارے پاس وقت ہے خوب اچھی طرح سوچ لو اور اسے ایک برس تک سمجھو یہ تمہیں آہستہ آہستہ کی باتیں اس بار سنا لے میں مدد دے گی۔" وہ انداز سے کی طرف بڑھے۔

"مجھے منظور ہے۔" وہ تیزی سے بولی غصہ کرنے میں اسے ایک بل کھاتا بھاؤ میں گیا ہاویوں جس ہے جاپس تو اس نے بھی مجھے رکھا تھا۔

انہوں نے ذرا سا سڑکرافت جاتے مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"تم اچھی رہیں وہ من بن سکتی ہو بیک کمرہ۔" اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

کیا یوں ہاویوں گرفتار ہو جائے گا؟ اور۔ اور فوائد کیا نہ کر آجائے گا؟ نہیں۔ مگر چاہتا ہوں اسے مقام کو پالنے کی خواہش۔ کبھی وہ بھی لگتی۔ پونجی حکم چلا سکے سب اس کی عزت کریں اس کے حکم سے کھڑے کام ہوں اس کی موجودگی ہر جگہ ضروری تھی۔

جیسے وہ اندھ کر رہی تھی۔

کیا اس نے کچھ کیا کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

صبح آٹھ بجے وہ مسجد کے گیٹ پر تھی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے رک کر کمریوں سے ڈھنگے بیٹھے کو دیکھا جس کا کٹی میچ ان بھی ویران پڑا تھا۔

"ایلیا تمہارا صاحب ہے؟" کچھ سوچ کر اس نے بلور دی گارڈ کو مخاطب کیا۔

"وہ تو شہرت باہر گیا ہے۔"

"دکب آگے گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"اچھا! اس نے ذرا سی ایڈی لڑائی کر کے گیٹ کے پار دیکھا۔ ہاویوں کی گاڑی کھڑی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آگست ماہ)





## مصحف

محمل ابراہیم، آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تاپا آغا کریم اور بچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً "تائی متاب" کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل یوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔ آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور متاب تائی، فواد عثمان، وسیم، سدرہ اور مرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فاضل کے چچی کے تین بچے حسن، ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعیم بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو، معین اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ بچھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں مائی متاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو، فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی متاب کے خاندان کی اس دکھتی رنگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو، سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک پراسرار سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی، حال، مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل، آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکالرشپ مل





جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ابرو ٹانگیں انجینئر فراقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانس سوکھ جاتا ہے۔ مائی متاب فوراً انکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آنر شپ دینے اور جواب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محل اس پر سراسر لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی مائی متاب سب کے ساتھ اسے رگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محل سمیت سب رگہ رہ جاتے ہیں۔ مائی متاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملائی ہیں۔ محل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت بھی سناتی ہے۔ اس رد عمل پر وہ لڑکی بچھری جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی معنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میرٹ میں ڈنر کا جھانسنہ دے کر فواد، محل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈراما رچا کر محل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اے ایس بی کے سامنے محل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، محل کی آغا فواد سے بات کروانا ہے تو وہ اسے رات اسی کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ محل اس دھوکہ دہی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کو محلی کے برابر میں مدر سے ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ محل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آغا کریم اور تمام بچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکہ دے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کروا دیتی ہے۔ مائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آغا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ ”مصلحتاً“ محل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس معاملے میں محل کو بھی قصور وار سمجھتی ہیں۔ محل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدر سے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف محل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھروالوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محل کو بری طرح زد و کوب کرتے ہیں۔ وہ رو کر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ حسن گھروالوں کے اس سلوک پر ششدر رہے۔ مسرت، محل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محل، انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے ”مصلحتاً“ جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسنہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا وہ ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳  
تیسری قسط

صبح آٹھ بجے وہ مسجد کے گیٹ پر تھی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے رک کر بیلوں سے ڈھکے بنگلے کو دیکھا جس کا سنگی شیخ آج بھی ویران پڑا تھا۔

”بیا تمہارا صاحب ہے؟“ کچھ سوچ کر اس نے باوردی گارڈ کو مخاطب کیا۔

”وہ تو شہر سے باہر گیا ہے۔“

”کب آئے گا؟“

”معلوم نہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے ذرا سی ایڑی اونچی کر کے گیٹ کے پار دیکھا۔ ہمایوں کی گاڑی کھڑی تھی۔

”وہ۔۔۔ وہ بی بی اودہ جہاز پہ گیا ہے۔“ گارڈ قدرے گڑبلا۔

”بھاڑ میں گیا تمہارا صاحب میری طرف سے۔ اس سفید سر پہ جھوٹ تو نہ بولو، ہمیں ملنا چاہتا تو سیدھا منع کر دو۔ جھوٹ بولنا منافقت کی نشانی ہوتی ہے، ایمان کی نہیں۔ خدا کا خوف کرو۔“ وہ آخری فقرے قدرے نصیحت آمیز انداز میں کہتی اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ پتا نہیں ہمایوں نے اس کے لیے یہ کیوں کہہ رکھا تھا۔

(اور پتا نہیں میں نے صحیح کیا یا غلط۔ مگر وہ ایسے میری جائیداد کبھی نہیں دیں گے پھر اور کیا کرتی؟) بے زار سا تاثر چہرے پہ سجائے، بیگ اٹھائے وہ ست روی سے برآمدے کی طرف چل رہی تھی۔

(اور یہ جھوٹ تو نہیں، اس نے مجھے جس بے جا میں رکھا تھا۔)

اس نے چپل ریک پہ اتاری اور خود کو گھسیٹتی ہوئی نیچے بیڑھیاں اترنے لگی۔

(مگر اغوا تو نہیں کیا تھا، میں ادھر اپنی مرضی سے ہی گئی تھی تو اس پہ یوں اغوا کا الزام لگا دینا جھوٹ نہیں ہوگا؟)

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ زینے اتر رہی تھی۔

(نہیں، جھوٹ کہاں، اس نے ڈیل تو کی تھی، اغوا اور خریدنا ایک ہی بات ہے۔ اگر ذرا سا لفظوں کا ہیر پھیر کر دوں تو کیا ہے؟)

اس نے کرسی پہ بیٹھ کر کتابیں سائیڈ بورڈ پہ رکھیں، اور ساتھ بیٹھی لڑکی کے سپارے پہ جھانکا، اور پھر مطلوبہ صفحہ کھولنے لگی۔ تفسیر شروع ہو چکی تھی۔ وہ آج بھی لیٹ تھی۔

(فواد کے خلاف گواہی نہ بھی دوں تو بھی وہ سزا پائے گا، اور وہ اتنا بڑا اے ایس بی، کوئی میرے بیان سے اسے سزا تھوڑی ملے گی؟ بس لفظوں کو تھوڑا سا انٹر چینج کر دیا جائے تو کیا ہے، میری نیت تو صاف ہے) مطلوبہ صفحہ کھول کر اس نے پین کی کیپ اتاری اور آج کی تاریخ لکھنے لگی۔

”اور تم جھوٹ کو سچ کے ساتھ نہ ملاؤ، اور نہ تم سچ کو چھپاؤ حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔“

میڈم مصباح کی آواز پہ جیسے کرنٹ کھا کر اس نے سر اٹھایا۔ وہ اپنی نیچر چیر پہ بیٹھی کتاب سے پڑھ رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار اپنے سپارہ کو دیکھا۔ اس صفحے سب سے اوپر یہی لکھا تھا۔

”تم میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو، اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔ اور تم جھوٹ کو سچ سے نہ ملاؤ، اور نہ تم حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو۔“

وہ سن سی بے حد سبکت سی، پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ میڈم آگے پڑھ رہی تھیں مگر اسے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ ساری آوازیں جیسے بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ بنا پلک جھپکے ان ہی الفاظ کو دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا پھر تم عقل سے کام نہیں لیتے؟“

اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ ذرا دیر پہلے گارڈ کو کی گئی نصیحت اس کے گانوں میں گونجی۔ اسے لگا وہ کتاب اسے اس سے زیادہ جانتی ہے۔

(پھر۔۔۔ پھر۔۔۔ میں کیا کروں؟) اس کا دل کانپنے لگا تھا بے اختیار اس نے رسی تھامنا چاہی۔ کلام کی رسی وہ نہ جانتی تھی کہ دوسرے برے یہ کون ہے، مگر اسے یقین تھا کہ دوسرے برے پہ کوئی ضرور موجود



ہے۔  
”صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ بے شک وہ (نماز) سب پر بہت بھاری ہے، سوائے ان کے جو ڈرنے والے ہیں۔“

اس نے وحشت زدہ سی ہو کر سر اٹھایا۔ پنک اسکارف والے بہت سے سر اپنی کتابوں پہ جھکے تھے۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

اس نے پھر سے ان الفاظ کو پڑھا۔ وہ کوئی مضمون لکھی نہ تھی وہ گفتگو تھی۔ بات ”اومائی گاؤ“ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

It's talking to me

ساتھ بیٹھی لڑکی نے سر اٹھایا۔  
”تو یہ ٹاک ہی تو ہے۔ کلام۔ اس کو ہم کلام پاک اسی لیے تو کہتے ہیں۔“ وہ سادگی سے کہہ کر اپنے سپارے پہ جھک گئی۔

محمل نے سپارہ بند کر دیا اور کچھ بھی اٹھائے بنا تیزی سے بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔  
فرشتے اپنے آفس میں آئی تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”محمل تم؟“

”میں۔ میں آئندہ نہیں آؤں گی“ میں مدرسہ چھوڑ رہی ہوں۔“ وہ جو کرسی پہ بیٹھی تھی بے چینی سے کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور گھبراہٹ تھی۔ فرشتے نے آرام سے فائل میز پر رکھی اور کرسی کی دو سری جانب جگہ سنبھالی کھڑکی کے بلائینڈز بند تھے کمرے میں چھاؤں سی تھی۔

”آپ میری بات سن رہی ہیں؟“  
”بیٹھو۔“ وہ میز کی دراز کھول کر مجھکی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔ محمل بمشکل ضبط کرتی کرسی پہ کجا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ادھر سے بھاگ جائے۔

”میں نہیں آؤں گی آئندہ فرشتے! اس نے دہرایا۔ وہ ابھی تک دراز سے مصروف تھی۔  
”پھر کہاں جاؤ گی؟“

”بس قرآن چھوڑ رہی ہوں۔“  
”اسے چھوڑ کر کہاں جاؤ گی محمل!“ وہ کچھ کانڈرات نکال کر سیدھی ہوئی اور اسے دیکھا۔  
”ابنی نارمل لائف میں۔“

”تمہیں یہ اپنا نارمل لائف لگتی ہے؟“  
”یہ مجھ سے بات کرتی ہے فرشتے!“ وہ دبی دبی سی چیخی۔ ”آپ سمجھ نہیں سکتیں میں کتنے کرب سے گزر رہی ہوں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔“ آپ سمجھ نہیں سکتیں۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں جب قرآن مخاطب کرنے لگتا ہے تو سب اس کرب سے گزرتے ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا جو میرے ساتھ ہوا“ آپ تصور نہیں کر سکتیں۔“

”تمہیں لگتا ہے تم پہلی ہو؟“  
اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔

”ہم انسان ہی تو یہ بوجھ اٹھانے کے قابل ہیں پھر تم اتنی کمزور کیوں پڑ رہی ہو؟ ہم پہاڑ ہوتے تو نہ سہارہ سکتے۔ دب جاتے۔“

اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ فرشتے کو وہ لمحے بھر میں بہت بیمار لگی تھی۔  
”وہ میری سوچیں پڑھ رہی ہے فرشتے!“  
”وہ مخلوق نہیں ہے وہ کلام ہے۔ بات ہے اللہ کی بات اور اللہ ہی تو سوچیں پڑھ سکتا ہے۔“  
وہ گم صم سی ہو گئی۔

”میں۔ میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہی تھی؟“  
”تمہیں کوئی شک ہے؟“

”مگر۔ یہ چودہ سو سال پرانی کتاب ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ پاسٹ (ماضی) میں ہو کر ہم سے چودہ سو سال بعد کے فیوچر (مستقبل) سے خود کو کنیکٹ کر لے؟ اس لائیک اے میریکل۔“ (یہ تو معجزہ کی طرح ہے)

”یہی تو ہم اسے کہتے ہیں۔ معجزہ!“

”اور جب یہ ختم ہو جائے گی؟“  
”تو پھر سے شروع کر لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے قرآن کے معجزے بار بار دہرانے سے کبھی پرانے نہیں ہوں گے۔ فہما“ بتا رہی ہوں۔“

”میں۔ میں اسے چھوڑ دوں تو؟“  
فرشتے نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”محمل! جب روز قیامت اللہ زمین آسمان کو بلائے گا تو ہر چیز لپٹی چلی آئے گی طوعاً یا کرہاً“ خوشی سے یانا خوشی سے۔ جب ہم اللہ کے بلانے پر نماز اور قرآن کی طرف نہیں آتے تو اللہ ہمارے لیے ایسے حالات بنا دیتا ہے دنیا اتنی تنگ کر دیتا ہے کہ ہمیں زبردستی سخت ناخوشی کے عالم میں آنا پڑتا ہے اور پھر ہم کہہ بھی بھاگ کر آتے ہیں اور اس کے علاوہ ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اس کی طرف طوعاً آجاؤ محمل! ورنہ تمہیں کہا“ آنا پڑے گا۔“

پھر وہ مزید کوئی بحث نہ کر سکی۔

اسے فرشتے کی بات سے بے حد خوف آیا تھا۔ اسے لگا کہ اب کبھی قرآن چھوڑ نہ سکے گی۔

اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس ایک لفظ میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان چھپا ہے تو وہ اسے کبھی مس نہ کرتی اور نہیں تو اس کا مطلب لغت میں ہی تلاش کر لیتی مگر جانے کیسے وہ اس سے لکھنا نہ گیا تھا۔  
آج کار کو ع میڈم مصباح کے علاوہ ایک اور ٹیچر پڑھا رہی تھیں۔ میڈم ذکیہ آیات بنی اسرائیل کے ہیكل میں داخل ہونے کا قصہ بیان کر رہی تھیں۔

”اور دروازے میں داخل ہو جاؤ مسجد کرتے ہوئے اور کہو“ حطہ“ ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور عنقریب ہم محسنین کو زیادہ دیں گے۔“

وہ آیت پڑھ کر اب الفاظ کی گہرائی میں جا رہی تھیں۔ ”حطہ“ کا مطلب گناہ مراد گناہ گرانے یعنی بخشش مانگنے سے ہے اب بنی اسرائیل نے کیا یہ کہ انہوں نے جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے منہ میڑھا

کر کے بات کو بدل دیا وہ سجدہ کرتے یعنی جھک کر ”حطہ“ کہہ کر داخل ہونے کے بجائے حنطہ hinta tun کہہ کر داخل ہوئے۔ حنطہ کہتے ہیں۔“

وہ تیز تیز قلم چلا کر لکھ رہی تھی کہ کسی نے برہمی سے بین اس کے رجسٹر پہ رکھا۔ اس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔

ایک کلاس انچارج اس کے سر پہ کھڑی تھیں۔ ”بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان کے لیے دعا کرتا ہے اور بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پہ لعنت کرتا ہے۔“

”کیا ہوا میم؟“  
”آپ رجسٹر قرآن پہ رکھ کر لکھ رہی ہیں۔“ انچارج نے صدمے سے اسے دیکھا تو اس نے گھبرا کر قرآن نیچے سے نکالا۔ یہ اس کا تجوید کا قرآن تھا، سہیل آف وائٹ جلد والا۔

”سوری میم۔“ اس نے قرآن احتیاط سے ایک طرف رکھا اور رجسٹر پہ جھک گئی۔ پھر ادھر ادھر ساتھ والی لڑکی کے رجسٹر پہ جھانکا کہ دیکھ سکے کہ حنطہ کا کیا مطلب میڈم نے لکھوایا ہے مگر اس نے کچھ نہ لکھا تھا۔ قرآن کی کلاس تھی وہ بول نہ سکتی تھی سو مایوسی سے واپس اپنے نوٹس کو دیکھا۔ صفحے کی لائن یہاں ختم ہوتی تھی وہاں اس نے لکھ رکھا تھا ”حنطہ“ یعنی گند۔ گند کے وال کے آگے صفحہ ختم تھا۔

بعض دفعہ ہم میکا کی انداز میں کچھ لکھتے ہوئے جب صفحہ ختم ہو جائے تو آگے جو بھی چیز ہو بھلے نیچے رکھی ہوئی کتاب ہو یا ڈیسک کی لکڑی اس پہ لکھ ڈالتے ہیں اور بعد میں یاد ہی نہیں آتا۔

”گند اس کا مطلب ہے؟“ وہ اس ادھر سے لفظ یہ حیران ہوئی۔ کوئی سینس نہ بننا تھا مگر خیر وہ آگے لکھنے لگی۔ سوچا بعد میں کسی سے پوچھ لے گی مگر بعد میں یاد ہی نہ رہا۔

چھٹی کے وقت اس نے ہمایوں کو اپنے گیٹ کا دروازہ بند کرتے دیکھا وہ بک چڑھا کر پلٹا ہی تھا کہ وہ



سامنے آکھڑی ہوئی۔

پنک اسکارف میں مقید چہرہ کندھے پہ بیگ سفید یونیفارم اور سینے پہ ہاتھ باندھے وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ تبدیلی کیسے آئی؟“ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ غالباً ”اچھے موڈ میں تھا۔ محمل اسی طرح تیکھی سخت نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

”خیریت؟“ وہ دو قدم آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے سیاہ گیٹ کے باہر اس کا مستعد چوکیدار کن اکھیوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو آٹنے سامنے کھڑے تھے۔ ہمایوں جیپوں میں ہاتھ ڈالے اور وہ سخت تیوروں کے ساتھ سینے پہ بازو لپیٹے۔

”آپ کو مسئلہ کیا ہے فواد بھائی کے ساتھ؟“ ”شاطر مجرم کسی بھی پولیس آفیسر کے لیے چیلنج ہوتے ہیں اور مجھے چیلنج لینے میں مزا آتا ہے۔“ ”اس مزے میں اگر آپ الٹا پھنس گئے تو؟“ ”میں کیوں پھنسون گا؟ تم نے کورٹ میں مکر جانا ہے نا۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ میں مکر جاؤں گی؟“ ”کیا مطلب؟“ وہ ایک لخت چونکا۔ وہ اسی طرح اسے چبھتی نگاہوں سے دیکھتی واپس پٹی اور سینے پہ بازو لپیٹے سر جھکائے سڑک پر چل دی۔ عقل کے سارے راستے عجیب دھوئیں میں گم ہوتے تھے وہ کچھ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

\*\*\*

کتنے دنوں بعد آج وہ شام کی چائے سرو کرنے ٹرائی دھکیلاتی باہر لائی تھی سلاں میں سب بڑے یونہی بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کی خوش گپیاں تباوۃ خیال چل رہے تھے۔

”محمل میری چائے میں کینڈل ڈالنا بیٹا۔“ آغا جان جس بے تکلفی سے کہہ کر غفران چچا سے بات کرنے میں مصروف ہو گئے، ناعمہ اور فضا نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جب سے فواد جیل

گیا تھا، ان دونوں کا الامنس (اتحاد) تائی مہتاب سے ہٹ کر بن چکا تھا۔ دونوں کے خواب اسے دہا دینے کے چکنا چور ہو چکے تھے۔ اور وہ اب مزید تائی کی خوشامدیں کرنے کے بجائے انہیں بے رخی دکھانے لگی تھیں۔

”یہ بیچے آغا جان۔“ اس نے بھی پورے اعتماد سے کپ ان کو تھمایا اور پھر تائی مہتاب کو جو الگ سی گم صم سی بیٹھی تھیں۔

”تھینک یو محمل۔“ جانے انہوں نے کس دل سے بظاہر مسکرا کر کہا۔ فضا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ناعمہ کو ہلکا سا اشارہ کیا، ناعمہ نے ”ہونہہ“ کہہ کر سر جھٹکا۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ اچانک وہ اس پہ اتنے مہمان کیوں ہو رہے تھے۔

وہ خالی ٹرائی لیے اندر آئی تو سیڑھیوں سے اترتا حسن جو شرٹ کے کف بند کر رہا تھا اسے دیکھ کر لکھے بھر کورک گیا۔ ”محمل!“

ایک پرانا منظر اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا۔ فواد کا یوں اترنا پھر اس کا اسے چائے دینا اور وہ انگلیوں کا ٹکروانا۔ کیا تب فواد نے یہ سوچا تھا کہ یہ لڑکی بھی اس کا ہتھیار بن سکتی ہے۔ اتنی ارزاں تھی وہ؟

منظر وہی تھا، بس چہرہ بدل چکا تھا، اس کی آنکھوں میں کڑیاں سی چبھنے لگیں۔ ”مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا“ وہ تیزی سے پگن کی طرف آئی۔

”محمل رکو سنو۔“ وہ سرعت سے اس کے پیچھے لپکا۔ اور پگن کے دروازے پہ ٹھہر سا گیا۔

اندر مسرت کپڑے سے سلیب صاف کر رہی تھی، محمل ساتھ ہی کرسی پہ رخ موڑے بیٹھی تھی۔ اونچی بھوری پونی ٹیل جس سے اس کی لمبی گردن پیچھے سے جھکتی تھی اور کڑتے کے اور دوپٹے کو شانوں پہ ٹھیک سے پھیلائے، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے وہ چہرہ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے اس سائڈ پوز سے بھی حسن کو اس کی جھکی آنکھوں کا سوگوار سارنگ دکھائی دیا تھا، اسے لگا وہ بہت بدل گئی ہے۔

”محمل! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

مسرت کا سلیب کورگز تباہ تھا تو رک گیا، انہوں نے حیرت سے گردن موڑی۔

”حسن۔“

”چیچی! محمل کو کہیں ڈرامیری بات سن لے۔“ انہوں نے اسے دیکھا، جو بے تاثر سی لب بچھنے سر جھکائے کرسی پہ بیٹھی تھی۔

”محمل! حسن بلارہا ہے۔“

”میں ان کے باپ کی نوکر ہوں جو آؤں۔“ اس کا دل چاہا وہ یہ کہہ دے، مگر صبح ہی تو فرشتے نے اس سے کچھ کہا تھا۔

”محمل۔“ مسرت پھر پکارا۔

”انہیں جو کہنا ہے، نہیں کہہ لیں۔ منظور نہیں ہے تو بے شک نہ کہیں۔“ سر جھکائے نیل کو دیکھ رہی تھی۔ ایک قسم اس اترتی فخر میں اس نے کھائی تھی وہ قسم اسے اب آخری سانس تک نبھائی تھی۔

”محمل! تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟“ اس سانس کے سامنے آیا۔ ”وہ تمہیں فواد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ تم خود کو اس کیس میں مت الجھاؤ۔“ اس نے گردن اٹھائی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

محمل کا چہرہ بے تاثر تھا بالکل سبب۔ ”آپ نے کہہ لیا جو کہنا تھا؟ اب آپ جاسکتے ہیں۔“

اس نے آلوؤں کی ٹوکری قریب کھسکا کر میز سے چھری اٹھالی، وہ چند لمحے بے بس سانس دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ مسرت ابھی سی اس کے قریب آئیں۔

”کس کیس کی بات کر رہا ہے حسن؟“ ”آلو گوشت میں ہناوؤں کی، آپ فورم دیکھ لیجئے گا اور کھیر بھی، کیونکہ میں نہیں چاہتی کسی کو کوئی شکایت ہو۔“ وہ اب گن سی آلو چھیل رہی تھی۔

مسرت گہری سانس لے کر سلیب صاف کرنے لگیں۔ وہ جانتی تھیں اب وہ نہیں بتائے گی۔

اور وہ آلو چھیلے اس عجیب بات کو سوچ رہی تھی جو صبح اس کو فرشتے نے کہی تھی۔ جب وہ رشتے داروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی امتیاز پر کڑھ کر ترب گئی تھی اور پوچھا تھا کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں ان کے لیے کیا سزا بتائی گئی ہے۔

”یتیموں سے پہلے قرابت داروں کا ذکر ہے محمل۔“ ”میں اور میری ماں ان قرابت داروں کی جیسے خدمت کرتے ہیں، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”تو اس خدمت کا بھی ان کو احساس بھی دلایا؟“ ”ہاں تو ہر وقت جتنی رہتی ہیں، مگر میں ادھار رکھنے کی قائل نہیں ہوں، وہ ایک کہیں تو دس ستاتی ہوں، ایک ایک آئٹم گنوا تی ہوں جو بناؤں۔“

اس نے فخر سے کہا اور پھر فرشتے کا سنجیدہ چہرہ دیکھا تو لگا کچھ غلط کہہ دیا ہے۔ ”یعنی سب کیا کر لیا ملیا میٹ کر دیتی ہو، یہ تو ان پہ ظلم ہے۔“

”ظلم؟ میں ظلم کرتی ہوں ان پہ؟“ وہ شاکڈ رہ گئی۔ ”ظلم کی تعریف کیا ہوتی ہے؟ کسی کے حق میں کمی کرنا۔ ایک کی ایک سنا بنا برابر کا بدلہ ہے، مگر فواد پر سنا بنا زیادتی ہے، ان کے حق میں کمی ہے۔“

”وہ مجھے جو بول دیں اور میں آگے سے چپ کر جاؤں؟“ ”ایک بھی نہ سناؤں؟“ ”تم اگر سناؤ گی تو سب برابر کر دو گی، پھر تم ان کے کیے کا شکوہ کسی سے کرنے کی حق دار نہیں ہو گی۔“

معاف کر دیا کرو اور جانتی ہو۔ معاف کرنا کیا ہوتا ہے؟

اس کا سر خود بخود نفی میں مل گیا۔ ”اس کو دکھ نہ دینا جس نے آپ کو دکھ دیا ہو، ان کو ان کے رویے کا احساس تک نہ دلانا۔ کچھ نہ بتانا یہ معاف کرنا ہوتا ہے۔ تم معاف کر دیا کرو بھیر کیا کرو۔“

”ساری زندگی صبر ہی تو کیا ہے۔ میں نے۔“ ”وہ صبر نہیں ہوتا جو تم کرتی ہو۔ صبر وہ ہوتا ہے کہ اگر سر پہ بھاری پتھر بھی لگ جائے تو لبوں سے اف تک نہ نکلے صبر وہ ہوتا ہے جو تمہاری ماں کرتی ہے۔“



”اور احسان؟“

”صبر اور معاف کرنے کے بعد ان کے برے رویے کے جواب میں بہت اچھا رویہ دو۔“  
”میں کیوں کروں یہ سب۔ وہ کیوں نہیں کرتے؟  
رشتے داروں کے ساتھ ویسا ہی رویہ رکھنا چاہیے جیسا  
وہ ہمارے ساتھ رکھتے ہوں۔“  
”مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسا کرتے تھے  
کہ بدلے کی صلہ رحمی کرنے والا صلہ رحمی نہیں  
کرتا۔ اس پر تو آپ کو اجر ہی نہیں ملے گا۔ اجر تو تب  
ملے گا جب آپ برے کے جواب میں اچھا کریں۔ تم  
انہیں معاف کرو اور اپنا حق اللہ سے مانگو۔“  
”انہوں نے میری جائیداد کھائی ہے۔“ وہ چیخ مڑی  
تھی ”ابا! اپنی ساری پر اپنی میرے نام کر کے گئے  
تھے۔“

”بہت غلط کر کے گئے تھے پھر انہیں حق ہی نہیں  
تھا کہ ساری پر اپنی وصیت کرتے۔ ان کا حق تو بس  
ایک تہائی ہے تھا۔ اس کو بے شک تمہارے نام وصیت  
کر جاتے مگر باقی کے دو تہائی حصے کی شرعا تقسیم کی  
اجازت دے جاتے تو شاید تمہارے بچا لوگ اپنے  
حصے یہ قناعت کر لیتے۔ وارث تو اللہ نے بنائے ہیں۔  
جانے والے کو برا بھلا نہیں کہہ رہی مگر ایک غلط فیصلہ  
بہت سوں کی زندگیاں خراب کر دیتا ہے۔ محمل! تم کچھ  
لوگوں کے غلط فیصلوں کو بنیاد بنا کر اپنے رشتہ داروں پر  
ظلم کرو گی تو یہ مت بھولو کہ پل صراط پر رحم اور امانت  
کے کاٹنے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر خانہ اور قطع  
رحمی کرنے والے کو وہ پل سے نیچے جہنم میں گرا دیں  
گے اور ہر امانت دار اور صلہ رحمی کرنے والا پل پار کر  
جائے گا۔ تم وہ پل پار نہیں کرنا چاہتیں؟“  
وہ سر جھٹک کر تیز تیز آکو چھلنے لگی۔

☆ ☆ ☆

”میڈم مجھے ایک بات پوچھنا ہے؟“

”جی ضرور پوچھیے۔“

”وہ میم۔ مجھ سے نماز پڑھی نہیں جاتی، تو خیر

ہے؟“

”ہاں کیوں نہیں خیر ہے۔ اس اوکے، اگر آپ  
نہیں پڑھ سکتیں تو۔“ محمل کو لگا، منوں بوجھ اس  
کے کندھوں سے اتر گیا ہو۔ وہ ایک دم کسی قید سے  
آزاد ہوئی تھی۔

”وہی تو میم! میں باقی نیکیاں کر لوں، قرآن پڑھ  
لوں، ٹھیک ہے تا نماز پڑھنا بہت ضروری تو نہیں  
ہے؟“

”نہیں! اتنا ضروری تو نہیں ہے۔ اگر آپ نہیں  
پڑھنا چاہتیں تو نہ پڑھیں۔“

”میم! کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟“

”قطعاً! فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بالکل آپ کی اپنی  
مرضی پر ہے۔“

”اوکے۔“ وہ بے حد آسودہ سی مسکرائی۔ مگر

میڈم مصباح کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”یقین کریں محمل! کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسے

آپ بے شک نماز نہ پڑھیں، بے شک سجدہ نہ کریں۔

جو ہستیاں اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر  
نہیں کرتیں۔ اگر آپ کریں اسے کیا فرق پڑے گا؟

اس آسمان کا بلاشت بھر بھی حقہ خالی نہیں جہاں کوئی فرشتہ

سجدہ نہ کر رہا ہو۔ اور فرشتہ جانتی ہیں، کتنا بڑا ہو سکتا

ہے؟ جب اس پہاڑی پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

جبریل علیہ السلام کے پکارنے پر پلٹ کر دیکھا تھا، تو

جبریل علیہ السلام کا قد زمین سے آسمان تک تھا۔ اور

ان کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان نظر

نہیں آرہا تھا۔ ایسے ہوتے ہیں فرشتے۔ 70 ہزار

فرشتے کعبہ کا طواف کرتے ہیں یہ تعداد عام سی لگتی

ہے مگر جانتی ہو، جو 70 ہزار فرشتے روز طواف کرتے

ہیں ان کی باری پھر قیامت تک نہیں آئے گی۔ اس

رب کے پاس اتنی لاتعداد ہستیاں ہیں عبادت کرنے

کے لیے، آپ نماز نہ بھی پڑھیں تو اسے کیا فرق پڑے

گا؟“

میڈم مصباح جاچکی تھیں اور وہ دھواں دھواں

لکھا ہے۔“

ہے کے ساتھ کتابیں سینے سے لگائے ساکت سی  
لمڑی تھی۔ اس کو لگا، وہ اب کبھی نماز چھوڑ نہیں سکے

شام میں اس نے بہت اہتمام سے عصر پڑھی۔ پڑھ

کر لاؤنج میں فون اسٹینڈ کے ساتھ بیٹھی ہی تھی کہ

ادب کو فون کرے۔ ناعمہ چچی معاذ کو کان سے پکڑے

بے بس سی ڈانٹ رہی تھیں اور وہ کان چھڑا کر چھپاک

سے منہ چڑا تا بھاگ گیا تھا۔

”تتا شیطان ہو گیا ہے یہ لڑکا! کیا کروں میں اس

کا۔“ وہ کمر پہ ہاتھ رکھے پریشانی سے بولیں اور محمل کی

فون نمبر زبردیس کرتی انگلیاں تھم سی گئیں۔

”شیطان ہو گیا ہے یہ لڑکا!“ اس نے زیر لب

دہرایا۔

لفظ شیطان کا روٹ ورڈ کیا تھا؟ شین، طا، تون، شط

ن، شطن۔ یعنی رحمت سے دور، اللہ کی رحمت سے

دور، دھتکارا ہوا۔ اور گاڈ انہوں نے اپنے بچے کو اللہ کی

رحمت سے دور ہوا کہہ دیا؟“

”چچی!“ اس نے ہولے سے انہیں پکارا فون کا

ریسیور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ہاں؟“ ناعمہ چچی نے پریشانی سے چونک کر اسے

دیکھا۔

”معاذ کو شیطان تو نہ کہیں۔ چچی اللہ! نہ کرے وہ

شیطان ہو۔ شیطان تو اللہ کی رحمت سے دور ہونے کو

کہتے ہیں۔“

”اچھا اچھا۔ بس کرو، دو سیپارے کیا پڑھ لیے، اب

میں سکھا میں گی یہ۔ ہونہ ان کا تو قبلہ ہی بدل گیا

ہے۔“ وہ استنہا سہ کہتی باہر نکل گئیں اور وہ جہاں

تھی وہیں سن سی بیٹھی رہ گئی۔

”ان کا تو قبلہ ہی بدل گیا ہے۔“ وہ تکرار اس کے

اہن میں گونج رہی تھی۔

بہت پہلے ملنے والی وہ سیاہ فام لڑکی ایک دم اسے یاد

آئی تھی۔

”اس میں تمہارا ماضی ہے، حال ہے، اور مستقبل

☆ ☆ ☆

وہ سر جھٹکائے خاموشی سے برتن دھو کر ریک میں  
لگا رہی تھی۔ دھلی ہلیٹوں سے پانی کے قطرے ٹپ  
ٹپ گر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ ست روی سے کام  
کر رہے تھے۔ وہ کچن میں اکیلی تھی، اماں جانے کہاں  
تھیں۔ باقی لوگ تو کام کے وقت کچن میں آنا مزاج کے  
خلاف سمجھتے تھے، مگر خیر۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ اب  
کوشش کرتی تھی کہ ایسی سوچوں کو دل میں جگہ نہ  
دے۔ اب محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اپنے بد صورت  
رویے سے اپنے اور ان کے درمیان فرق نہ رکھا تھا،  
پہلے وہ ہر چیز اسی دنیا میں برابر کرنے پہ تلی تھی اب اس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم

ت 250 روپے مریم عزیز

تنگے پاؤں

ت 250 روپے نگہت سیما

منگوانی کا ہند

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی



نے صبر کرنا شروع کر دیا تھا۔

زندگی ویسے بھی اب ٹف ہو گئی تھی۔ اب مسجد کی ٹیچرز نے اسے دیر سے آنے پر الٹی میٹم دے دیا تھا وہ خود بھی اپنی تجوید درست کرنے فجر کے بعد آنا چاہتی تھی کہ تب لڑکیاں اکٹھی بیٹھ کر تجوید کی پریکٹس کرتی تھیں۔ صرف یہ مسئلہ تھا کہ فجر کے وقت قرآن لاک ہوتا تھا اس کے لاکھ کہنے پہ بھی کسی پہ اثر نہ ہوا تھا اس کے پاس اپنے ناشتے کے پیسے نہ تھے یا تو وہ ٹرانسپورٹ کا کرایہ ادا کرتی یا اپنا ناشتہ لاکر رکھتی سونا ناشتہ قربان کر کے اس نے وین والے کو فیس دی۔ اور روز صبح تہجد پڑھ کر وہ آدھے گھنٹے اپنا ہوم ورک کرتی پھر فجر پڑھ کر نکل جاتی۔ عصر کے قریب اس کی واپسی ہوتی۔ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے علم فقر و فاقے کے بغیر نہیں آتا ٹھیک ہی کہتے تھے۔

اس نے آخری پلیٹ ریک پہ رکھی ٹوٹی ہند کی اور ہاتھ خشک کرتی اپنے دھیان میں پٹی ہی تھی کہ بچن کے کھلے دروازے میں کسی کو کھڑا دیکھ کر ہنسی اور پھر دوسرے ہی بل ساکت رہ گئی۔

”کیسی ہو؟“ فواد سینے پہ ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ گنگ سی بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی۔ یہ کب واپس آیا؟

”تم مجھے بہت یاد آئیں! میں ایک بہت بڑی سازش کا نشانہ بنا ہوں۔“

”اماں۔ اماں۔“ وہ ایک دم بلند آواز میں پکارنے لگی۔ خون اٹنے لگا تھا اسے محسوس ہوا اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مسرت ہو کھلا کر اندر آئیں اور پھر فواد کو دیکھ کر چپ سی رہ گئیں۔

”فواد بیٹا تم؟“

”چاچی۔“ وہ ان کی طرف بے قراری سے پلٹا۔

”میرے ساتھ بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔ یہ سب اس اے ایس پی کا کیا دھرا ہے۔ میں بھلا حمل کے

ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟ حمل تم۔“ وہ اب اس کی جانب مڑا۔ ”تم جانتی ہو میں بے قصور ہوں۔ ریکارڈنگ جو انہوں نے تمہیں سنوائی وہ ان کے کسی فنکار کی تھی۔ ہم ان پولیس والوں کو بھستہ نہیں دیتے اس لیے انہوں نے ایسا کیا۔ تم یاد کرو ہم نے خود کہا تھا کہ تم سائن کروانے چلی جاتی ہو۔ میں نے اگر سودا کیا ہوتا تو میں تمہیں مجبور کرتا۔“

وہ ایک دم چونکی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مگر۔

”آپ نے۔ آپ نے مجھے یہ الزام لگایا کہ آپ نے مجھے رگتے ہاتھوں۔“ اس سے آگے بولا نہیں گیا۔

”وہ سب مجھے اے ایس پی نے رات کو کہا تھا کہ

میں تمہارے اور اس کے درمیان آنے کی کوشش نہ

کروں۔ بھلا بتاؤ میں ایسا کر سکتا ہوں پھر مجھے یقین

آئی گیا کہ تم جیسی باکدوار اور پارسلز کی ایسا نہیں

کر سکتی۔ میں پورے گھر کے سامنے تمہارے کردار کی

قسم کھانے کو تیار ہوں۔ چاچی! آپ میرا یقین

کریں۔“

وہ بے بس سادسرت کے پاس جھکا اور ان کے

دلوں ہاتھ پکڑ لیے۔

”یقین کریں میں نے کچھ نہیں کیا لیکن اگر آپ

سمجھتی ہیں کہ حمل میری وجہ سے بدنام ہوئی ہے تو میں

حمل سے شادی کرنے پہ تیار ہوں۔ آپ جب کہیں

آغا جان دھوم دھام سے حمل کو اپنی ہو بنائیں گے۔

آپ ہاں تو کریں۔ ایک دفعہ حمل سے میری شادی

ہو جائے پھر ہوئی کسی کو پورے خاندان میں ہمت کہ وہ

حمل پہ انگلی اٹھا سکے؟ ہم ہر وہ انگلی کاٹ دیں گے۔ اللہ

گواہ ہے چچی ہم ایسا کریں گے۔“

”فواد! تم سچ کہہ رہے ہو؟“ فرط جذبات سے

مسرت کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

وہ جو ساکت سی سلیب کا سہارا لیے کھڑی تھی

ایک دم بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا بس سر منہ لیٹے

پڑی رہی سب سے چل پھل کی آوازیں آرہی تھیں

۔ ہنسی مذاق باتیں شور، قہقہے دعوت کی طرح کاسیاں

تھا، اشتہا انگیز کھانوں کی مہک اس کے کمرے تک

آ رہی تھی مگر اس کا کسی چیز کے لیے دل نہ چاہ رہا تھا۔

وہ جیت لیٹی دیر تک چھت پہ گھومتے بچے کو دیکھتی

رہی تھی۔ تینوں پر گول گول گھوم رہے تھے۔ بار بار

ایک ہی مدار کے گرد چکر کاٹتے، آخر میں وہیں پہنچ

جاتے جہاں سے چلے تھے وہ بھی وہیں پہنچ گئی تھی۔



صبح پر شیر ہال کی کشادہ سفید سیڑھیاں وہ ننگے پاؤں

ست روی سے اتر رہی تھی۔ سفید شلوار قمیص کے

اوپر پنک اسکراف نفاست سے اوڑھے، ایک ہاتھ

رنگ پتھر رکھے، وہ جیسے پانی پہ چلتی غائب دماغی سے نیچے

آئی تھی۔

پر شیر ہال کے گلاس ڈور بند تھے۔ شیشوں کے پار

تازہ صبح اتر رہی تھی۔ اس کو آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ

رہا تھا وہ چپ چاپ اپنی جگہ پہ آئی۔ بیک ڈیسک رکھا

اور گرنے کے انداز میں بیٹھی۔

اگر کالج ہوتا تو یقیناً ”وہ آج نہ آتی“ اتنی ڈپر سسٹ

ہو گئی تھی کہ وہ پڑھ نہ سکتی تھی۔ مگر وہ کالج نہ تھا نہ ہی

وہ پڑھنے آئی تھی۔ وہ تو سننے آئی تھی۔

بعض چیزیں اتنی حیرت انگیز ہوتی ہیں کہ انسان ان

پہ حیران ہونا ترک کر دیتا ہے۔ معجزانہ کتاب بھی ایسی

ہی تھی عاجز کر دینے والی، مہسوت کر دینے والی۔ وہ جو

سوچتی تھی اس کتاب میں لکھا آجاتا تھا۔ اب حمل

نے حیران ہونا ترک کر دیا تھا۔ اسے لگا وہ اب بھی

حیران نہ ہو سکے گی مگر آج کی آیات پہ پھر وہ چونکی تھی۔

”اور لوگوں میں سے کوئی ہے“ اچھی لگتی ہے

تمہیں اس کی بات دنیا کی زندگی کے متعلق۔“ اس

نے سر گھٹنوں پہ رکھ دیا اور بازو گھٹنوں کی گرد پلیٹ

لیے۔

”اور وہ اپنی بات۔ اللہ کو گواہ بنانا ہے جبکہ

حقیقت میں وہ سخت جھگڑا لو ہے۔“

اس نے سر اٹھایا، چہرہ دائیں جانب گھمایا، پنک

اسکراف میں ہلوس لڑکیاں سر جھکائے تیزی سے قلم

پیسر پہ چلا رہی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس

کے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ

کیا محسوس کر رہی ہے۔

بس وہی جانتا تھا جس نے یہ کتاب اس کے لیے

اتاری تھی۔ اسے کبھی کبھی لگتا تھا یہ بس اسی کی کہانی

ہے، کسی اور کی سمجھ میں آئی نہیں سکتا۔

”اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے۔“

اس نے دونوں کپٹیوں کو انگلیوں سے سہلایا۔

”اچھی لگتی ہے تمہیں۔“

وہ آہستہ سے اٹھی، سپارہ بند کیا اور کچھ بھی لیے

بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

”اس کی بات۔“

”وہ دھیرے دھیرے ذینے چڑھ رہی تھی۔“

”دنیا کی زندگی کے متعلق۔“

وہ آخری زینہ عبور کر کے راہداری کی طرف

بڑھی۔

”اور وہ اپنی بات۔ اللہ کو گواہ بنانا ہے جبکہ

حقیقت میں وہ سخت جھگڑا لو ہے۔“ وہ تھکاوٹ سے باہر

برآمدے کے اسپیس پہ بیٹھ گئی۔ سامنے ہر ابھر الان

تھا۔ وہ ستون سے سر نکالے لان کے سبزے کو خالی خالی

آنکھوں سے دیکھے گئی۔

یہ تو اس نے اپنے دل سے بھی نہ کہا تھا کہ اسے فواد

کی بات اچھی لگی تھی۔ اس کی آفریقہ پر تھی دلکش

تھی۔ وہ اپنے دل سے اقرار کرنے سے ڈرتی تھی مگر وہ

تو ہر نگاہوں کی خیانت بھی جانتا ہے اس سے کیسے

چھپ سکتی تھی کوئی بات مگر اس نے اسے ڈانٹا

نہیں ڈیل نہیں کیا جیسے لوگ کرتے تھے اس کا تماشا

نہیں بنایا جیسے خاندان والے بناتے تھے۔ اس کی بات

سنی ان سنی نہیں کی جیسے نادیدہ کرتی تھی، کوئی ڈانٹ

ڈپٹ، لعین طعن نہیں۔ بس وہی ایک نرم مہربان انداز

جس کی تڑپ میں وہ قرآن سننے آئی تھی وہ ڈانٹا ہی تو

نہیں تھا اس کی طرح کوئی سمجھاتا ہی نہ تھا۔ کوئی اس

کی طرح تھا ہی نہیں۔



وہ وہیں بیٹھی تھی جب ساتھ ہی وہ لڑکی آئی۔ بیٹھی۔ غالباً ”مڈریک“ تھی۔ اور لڑکیاں اس میں بھی بیٹھ کر تجوید کرتی تھیں۔ وہ تھوڑی سی تلی تلی رکھے چہرہ موڑے یونی اسے دیکھے گی۔

وہ لڑکی گھٹنوں پہ قرآن رکھے بائیں ہاتھ سے صفحہ پلٹ رہی تھی دایاں ہاتھ یونی ایک طرف گرا رہا تھا۔ مطلوبہ صفحہ کھول کر اس نے بائیں ہاتھ سے گرے ہوئے ہاتھ کو اٹھایا اور گود میں رکھا پھر ٹھیک ہاتھ سے صفحہ کا کنارہ پکڑے پڑھنے لگی۔

”ان المسلمین والمسلمات۔“

وہ رک رک کر ایک ایک کر رہتی بار بار آواز ٹوٹ جاتی۔ وہ پھر سے شروع کرتی مگر کھلا ہٹ زدہ زبان پھر ساتھ چھوڑنے لگتی۔ خارج صحیح نہ نکل پاتے وہ بدوقت تمام ایک لفظ بولتی تو ساتھ ”گاں“ آواز بھی آتی۔

یکدم محمل کو احساس ہوا وہ رونے لگی تھی۔ اس کا مفلوج دایاں ہاتھ بار بار نیچے گر جاتا وہ بائیں ہاتھ سے اسے اٹھاتی پھر سے تجوید سے پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آنسو ابل کر گال پہ لڑھکنے لگے۔ وہ بائیں ہاتھ سے آنسو رگڑتی دبی دبی سسکیوں کے ساتھ پھر سے کوشش کرنے لگی۔

محمل گم صم صی اسے دیکھے گی۔ وہ اپنا لڑکی اپنے اللہ سے بات کر رہی تھی وہ اس کا بہت ہمدرد تھا اسے محمل کی ہمدردی کی اس وقت ضرورت نہ تھی لمحے بھر کو بھی اسے اس پہ ترس نہ آیا تھا بلکہ رشک ہوا تھا کوئی ایسے بھی تڑپ کر قرآن پڑھتا ہے جیسے وہ پڑھ رہی تھی؟ اور ایک ہم ہیں برسوں اس مصحف کو پلیٹ کر سب سے اونچے شایف میں سجائے رکھتے ہیں اور بس سجائے ہی رکھتے ہیں۔ وہ اسی طرح تھیلی تھوڑی تلی تلی جمائے گردن پوری اس کی طرف موڑے پلک جھپکے بنا اسے دیکھے جارہی تھی۔

وہ پھر سے ہکلاتی زبان سے پڑھنے لگی مگر ٹھیک پڑھنا نہ جا رہا تھا آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے

گر رہے تھے۔ دبی دبی سسکیوں کے درمیان وہ مسلسل استغفر اللہ کہتی جارہی تھی۔ عام سی شکل کی اپناج لڑکی۔ اسے بے اختیار وہ سیاہ فام لنگڑی لڑکی یاد آئی۔ وہ کتنوں کو سہارا دیے ہوئے تھا اور وہ کتنے بد نصیب ہوتے ہیں جو تلاوت کی آواز سن کر کان بند کر لیتے ہیں۔ کبھی میں بھی ان بد نصیبوں میں تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور سر جھکائے چل دی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی اپناج لڑکی اسی طرح رو رہی تھی۔

\*\*\*

وہ گیٹ بند کر کے اندر داخل ہوئی تو لان میں کرسیاں ڈالے تقریباً تمام کزنز بیٹھے تھے۔ فواد بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ کسی بات پہ ہنس رہا تھا شرٹ کا اوپری بٹن کھولے قیمتی رسٹ وائچ پہنے اس کے پریویم کی منگ یہاں تک آرہی تھی۔

وہ کرسیوں کا دائرہ بنا کر بیٹھے تھے یہ ندا تھی جو اس کی بات دلچسپی سے سن رہی تھی۔ جبکہ آرزو بھی اس دائرے میں لا تعلق سی بیٹھی تھی اور فائقہ بھی۔ رضیہ پچھو کی فائقہ۔ وہ بھی جیسے فواد سے احتراز برت رہی تھی۔ جیل جانے کے بعد بھلے تائی مہتاب جتنی تاویلیں پیش کرتیں فواد کی اہمیت اب وہ نہ رہی تھی۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے سر جھکائے تیز تیز چلنے لگی۔

”محمل!“ وہ برآمدے کے اسٹیمپ پہ تھی جب فواد نے بے اختیار پکارا۔ اس نے ایک پاؤں سیڑھی پہ رکھے گردن موڑی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”او بیٹھو۔“

”مجھے کام ہے۔“ روکھے تاثرات دے کر وہ برآمدے کا دروازہ پار کر گئی۔ لان میں بہت سی معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

”اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ یوں مجھے سب کے سامنے بلائے سبائی فٹ!“ وہ پیر پختی اندر آئی تھی۔ لاؤنج میں حسن نظر آیا تو ایک دم ٹھنک کر رکی پھر سر

جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

”محمل!“ اس کے قدم رک گئے مگر پلٹی نہیں۔

”تمہیں فواد کی ہر بات پہ یقین ہے؟“

”مجھے آپ پہ بھی یقین نہیں ہے۔“ اس کا گلا رندھ گیا تھا تیزی سے کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور پھر دھڑام سے اپنے پیچھے بند کیا۔

حسن نے تاسف و بے بسی سے چند لمحے ادھر دیکھا پھر ست روئی سے اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

\*\*\*

اس نے چپچہ ہلا کر چیلی کا ڈھکن بند کیا جھک کر چولہا قدرے آہستہ کیا اور واپس کتنگ بورڈ کی طرف آئی جہاں سلاوا کی سبز یوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سر جھکائے کھٹ کھٹ سبزیاں کاٹنے لگی۔

”ادھر ہو محمل!“ رضیہ پچھو نے اندر جھانکا۔

محمل نے سر اٹھایا۔ آج اس نے پونی نہیں باندھی تھی اور بھورے لمبے بال شانوں پہ گر رہے تھے۔ جنہیں اس نے کانوں کے پیچھے اڑس رکھا تھا۔

”جی پچھو؟“ وہ آہستہ سے گویا ہوئی یہ محمل کے اندر ایک واضح تبدیلی تھی وہ پہلے جیسی بد لحاظ نہ رہی تھی ورنہ پہلے تو اسے مخاطب کرتے ہوئے ڈر لگا کرتا تھا۔

”میں نے سوچا ذرا تمہاری کوئی مدد کروا دوں۔“

”مسترت کو تو بھابھی نے دوسرے کاموں پہ لگا رکھا ہے۔“

کوئی تنگ ہے بھلا؟ جب دیکھو بے چاری سے کام ہی کرواتی رہتی ہیں۔

”تو کوئی بات نہیں پچھو! ہمارا فرض ہے۔“ وہ نرمی سے مسکرا کر پھر سے سبزی کاٹنے لگی تھی۔

”یہ فواد رہا کب ہوا؟“ پچھو سامنے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے رازداری سے گویا ہوئیں۔

”معلوم نہیں۔“

”کب ہا۔“ بڑا ظلم کیا اس نے تمہارے ساتھ۔ میرا تو مانو اس کی شکل دیکھنے کا دل نہیں کرتا۔“

وہ سر جھکائے کھٹ کھٹ پیاز کاٹی جارہی تھی۔

”محمل!“ اس کے قدم رک گئے مگر پلٹی نہیں۔

”تمہیں فواد کی ہر بات پہ یقین ہے؟“

”مجھے آپ پہ بھی یقین نہیں ہے۔“ اس کا گلا رندھ گیا تھا تیزی سے کہہ کر اس نے دروازہ کھولا اور پھر دھڑام سے اپنے پیچھے بند کیا۔

حسن نے تاسف و بے بسی سے چند لمحے ادھر دیکھا پھر ست روئی سے اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس نے چپچہ ہلا کر چیلی کا ڈھکن بند کیا جھک کر چولہا قدرے آہستہ کیا اور واپس کتنگ بورڈ کی طرف آئی جہاں سلاوا کی سبز یوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سر جھکائے کھٹ کھٹ سبزیاں کاٹنے لگی۔

”ادھر ہو محمل!“ رضیہ پچھو نے اندر جھانکا۔

محمل نے سر اٹھایا۔ آج اس نے پونی نہیں باندھی تھی اور بھورے لمبے بال شانوں پہ گر رہے تھے۔ جنہیں اس نے کانوں کے پیچھے اڑس رکھا تھا۔

آنکھوں میں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

”بربادل تھا میرا اپنی فائقہ کے لیے۔ مگر دل ایسا ٹوٹا کہ ادھر آنے کو ہی نہیں چاہتا تھا کتنے چہرے لپکتے ہیں نالوگوں کے محمل!“

”جانے دیں پچھو انا اللہ پڑھ لیں۔ فائقہ باجی کو کتنی کم تھوڑی ہیں۔ وہ کسی اتھے بندے کے قابل ہیں۔“

اچھائی ہوا جو بھی ہوا۔

اسے پچھو کے آزرہ چہرے کو دیکھ کر دکھ ہوا تھا یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ یوں بات کر رہی تھیں ورنہ پہلے تو درمیان میں محمل نے اتنی دیواریں کھڑکی کر رکھی تھیں کہ انہیں پاٹنا مشکل تھا وہ اس کے لبا کی ایک ہی بہن تھیں۔ وہ کیوں لوگوں سے شکایت کرے؟ اس نے خود بھی تو کبھی بنا کر رکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔

”ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر۔“

اسی لمحے فواد نے کچن کا دروازہ کھولا۔ ان دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا محمل کے لب سختی سے بھینچ گئے تھے۔

وہ تیز تیز سبزی کاٹنے لگی۔

”محمل! ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“

”یہ فارغ نہیں ہے۔ اپنی بہنوں سے کہہ دو۔“

فارغ ہی بیٹھی تھیں باہر۔ پچھو نے نہایت بے رشتگی سے کہا وہ چند لمحے کھڑا رہا پھر واپس مڑ گیا۔

”ہو نہ، حکم دیکھو کیسے چلا رہا ہے۔ تم ذرا بھی اس کی نہ سنا کرو۔ میرے بھی کتنے خواب تھے ہمیں کوئی کمی تھوڑی ہے۔ فائقہ کے پیلا کے بزنس کا تو تمہیں پتا ہے کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ ان کی طرح یتیموں کا حال نہیں کھاتے۔“

”میں یتیم نہیں ہوں پچھو! میں بالغ ہوں، او۔ وہ بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہوتی۔“

وہ اب سلاوا میں کیوں نچوڑ رہی تھی۔

”ہاں ہاں تمہیں پتا ہے ابھی فائقہ کے پیلا سے ہیا گھر بنوایا ہے دوسرا گھر تو پھر سے فرنش کر کے فائقہ کو جینز میں دیں گے۔“

محمل کی کیوں نچوڑتی انگلیاں تھمیں۔ ایک خبیث



کے پیش نظر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

”پھپھو! اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔“ آپ کو مدد کی ضرورت ہوگی نا۔ گھر شفٹ کیا ہے۔ آپ اکیلے کیسے کریں گی سب؟ نوکروں پر بھروسہ کر رہی نہیں سکتے۔ میں آجاول آپ کے پاس ہلپ کروادوں گی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ پھپھو تو نہال ہو گئیں۔ ”میں تم سے کہنے ہی لگی تھی پھر سوچا تمہاری پرہیزی ہے۔“ (تو اسی لیے اتنا پیار جتا رہی تھیں خیر)

”کوئی بات نہیں، ویک اینڈ ہے، پھر آپ کی ہلپ بھی تو کرانی ہے نا۔“

اسے فواد سے دور رہنے کا یہی طریقہ نظر آیا تھا، پھپھو نے تو فوراً ”ہاں بھری۔ وہ جلدی سے اپنا بیگ تیار کرنے لگی۔“

تیار کیا تھی۔ دو جوڑے رکھے، چند ضروری چیزیں اور پھر قرآن رکھتے رکھتے وہ رہ گئی۔

”قرآن تو وہاں ترجمے والا مل ہی جائے گا، دودن کی تو بات ہے، اب ساتھ کیا رکھوں۔ کوئی بات نہیں۔“ اس نے بیک کی زپ بند کر دی۔

\*\*\*

پھپھو کا سامان شفٹ ہو گیا تھا، بس ڈیوں میں بند تھا۔ وہ جاتے ہی کام میں لگ گئی، قاتقہ تو لی وی میں ہی مگن تھی۔ ڈش بھی لگ گئی تھی اور وہ بہت شوق سے کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھپھو نے اس سے کچھ نہ کہا، محمل ہی ساری چیزیں نفاست سے سیٹ کرتی رہی۔

رات گیارہ بج گئے جب اس نے آج کے لیے بس کی۔ اور پھر نما کر نیا سوٹ پہنا۔ پھر نئے سرے سے وضو کیا اور دوپٹہ سر پہ لپیٹے وہ پھپھو کے پاس چلی آئی۔ ”پھپھو! آپ کے پاس ترجمے والا مصحف ہوگا؟“

”کیا ترجمے والا؟“ وہ اپنے کپڑوں کی الماری سیٹ کر رہی تھیں۔

”قرآن۔ قرآن ہوگا۔“ اس نے جلدی سے

وضاحت کی۔

”ترجمے والا تو۔۔۔ قاتقہ کی داوی کا تھا پچھلے گھر میں۔ مگر وہ کسی نے مانگ لیا تھا، ترجمے بغیر والا ہوگا۔“

”اچھا۔ چلیں۔ وہی دے دیں۔“

”کتابوں کے ڈبے سے نہیں نکلا؟“

”نہیں تو میں نے خود ساری کتابیں ادھر رکھی ہیں۔“

”پھر شاید کہیں مس پلین ہو گیا ہو، قاتقہ سے پوچھ لو۔“ وہ پھر سے کام میں مگن ہو گئیں۔

وہ بے دلی سے قاتقہ کے پاس آئی۔ ”قاتقہ باجی! آپ کے پاس قرآن ہوگا؟“

”میرے پاس؟ مجھے کیا کرنا ہے؟“ وہ الٹا حیران ہوئی۔ ”اماں سے پوچھو، ان کو ہی پتا ہوگا۔“

وہ مایوس سی خود ہی ڈھونڈنے لگی۔ کتابوں کے ریک کو پھر سے دیکھا، ایک ایک چیز چھان ماری، مگر قرآن نہ تھا نہ ملا۔

وہ اپنے کمرے میں آئی اور اپنا بیگ پھر سے کھولا۔ شاید کوئی مجرہ ہو جائے اور شاید اس نے قرآن رکھ دیا ہو، سارے کپڑے اور بچے کیسے مگر وہ ہوتا تو ملتا۔

وہ پھر سے لاؤنج میں گئی۔ ”قاتقہ باجی! آپ کے پاس کوئی کیسٹ ہوگی تلاوت کی؟“

”نہیں! قاتقہ نے لا پرواہی سے شانے جھٹکے۔ ”کوئی چینل ہوگا جس پر تلاوت آتی ہو؟“

”تنگ مت کرو محمل، میں سووی دیکھ رہی ہوں۔“

وہ آکتا کر رخ پورائی وی کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی۔ محمل تھکے تھکے قدموں سے واپس آئی اور پھر بیڈ پر گر کر نہ جانے کیوں رونے لگی تھی۔

رات وہ بے چین سی نیند سوئی۔ اگلا سارا دن کام کرواتے وہ مغموم، بے چین رہی، کھانے کے بھی چند لقمے لے سکی۔ اس سے کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔

ہفتے اور اتوار کے وہ دودن اس کی زندگی کے جیسے بد ترین دن تھے اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے اور اپنا قرآن تھام لے۔ کوئی ایسا اتفاق تھا کہ

رضیہ پھپھو کا ڈرائیور چھٹی پہ چلا گیا، وہ اب ان کے میاں نفیس انکل سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ گھر سے بھی کوئی نہیں دے کر جائے گا، وہ جانتی تھی۔

اللہ اللہ کر کے اتوار کی رات گھر سے گاڑی اسے لینے آئی۔

پھر جس لمحے وہ گھر میں داخل ہوئی بجائے کہیں اور جانے کے بجائے کسی سے ملنے کے وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی، شیفٹ پہ بیک ایک طرف ڈالا اور

شیفٹ پر سے قرآن اٹھا کر سینے سے لگا لیا، اسے لگا اب وہ زندگی بھر قرآن کے بغیر کہیں نہیں جاسکے گی۔ لوگ چالی بڑھ اور موبائل کے لیے آتے ہیں قرآن کے لیے کوئی واپس نہیں آتا نہ جانے کیوں۔

”محمل! اماں پکارتی ہوئی آئیں، تو اس نے آنسو خشک کیے اور اپنے مصحف کو احتیاط سے شیفٹ پہ رکھا۔“

”محمل۔ یہ لو۔“ اماں نے دروازہ کھولا اور ایک خط کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ”تمہاری ڈاک آئی تھی کل۔“

”میری ڈاک؟“ اس نے حیرت سے لفافہ کھولا۔ مسرت جلدی میں انھیں لفافہ دے کر پلٹ گئیں۔

اس نے الجھتے ہوئے لفافہ چاک کیا اور اندر موجود کاغذات نکالے۔

وہ اسکا لرشپ تھا جو اس کو دیا گیا تھا۔ انگلینڈ میں اعلا تعلیم کا اسکا لرشپ۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

\*\*\*

”محمل۔ تمہاری ڈاک آئی تھی۔ کیا یہ وہ اسکا لرشپ تھا؟“

کھانے کی میز پر آغا جان نے پوچھا تو یکدم سناٹا چھا گیا۔ محمل نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ سب ہاتھ روکے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”جی۔“ اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی سنائی

دی۔ خوشی یا جوش سے خالی آواز۔

”ہوں۔ تو کلاسز کب اشارت ہوں گی؟“ آغا جان بات کرنے کے ساتھ ساتھ چمچ کاٹنا پلیٹ میں کھڑکا رہے تھے۔ باقی سب دم سیاہے محمل کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑی خبر تھی۔

”ستمبر میں۔“

”تمام اخراجات وہی اٹھائیں گے؟“

”جی۔“ وہ بھی جواب دینے کے ساتھ ساتھ کھانے لگی تھی۔ ڈائمنگ ہال میں اب اس کے چمچے کی آواز بھی آرہی تھی۔

”ویری گڈ۔“

”انگلینڈ میں؟“

”اسکا لرشپ؟“

”محمل انگلینڈ چلی جائے گی؟“

سرگوسیاں چہ گوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے سر جھکائے خاموشی سے کھانا ختم کیا، پھر کرسی دھکیل کر انھی اور بنا کچھ کئے ڈائمنگ ہال سے چلی گئی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ خوش تھی، یا نا خوش۔ اسے ایک نئی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا تھا، اسے خوش ہونا چاہیے۔ لیکن پھر یہ ناخوشی؟ دل ڈوبنے کا یہ احساس؟ شاید یہ اس لیے تھا کہ اس صورت میں اسے علم الکتاب اور مسجد چھوڑنی پڑے گی۔ قرآن کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن وہ تو

میں بعد میں بھی کر سکتی ہوں۔ انگلینڈ جانے کا موقع بعد میں نہیں ملے گا۔

ان ہی سوچوں میں گم نیند نے اسے آیا۔

\*\*\*

صبح کلاس میں سید پارہ کھولتے وقت اسے امید تھی کہ آج کے سبق میں اس کے اسکا لرشپ کے بعد کے خیالات کے متعلق آیات ضرور آجائیں گی، لیکن

آج کی آیات سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے کسی قدم قصے کی تھیں۔

\*\*\*

\*\*\*

\*\*\*

\*\*\*

\*\*\*



یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ اسے اس کا جواب نہیں مل رہا تھا اور وہ واقعہ جو بیان کیا جا رہا تھا وہ بھی قدرے ناقابل فہم تھا۔ بلکہ تھا نہیں اسے لگا تھا۔ وہ اس کا لڑشپ بھلا کر اس واقعے میں ہی الجھ گئی۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ جب طالوت کا لشکر جالوت سے مقابلے کے لیے نکلا تو راستے میں آنے والی ایک نہر میں ان کے لیے آزمائش ڈال دی گئی۔ اللہ نے اس نہر کے پانی کو سوائے ایک چلو کے پینے سے منع کیا تو جو لوگ پانی پینے گئے وہ نہر پر بیٹھے رہ گئے اور جنہوں نے چلو سے زیادہ نہ پیا وہ آگے نکل گئے اور انہی میں حضرت داؤد علیہ السلام تھے جنہوں نے جالوت کو قتل کر کے اس کو اپنے انجام تک پہنچایا۔

پوری تفسیر سن کر بھی اسے نہ سمجھ آیا کہ بھلا نہر کا پانی کیوں نہیں پینا تھا؟ پانی تو حرام نہیں ہوتا پھر کیوں؟ وہ بورا دن بھی سوچ رہی تھی یہاں تک کہ رات جب بیٹھالینے کچن میں آئی تو بھی یہی سوچ رہی تھی۔ کچن خالی تھا اس نے فریزر کا ڈسکن کھولا سوٹ ڈش کے ڈونگے نکالے ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھائے باہر آئی۔

”پھر جب طالوت اپنے لشکروں کے ساتھ جدا ہوا۔“

وہ ٹرے اٹھائے ڈاننگ ہال میں آئی۔ اونچی پونی جھکے سر سے اور اٹھ جاتی تھی۔ کندھوں پہ پھیلا یا دوپٹہ اور شفاف چہرے پہ سنجیدگی لیے اس نے ٹرے نیبل پر رکھی۔ سب وقفے وقفے سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ متاثر، جکڑے نگاہیں۔

”اس نے کہا بے شک اللہ تم کو آزمانے والا ہے ایک نہر کے ساتھ۔“

وہ خاموشی سے ٹرے سے ڈونگے نکال رہی تھی۔ پہلا ڈونگا اس نے آغا جان کے سامنے رکھا۔

”تو جو کوئی اس نہر سے پیے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔“

دوسرا ڈونگا دونوں ہاتھوں میں ہی اٹھا کر اس نے نیبل کے وسط میں رکھا۔

”اور جو کوئی اس نہر سے نہ پیے گا سوائے اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پینے کے وہ بے شک مجھ میں سے ہے۔“

اس نے آخری ڈونگا نیبل کے آخری سرے پہ رکھا اور واپس اپنی کرسی پہ آئی۔

”تو سوائے چند ایک کے انہوں نے اس (نہر میں) سے پی لیا۔“

سب سوئیٹ ڈش شروع کر چکے تھے۔ شیشے کے پیالوں اور چمچوں کے ٹکرانے کی آوازیں وقفے وقفے سے آرہی تھیں ان آوازوں کے درمیان وہ مدھم مدھم آواز بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ تو ابھی تک دور کہیں اس آواز میں کھولی تھی۔

”تو سوائے چند ایک کے انہوں نے اس میں سے پی لیا۔“

اس نے پیالہ آگے کیا اور تھوڑی سی کھیر اپنے پیالے میں ڈالی۔

”تو سوائے چند ایک کے انہوں نے اس میں سے پی لیا۔“

وہ اب آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے چمچ لے رہی تھی۔

”تو جنہیں کب تک جانا ہو گا حمل؟“

آغا جان نے پوچھا تو یکدم پھر سے ہال میں سناٹا چھایا۔ چمچوں کی آواز رک گئی۔ بہت سی گردنیں اس کی طرف مڑیں۔ اس نے سر اٹھایا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

”گست کے اینڈ تک“

”یعنی تم ستمبر سے پہلے تک نہیں ہوگی۔“

”نہیں!“

”کیا مطلب؟“ آغا جان چونکے۔

”میں نہیں جا رہی۔“ اس نے چمچ واپس پیالے میں رکھا اور نہیکن سے لب صاف کیے۔

”کیا مطلب؟“

”تم اتنا بڑا اس کا لڑشپ چھوڑ دو گی؟“ قصہ چچی نے تحیر سے کہا تھا۔

”میں چھوڑ چکی ہوں۔“

”مگر تم کیوں؟“

وہ نہیکن ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیونکہ ہر جگہ رکنے کے لیے نہیں ہوتی۔ اگر میں نے اس نہر سے پانی پی لیا تو میں ساری عمر اسی پہ بیٹھی رہ جاؤں گی اور طالوت کا لشکر دور نکل جائے گا۔ بعض حلال چیزیں کسی خاص وقت میں حرام ہو جاتی ہیں اگر اس وقت آپ اپنے نفس کو ترجیح دیں تو خیر کا کام کرنے والے لوگ دور نکل جاتے ہیں۔ میں نہر پہ ساری عمر بیٹھی نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے وہ داؤد بننا ہے جو جالوت کو مار سکے۔“

وہ سوچ کر رہ گئی اور کہا تو بس اتنا۔

”مجھے ابھی قرآن پڑھنا ہے۔“ اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

شام کی ٹھنڈی ہوا اپنی لے پہ بہہ رہی تھی۔ وہ چائے کا کپ لیے ٹیرس پہ کرسی ڈالے دور آسمان کو دیکھ رہی تھی جہاں شام کے پرندے اپنے گھروں کو اڑتے جا رہے تھے۔

ٹیرس سے سامنے والوں کا گھر نظر آتا تھا۔ ان ہی بریگیڈیئر صاحب کا گھر جن کی قرآن خوانی ایک روز اس نے دیکھی تھی۔ قرآن کو بھی پتا نہیں ہم لوگوں نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

اس نے کسی خیال کے تحت کپ سائیڈ پہ رکھا اور اٹھی۔ ابھی مڑی ہی تھی کہ سامنے فواد کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

وہ اندر کھلنے والے دروازے میں کھڑا تھا سینے پہ ہاتھ باندھے لب بھیچے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم مجھ سے کتنا پی پھر رہی ہو۔ حالانکہ تم جانتی ہو میرا قصور نہیں ہے۔“ وہ چپ رہی۔

”کل دوپہر تین بجے میں اسٹاپ پہ تمہارا انتظار کروں گا مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ آئی ہو پ کہ تم ضرور میری بات سننے آؤ گی۔“ وہ کہہ کر

ایک طرف ہو گیا۔ حمل کا رستہ کھل گیا۔ وہ بنا اسے دیکھے تیزی سے وہیں پار کر گئی۔

ایک قسم تھی جو اس نے کھالی تھی وہ اسے توڑ نہیں سکتی تھی اور اس لمحے سیڑھیاں اترتے اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس قسم کے بوجھ سے اب نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اب اس سے وہ قسم نبھائی نہیں جا رہی۔ بس اگر ایک دفعہ وہ فواد سے باہر ملے تو کیا ہو جائے گا؟ بس ایک دفعہ کل دوپہر تین بجے نہیں میں قسم نہیں توڑوں گی اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ اس کے اندر کی سوچیں اس وحشت زدہ کرنے لگی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا وہ ٹیرس سے بھلا کیوں نیچے آنے لگی تھی؟ اور ہاں وہ قرآن خوانی والا گھر وہ کچھ سوچ کر گھر سے باہر آئی۔

ساتھ والا بنگلہ بیلوں سے ڈھکا خوب صورت بنگلہ تھا اس نے گیٹ کے ساتھ نصب تیل پہ ہاتھ رکھا دوپٹہ شال کی طرح کندھوں کے گرد لپیٹے اونچی کسی ہوئی پونی تیل ادھر ادھر بھٹاتی وہ ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

قدیموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر گیٹ کھلا۔ اسی ملازم کی شکل سامنے آئی۔

”جی؟“

”بریگیڈیئر صاحب گھر پہ ہیں؟“

”نہیں، آپ کون؟“

”میں حمل ابراہیم ہوں ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں آغا ہاؤس میں۔ یہ کچھ پمفلٹس ہیں بریگیڈیئر صاحب کو دے دینا وہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں میں ان سے واپس لینے ضرور آؤں گی۔ یہ ذمہ داری میں نہیں دے رہی ہوں اور ذمہ داری امانت ہوئی ہے۔ اگر امانت میں خیانت کی تو پل صراط پار نہیں کر سکو گے سمجھے؟“

چند پمفلٹس اور کارڈز اسے تھا کر اس نے تنبیہ کی تو ملازم نے گھبرا کر ”چھاجی“ کہہ کر سر اندر کر لیا۔





THE VITAMIN COMPANY  
NATURAL | MADE IN USA  
www.thevitamincompany.net

# Your Beauty Range...

## Scan & FIAZ App Friends Ke

Available at all leading medical, cosmetic & super stores.

HELPLINE & FREE HOME DELIVERY: 0800-00-111 & 0321/0300/0332/0345/0313 [8490075]

”ارے نہیں، مجھے تو آج کی آیات کا بھی نہیں پتہ“  
میڈم مصباح لیتی ہیں آج کل آپ کی کلاسز؟“  
”پھر آپ کو کیسے پتہ کہ...“  
”کیونکہ یہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ تفسیر کا ورثہ کرلو، تمہارا مسئلہ کلیر کر لفظوں میں آجائے گا۔“ اس نے فائل کا صفحہ پلٹا اور سرسری سا اوپر نیچے دیکھنے لگی۔  
”مگر میں نے آج کی آیات پڑھ لی ہیں، ان میں میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے۔“  
”صبر لو! اے علم صبر کے ساتھ آتا ہے، تفسیر کے بعد پوچھ لینا مگر اس کی یقیناً ”نویت“ نہیں آئے گی۔“ وہ ہلکا سا اس کا گلہ تھپتھپا کر فائل دیکھتی آگے بڑھ گئی۔  
محمل نے اپنے گل کو چھوا، پھر سر جھٹک کر کارڈ بورڈ میں آگے بھاگ گئی۔

یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ جو سوچے، وہ قرآن میں لکھا ہوا نہ آئے۔ لوگ اس کی بات نہیں سنتے تھے۔ سنتے تھے تو توجہ نہیں کرتے، اگر توجہ بھی کرتے تو سمجھتے نہیں، اور ایک قرآن تھا، اسے کہنا بھی نہ پڑتا اور وہ دل کی بات دھیان سے سنتا، توجہ کرتا، سمجھتا، اور پھر دانائی اور حکمت سے اسے سمجھاتا تھا، اور اس جیسا کوئی نہ سمجھاتا تھا۔

مگر اسے لگا آج کی آیات میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اس سے متعلق ہو۔

بہت بے دلی اور جھج سے اس نے سپارہ کھولا۔ وہ سفید چادر پہ دوزانو ہو کر بیٹھی تھی، سامنے ڈیسک پہ سپارہ کھلا پڑا تھا، ایک طرف رجسٹر تھا جس پہ جھکی وہ تیز تیز لکھ رہی تھی۔

اب میڈم مصباح محکم آیات اور مشابہ آیات کا مطلب سمجھا رہی تھیں۔

محکمات وہ آیات تھیں جن کا مطلب ہم سمجھ سکتے ہیں، مثلاً ”احکامات“ اس دنیا کی باتیں، دنیا کے کسی باغ کی مثال، تاریخی واقعات اور مشابہات وہ آیات تھیں جو ہم تصور نہیں کر سکتے، مگر ان پہ ایمان بالغیب لانا ضروری ہے مثلاً ”جنت“، ”دوزخ“ اللہ کا ہاتھ، فرشتوں کی بیست۔ مشابہات کے پیچھے نہیں پڑنا

وہ شام، وہ رات اور وہ اگلی صبح بہت کٹھن تھی۔ وہ لمحے بھر کو بھی سو نہ سکی تھی۔ ساری رات بستر پہ کروٹیں بدلتے گزری۔ مستقبل بہت سے اندیشوں کی دھند میں لپٹا نظر آتا تھا۔ وہ کیا کرے کس سے مشورہ کرے، کس سے پوچھے؟

اور جواب تو اسے سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب صبح کے قریب اس نے قسم توڑنے کا سوچا تو بستر سے نکلی اور معاملہ اللہ پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔  
کل ان کی کلاس میں سورۃ بقرہ ختم ہوئی تھی، اور آج آل عمران شروع ہونا تھی۔ غالباً ”پہلی گیارہ آیات پڑھنی تھیں۔ اسے پکا یقین تھا کہ کوئی حل آج کے سبق میں موجود ہوگا۔ سو اس نے آج کی آیات کھولیں۔

پھر ان تمام آیات کو اس نے دو تین دفعہ پڑھا۔ دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی۔ وہاں کوئی ذکر نہ تھا۔ نہ قسم کا، نہ قسم توڑنے کے کفارہ کا۔  
”کفارہ؟“ وہ چونکی۔ ”تو کیا میں قسم توڑنا چاہتی ہوں؟“

”ہاں!“ دل نے واضح جواب دیا تو اس نے خود سے نگاہیں چر کر مصحف بند کیا اور اوپر رکھ دیا۔  
فرشتے ایک فائل پہ سرسری نگاہ ڈالتے کارڈ بورڈ میں سے گزر رہی تھی جب وہ پھولی سانس کے تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔

”فرشتے! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے؟“  
فائل کا صفحہ کے کنارہ فرشتے کی انگلیوں کے درمیان تھا اس نے سر اٹھایا۔

”السلام علیکم! کیا بات ہے؟“  
”وعلیکم السلام۔“ وہ پھولی سانسوں کے درمیان تیز تیز بول رہی تھی۔ ”وہ ایک فتویٰ لیتا ہے۔“

”میں مفتی نہیں ہوں۔“  
”مگر بس ایک فقہی مسئلہ ہے۔“  
”ضرور پوچھنا مگر آج کی تفسیر سن لو، اس میں ہے تمہارا مسئلہ۔“ محمل کو جھکا لگا۔  
”آپ کو میرے مسئلے کا پتہ ہے؟“



چاہیے۔ اور جو پڑے، اس سے دور رہنا چاہیے۔ میڈم مصباح بھی سمجھا رہی تھیں۔ ست روی سے تمام پوائنٹس رجسٹر لکھ رہی تھی۔

”تشابہات پہ ایمان بالغیب ایسا ہونا چاہیے جسے۔“ میڈم کی آواز ہال میں گونج رہی تھی ”جیسے اگلی آیات میں ذکر ہے کہ راسخون فی العلم ان پہ ایمان لاتے ہیں۔ اب یہ راسخون فی العلم کون ہوتے ہیں؟ ایک ہونا ہے طالب علم ایک صاحب علم اور اس سے بڑا درجہ راسخ علم والے کو ہوتا ہے۔ یہ کون لوگ ہوتے ہیں؟ ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ راسخون فی العلم کون ہوتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔“  
محمل کے ہاتھ سے پین کر پڑا۔ سیاہی کے چند چھینے چادر کو بھگو گئے۔  
میڈم آگے بھی کہہ رہی تھیں ”جن کے دل مستقیم ہوں۔“

مگر وہ یک ٹک پھٹی پھٹی نگاہوں سے سیپارے پہ لکھے ”راسخون فی العلم“ کے الفاظ کو دیکھ کر جا رہی تھی۔ ایک ہی حکمران اس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔

”وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔“  
وہ بس سکتہ کی کیفیت میں سیپارے کو دیکھ رہی تھی۔

”راسخون فی العلم“ سیپارے کے الفاظ دھندلا گئے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔

صدیوں پہلے عرب کے صحراؤں میں کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ پختہ علم والے کون ہوتے ہیں۔ اور تب انہوں نے بتایا تھا کہ وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔ اسے لگا صدیوں پہلے کی کئی بات کسی اور کے لیے نہیں، صرف اس کے لیے تھی۔ وہ انگلیوں کے پوروں سے ان تین الفاظ کو بار بار چھو رہی تھی، انہیں محسوس کر رہی تھی۔ آنسو اس

کے گالوں سے لڑھک کر گردن پہ پھسل رہے تھے۔  
”ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ قسم کھانا ناپسندیدہ تھا، لیکن اب وہ اسے ہمیشہ نبھاتی تھی۔ اور جانتی تھی کہ یہی اس کے لیے بہتر تھا۔

اس روز وہ تین بجے سے پہلے ہی گھر آگئی تھی۔

\*\*\*

وہ صبح بہت زرد سی طلوع ہوئی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی۔ آج اس نے اونچی پونی کے بجائے سادہ سی چوٹی بنائی تھی۔ شفاف چہرے پہ ذرا سی پشیمانی چھائی تھی۔ وہ چند لمحے خود کو دیکھتی رہی، پھر سیاہ چادر سر پہ رکھی، اور ٹھوڑی تک لپیٹ کر بیکل دوسرے کدھے پہ ڈالی۔ آج اسے گواہی دینی تھی۔ فوار کے خلاف یا اپنے خلاف۔

لاؤنج میں تینوں بچا انتظار کر رہے تھے۔ کلف لگے سفید شلوار قمیض میں آغا جان کمر پہ ہاتھ باندھے ادھر ادھر بے چینی سے نہل رہے تھے۔ اسے راہداری سے آتے دیکھا تو رک گئے۔  
”چلیں۔“ وہ سیاٹ چہرہ لیے ان کو دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر باہر نکلی۔ وہ سب اکٹھے باہر نکلے۔

گیٹ کھلا کیے بعد دیگرے دونوں گاڑیاں پورچ سے باہر سڑک پہ رواں دواں تھیں۔ اس اونچے گھر کی بہت سی کھڑکیوں میں بہت سی عورتیں ان کو جاتے دیکھ رہی تھیں۔ گاڑیاں گم ہو گئیں تو لڑکیوں نے پردے چھوڑ دیے۔

زرد سی راہداری میں وہ سمٹی سمنائی نگاہیں نیچی کیے آغا جان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ادھر ادھر پولیس والے وکلاء اور کتنے ہی لوگ گزر رہے تھے۔ بہت وحشت ناک سی جگہ تھی وہ۔ اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ بس لمحے بھر کو اس نے چہرہ اوپر کیا تو کارڈیور کے اختتام پہ وہ کھڑا تھا، اپنے کسی سپاہی کو اکھڑتے تیور لیے غصے سے کچھ کہتا یونیفارم میں ملبوس

سر پہ کیپ۔ وہ بہت وجہ تھا۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ محمل کو اس پہ غصہ نہیں آیا تھا۔ اسے ان تمام لوگوں میں ایک وہی اپنا ہمدرد لگا تھا۔

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ کارڈیور کے موڑ کے قریب ہی تھی جب ہمایوں کی نگاہ اس پہ پڑی اور وہ ٹھہر گیا۔ آغا کریم کے بائیں کدھے کے پیچھے چھپی ہوئی گردن جھکائے آئی، سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی جس کے چہرے پہ زمانوں کی ٹھکن رقم تھی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ اس کے قریب سے سر جھکائے گزر گئی۔

ہاں آغا کریم نے ایک متنفر نگاہ اس پہ ضرور ڈالی تھی۔

وہ اب گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کی آنکھیں دیکھنا چاہتا تھا۔ انہیں پرھنا چاہتا تھا۔ کارڈیور کے درمیان میں یکدم اس کالی چادر والی لڑکی نے گردن پیچھے کو موڑی۔ دونوں کی نگاہیں لمحے بھر کو ملیں، اسے محمل کی آنکھوں میں زمانوں کی ٹھکن دکھی تھی۔ پھر اس نے چہرہ موڑ لیا اور اسی طرح سر جھکائے اپنے چچاؤں کے ترغے میں آگے چلتی گئی۔

مگر عدالت میں وہ قطار کی بائیں نشست پر صوب سے پیچھے بیٹھی تھی۔ آغا جان اس کے دائیں طرف تھے۔ اس کے بائیں جانب کچھ نہ تھا، قطار خالی تھی۔ وہ سر جھکائے ساری کارروائی سنتی رہی۔ اس سے نظر تک نہ اٹھاتی جاتی تھی۔ یوں جیسے ہر کوئی اسے ہی دیکھ رہا ہو۔

اور پھر ایک ساعت کو جیسے ہی اس نے سر اٹھایا۔ وہ دوسرے اسٹینڈ میں بیٹھا گردن ترچھی کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہمایوں کی نگاہوں میں سوال تھا۔ ”جستے ہوئے“ بریشان کن سوال۔ اس سے زیادہ دیر دیکھنا نہ گیا۔ وہ گردن موڑ کر آغا جان کو دیکھنے لگی جو لب بلبہنے وکلاء کے دلائل سن رہے تھے۔ نگاہوں کے ارتکاز پہ چونک کر محمل کو دیکھا۔

”کیا؟“ وہ جس طرح انہیں دیکھ رہی تھی، وہ ذرا

سے اچھے۔

”جائیداد میں میرا حصہ مجھے مل جائے گا؟“ اس نے سرگوشی کی، نگاہیں ان پر سے ہٹائے بغیر۔

”ہاں کیوں نہیں؟“  
”سہی اگر میں پوچھتی کہ کیوں نہیں تو؟“  
”کیا مطلب؟“

”میں ابھی جا کر ہمایوں داؤد کے خلاف بیان دوں تو کیا گارنٹی ہے کہ آپ مگر نہیں جائیں گے؟“  
”تمہیں مجھ پہ شک ہے؟“  
”مگر ہے تو؟“

آغا جان کے ماتھے پہ غصے کی لکیر ابھری جسے وہ ضبط کر گئے۔ ”تم اب کیا چاہتی ہو؟“

”یہ! اس نے کالی چادر میں سے بیگ نکالا، زپ کھولی اور ایک کافز اور پین نکال کر ان کی طرف برھائے۔

”میری صرف فیکٹری میں شیراز کی قیمت نو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ باقی کا حساب میں ابھی نہیں مانگ رہی۔ یہ آپ کی چیک بک کا چیک ہے رقم میں نے بھردی ہے اسے سائن کر دیں۔“ اس نے پین ان کے سامنے کیا، وہ کبھی اس کو دیکھتے، کبھی پین کو۔

”آغا جان! محمل بچی نہیں ہے۔ آپ مجھ سے میری آخرت خرید رہے ہیں۔ اگر میں نے جھوٹی گواہی دی، تو میں پل صراط پار کرنے سے پہلے ہی گر جاؤں گی۔ اگر گرتا ہے تو کچھ دیر تھوڑا ہونا چاہیے نا، آپ یہ سائن کریں۔ میں ابھی جا کر جھوٹی گواہی دیتی ہوں۔“

اس نے پین اور چیک ان کے ہاتھ پہ رکھا۔  
”اس ہال میں کوئی میرے اشارے کا منتظر ہے میں یہ چیک سائن کروا کر ابھی اس کو بینک بھیجتی ہوں جیسے ہی چیک کیش ہوگا، وہ مجھے سٹنل کرے گا، تب میں گواہی دے دوں گی ورنہ نہیں۔“

انہوں نے چیک کو ایک نظر دیکھا۔ اور پھر پین کو۔ دوسری طرف محمل کا نام پکارا گیا۔ وہ انہیں متنبہ نگاہوں سے دیکھتی اٹھی اور سر اٹھائے پورے اعتماد



سے کٹنے کی طرف بڑھی۔  
آغا کریم کبھی چیک کو دیکھتے اور کبھی اسے جو کٹنے میں کھڑی تھی اور اس کے سامنے غلاف میں لپٹا قرآن لایا گیا تھا وہ نگاہیں ان پہ جمائے پلک جھپکے بغیر قرآن پہ ہاتھ رکھ کر چند فقرے دہرا رہی تھی۔  
انہوں نے آخری بار چیک کو دیکھا اور پھر طیش میں آکر اسے مروڑ کر دو ٹکڑے کیے۔  
محمل تلخی سے مسکرائی، سر جھٹکا اور وکیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

\*\*\*

فواد کی ضمانت منسوخ ہو گئی اس کے خلاف ثبوت بہت سے تھے۔ وہ واپس جیل بھیج دیا گیا۔  
واپسی کا سفر بہت خاموشی سے کٹا۔ وہ آغا جان کی لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پہ بہت خاموشی سے سارا راستہ باہر دیکھتی آئی تھی۔ جب کار پورچ میں رکی تو وہ سب سے پہلے اتری۔  
لان میں بہت سی عورتیں تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھیں۔  
”کیا ہوا؟“ وہ کسی کو دیکھے بغیر چیزی سے اندر چلی گئی۔

”اس احسان فراموش لڑکی نے فواد کے خلاف گواہی دے دی۔“  
”ذلیل نہ ہو تو۔“  
”مگر فکر کی بات نہیں ہے وہ جلد ہی باہر آجائے گا“  
کیس اتنا مضبوط نہیں ہے۔“  
غفران چچا اور اسد چچا انہیں تسلی دینے لگے، مگر تائی مہتاب کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”ہائے میرا فواد۔“ وہ سینے پہ دو ہتھ مار کر اونچا اونچا رونے لگیں، روتے روتے وہ لڑھکنے کو تھیں کہ فضلہ اور ناعمہ نے ہنسنے لگا۔ انہیں سہارا دیا۔ پل بھر میں لان میں کھرام جگ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں پردے کو ہاتھ میں پکڑ کر ذرا سی جھری سے دیکھتی وہ پرسکون کھڑی تھی۔ کالی چادر سر سے پھسل کر پیچھے گردن پہ پڑے

بالوں پہ پھسل گئی تھی۔ بھورے بال چہرے کے اطراف میں گرے تھے۔ وہ کانچ سی سنہری آنکھیں سکپڑے پر سوچ نگاہوں سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔

\*\*\*

وہ ستون سے ٹیک لگائے ننگے پاؤں گھاس پہ رکھے بیٹھی تھی۔ جوتے ساتھ اترے بڑے تھے۔ سفید شلوار قمیص اور سر پہ گلابی اسکارف کس کر باندھے وہ گردن جھکائے دونوں ہاتھوں میں چھوٹا قرآن لیے پڑھ رہی تھی۔ چھٹی ہو چکی تھی اور لڑکیاں ادھر ادھر گزرتی باہر جا رہی تھیں۔ اسے سورۃ کھف پڑھنی تھی۔ آج جمعہ تھا۔

”اسلام علیکم۔“ سارا آہستہ سے آئی اور اس کے ساتھ پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔  
اس نے صفحے کا کنارہ پکڑے سر کے اثبات سے جواب دیا اور صفحہ پلٹا۔

ربیعہ اپنی گود میں رکھی اسانمنٹ حل کرنے لگی۔ گیٹ کے قریب فرشتے کھڑی ایک لڑکی سے بات کر رہی تھی۔ وہ لڑکی منمناتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی، مگر فرشتے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کا اونی پراجیکٹو مضبوط اور دو ٹوک مگر نرم انداز۔  
”کیا کر رہی ہو سارا؟“

”فرشتے باجی کی اسانمنٹ کر رہی ہوں، فرشتے باجی نے دی ہے۔“ لہجہ کر سرائیا۔ ”یہ دین اور مذہب میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

”دین ریلیجن کو کہتے ہیں جیسے اسلام اور مذہب کسی بھی دین کے کسی اسکول آف تھاٹ کو کہتے ہیں۔ مسلک کسی مذہب کے اندر کسی طریقے کا نام ہوتا ہے، مثلاً“ فقہی مسائل جیسا کہ شافعی، حنفی وغیرہ۔ آئی سمجھ؟“

”ہوں۔ تمہارا فہم اچھا ہے محمل!“  
”فرشتے نے سمجھایا تھا اس دن۔“ اس نے ذرا سی گردن موڑی۔ فرشتے اسی طرح اس سے بات کر رہی تھی۔ سارا بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اسے

دیکھنے لگی۔  
”فرشتے کی آئیز (آنکھیں) مجھے بہت پسند ہیں۔“  
محمل کے لبوں سے پھسلا۔  
”ہاں، بہت مشابہت ہے، آئی نو۔“ وہ بری طرح چونکی۔

”مشابہت؟“ وہ ایک دم بہت پرجوش ہو کر اس کی طرف پوری مڑی۔ ”مشابہت ہے ناسارا! مجھے ہمیشہ فرشتے کی آنکھیں دیکھ کر لگا ہے کہ یہ کسی سے بہت ملتی ہیں۔ تمہیں پتا ہے کس سے ملتی ہیں؟“  
”تو تمہیں نہیں پتا؟“ ربیعہ حیران ہوئی۔  
”کیا ان کے کزن سے؟“

”کزن کون؟“  
”چھوٹا تمہارا کس۔ کس سے ملتی ہیں؟“  
ربیعہ کچھ دیر حیرت سے اسے دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔

”تم سے ملتی ہیں محمل۔ بالکل تمہارے جیسی ہیں۔ کیا تم انہیں نہیں دیکھتیں؟“  
”مجھ سے؟“ محمل صراحت نہ کئی۔ اپنا ہوا ہوا وقت نگاہوں کے سامنے نہیں رہتا شاید اس کے ہوا۔  
عرصے میں اندازہ نہ کر سکی۔

اس لڑکی کی کسی بات پہ فرشتے ذرا سی مسکرائی۔ اس کی آنکھیں مسکراتے ہوئے کناروں سے ذرا سی چھوٹی ہو گئیں۔ بالکل اس کی اپنی طرح۔ ہو، ہوسوہ پلک جھپکے بنا اسے دیکھے گئی۔

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، گھٹنوں پہ کتاب رکھے سوچ میں گم تھی۔ بھورے بال کلمے شانوں پہ گرے تھے۔ مسرت اندر داخل ہوئیں تو وہ اسی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔ آہٹ پہ چونکی۔

”اماں۔ بات سنیں۔“  
”ہاں بولو۔“ مسرت الماری کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔  
”آپ ماموں لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملیں؟“

”نہیں۔“ ان کے ہاتھ لمحے بھر کو تھکے، پھر دوبارہ پکڑے الٹ پلٹ کرنے لگے۔  
”ماموں کی ایک ہی بیٹی ہے نا؟“  
”ہاں شاید۔“  
”اس کا نام کیا ہے۔“

”پتہ نہیں، وہ میری شادی کے بعد ہوئی تھی۔“ وہ مطلوبہ کپڑا نکال کر کھیلے دروازے سے باہر چلی گئیں۔  
اور یہ تو وہ جانتی تھی کہ اماں شادی کے بعد ماموں سے کبھی نہیں ملیں۔ نہ ہی وہ خود کبھی ان سے ملی تھی۔ اس نے تو ان کو دیکھا تھا کہ اماں اور اماں کی پسند کی شادی تھی۔ اور اماں کے خاندان والوں نے پھر کبھی کوئی رابطہ نہ رکھا تھا۔ آج فرشتے کی آنکھیں دیکھ کر اسے یونہی کچھ لگا تھا کہ شاید۔ مگر خیر۔

”ہم نے فیصلہ کر دیا ہے۔“ باہر تالی کے زور سے بولنے کی آواز پہ یکدم اس کا دل دھڑکا۔ وہ کتاب بند کیے لحاف اتار کر تیزی سے ننگے پاؤں باہر آئی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔

”اماں! اماں! کتاب تالی بند ہونے پہ ماموں اور اماں میں آگے آگے اور مسرت ان کے سامنے آگے آگے اس کی کھڑکی تھیں۔ دروازہ کھانے کی گواہ مسرت نے اسے دیکھا۔ یہ ایسی آنکھوں میں آئسو۔

”اپنی بیٹی کو کسی نارنٹ۔“ تالی نے ایک ہلکا سا ہنسی لگا دیا۔ ”اماں اس کو، ہونا ہے ہاں، ہمارا احسان ساری زندگی بھی تم دونوں چاہو تو نہیں اتار سکتیں۔“  
وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ تو کیا فواد واقعی جیل سے باہر آجائے گا؟

”مگر بھابھی۔“ مسرت کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز آئی۔ ”محمل۔ محمل کبھی نہیں مانے گی و سیم کے لیے۔“  
”وسیم؟“ وہ جھپکے سے دو قدم پیچھے ہٹی۔



اور یہ چند روز پرانی ہی تو بات تھی جب فریدہ پھوپھو نے گھر آکر خوب مزے لے کر وسم کے چند ”آنکھوں دیکھے قصبے“ سنائے تھے۔ فریدہ پھوپھو محل کے لبا کی کزن تھیں اور ہر خبر سارے خاندان میں سب سے پہلے ان کے پاس پہنچتی تھی۔ گھر میں تو چلو ان کو تائی نے چپ کرادیا، مگر ہفتے بعد ہی ایک شادی کی تقریب میں انہوں نے وہی قصبے چھیڑ دیے، ابھی فواد کی گرفتاری کے چرچے پرانے نہیں ہوئے تھے کہ خاندان والوں کے ہاتھ ایک اور شوشہ لگ گیا۔ پوری تقریب گویا اکھاڑہ بن گئی۔ تائی متاب ان عورتوں کو جتنا لعن طعن کر سکتی تھیں کیا، مگر وہ اکیلی تھیں اور مقابل پورا جھٹکتا تھا۔ معنی خیز نگاہیں اور طنزیہ انداز۔

”برانہ ماننا متاب بھابھی! مگر وسم کو میرے سمج نے ہی نشے کی حالت میں رات کے دو بجے سڑک سے اٹھا کر تمہارے گھر پہنچایا تھا۔“

”ہاں تو سمج خود اس وقت ادھر کیا کر رہا تھا؟“ تائی ہاتھ نچاتے ہوئے غصے سے بے قابو ہو کر بولی تھیں۔

وسم کی بات بچپن سے آغا جان کے پچا زاد آغا سکندر کی بیٹی کے ساتھ طے تھی۔ کچھ عرصے سے آغا سکندر کی فیملی کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی اور جب یہ باتیں منظر عام پہ آئیں تو انہوں نے فون پہ ہی دو ٹوک رشتہ ختم کر دیا۔

”گزرے برسوں کی ایک نادانی تھی، وہ متاب بھابھی! بھلا کس طرح ہم اپنی بیٹی کو اس لڑکے سے بیاہ دیں جسے پورے خاندان میں کوئی رشتہ دینے کو تیار نہیں؟“

”اور میں بھی آپ کو خاندان کی سب سے خوب صورت لڑکی وسم کی دشمن بنا کر دکھاؤں گی۔“ تائی نے بھی کھولتے ہوئے فون چٹا تھا۔

محمل کو قابو کرنے، اس کی جائیداد حاصل کرنے اور وسم کو بیاہ کر خاندان میں گردن اوچی کرنے کا بہترین حل تائی کو نظر آئی گیا تھا۔ انہوں نے ایک تیرے تین شکار کر لیے تھے۔

\*\*\*

وہ سر جھکائے تیز تیز سڑک کے کنارے چلتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لمبے سیدھے بھورے بال شانوں پہ پھیل کر گر رہے تھے، گہاں گہاں کدھر اسے کچھ پتا نہ تھا۔

زندگی اس کے ساتھ یوں بھی کر سکتی ہے، اس نے تو سوچا بھی نہ تھا، ایک تنگ پھندا تھا جو اسے اپنی گردن کے گرد کتا محسوس ہو رہا تھا۔

اداس درختوں کی گھنی باڑ آج بھی ویسے ہی کھڑی تھی۔ شام کے برندے شاخوں پہ لوٹ آئے تھے۔ وہ راستہ جانا پہچانا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی، جب اس کی سماعتوں نے وہ آواز سنی۔

”محمل! رکو۔“

مگر وہ نہیں رکی، اسے رکنا نہیں تھا، وہ رکنے والا راستہ تھا بھی نہیں۔

”محمل! وہ تیز دوڑتا اس کے ساتھ آلا۔“ بات تو سنو۔

پھولی سانوں سے اس کے بائیں طرف اس کی رفتار سے بمشکل مل پاتا وہ ہمایوں تھا، ٹریک سوٹ میں ملبوس وہ شاید جاکنگ سے آ رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے محمل؟ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟“

اس کے قدم تھکے بہت آہستہ سے اس نے گردن اٹھائی، بھیگی سنہری آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

”میرا اور آپ کا کیا رشتہ ہے جو میں آپ کو بتاؤں؟“

”کیا انسانیت کا رشتہ کچھ نہیں ہوتا؟“

”کچھ نہیں ہوتا۔“ وہ تیزی سے چلنے لگی تھی۔

”مگر ہوا کیا ہے؟“

”میری تائی نے میرا رشتہ اپنے آوارہ بیٹے سے طے کر دیا ہے۔“

”تو تم رو کیوں رہی ہو؟“

”پھر کیا خوشی مناؤں؟“ وہ پوری اس کی طرف

گھومی۔ غصہ بہت شدت سے ابلا تھا۔ یہی شخص تھا اس کی ہر مشکل کا ذمہ دار۔

”تھیک ہے، تم صاف انکار کر دو۔ کچھ اور کرلو، لیکن اگر یوں اسے آپ پہ ظلم سہتے روتی رہو گی تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گی۔“ اس نے بھیگی آنکھوں سے ہمایوں کا چہرہ دیکھا، مغرور، مگر فکر مند چہرہ۔

”میں مریں یا جیوں، آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟“

اس کے انداز پہ وہ چند لمحے لب بستی خاموش کھڑا رہا، پھر گہری سانس اندر کو کھینچی۔ ”ہاں، مجھے نہیں فرق پڑتا۔“ اور واپس پلٹ گیا۔

”ہونہہ!“ محمل نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ”آپ وہ ہی ہیں نا، بیچ راہ میں چھوڑ دینے والے۔“ وہ جیسے چونک کر پلٹا۔

اسی بل ہوا کا ایک تیز جھوٹکا آیا تھا۔ اس کے بھیگے چہرے کے اطراف میں گرے بال پیچھے کواڑنے لگے تھے۔

”اور آپ کو پتا ہے ہمایوں باسی لے آپ سے میں نے کبھی امید ہی نہیں لگائی تھی، پھر کیا میں روؤں۔“ وہ کدھر کدھر پلٹ گئی، ہوا ہی پلٹ گئی، شام کے برندے بھی پلٹ گئے۔

وہ ساکت سا تارکول کی ویران سڑک پہ کھڑا رہ گیا۔ درختوں کی باڑ اب بھی اداسی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

\*\*\*

اس نے اشاف روم کے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ چند لمحے منتظر سی کھڑی رہی، پھر جواب نہ پا کر اندر جھانکا۔ اشاف روم خالی تھا۔

وہ کتابیں سینے سے لگائے متذبذب سی واپس پلٹ گئی۔ اسی پل سامنے سے ایک گروپ انچارج آتی دکھائی دی۔

”السلام علیکم، حاجی میم فرشتے کدھر ہیں؟“

”فرشتے حاجی ہاشل میں لا بیریری میں ہوں گی، ان کو کچھ کام تھا اسی لیے وہ آج آئیں سکیں۔“

”اچھا۔“ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگنے لگی۔ لا بیریری کا گلاس ڈور کھلا تھا۔ اس نے قدرے جھٹکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

کتابوں کے اونچے ریکس، اور دیوار گیر فرنیچر دندوز لا بیریری کا مخصوص خاموش ماحول۔

”فرشتے؟“ اس نے ہولے سے پکارا۔ خاموش لا بیریری کا تقدس زخمی ہوا تو وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔

”ادھر۔“ لا بیریرین کسی کونے سے نکل کر آئی اور ایک طرف اشارہ کیا، وہ شرمندہ سی ادھر لپکی۔

چند ریکس سے گزر کر اس نے دوسری طرف جھانکا۔

وہ کتاب اٹھائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، بلکہ گلابی شلوار قمیص پہ گرے دوپٹہ شانوں کے گرد لپیٹے، فرشتے کی اس کی طرف پشت تھی، محمل کو اس کی کمر پہ گرتے سیدھے بھورے بال دکھائی دیے تھے۔

وہ ذرا سی حیران ہوئی تھی۔ اس نے بیٹھ جاب میں ملبوس فرشتے کو دیکھا تھا۔ سراسر ایک نیا آدمی تھا، مختلف لگ رہی تھی۔

”فرشتے؟“ وہ جیسے چونک کر مڑی، اسے دیکھا تو مسکرا دی۔ ”ارے ماشاء اللہ، آج تو لوگ لا بیریری آئے ہیں۔“

”مگر صرف آپ سے ملنے۔“

”بیٹھو۔“ وہ کھڑکی سے لگی کرسی پہ آ بیٹھی، جس کے سامنے میز تھی۔ میز کے اس طرف ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ وہ محمل نے سنبھال لی اور کتابیں میز پہ رکھ دیں۔

”مجھے ہمایوں نے کچھ بتایا تھا۔“ وہ کہنے لگی تو محمل خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

لمبے سیدھے بھورے بال جو اس نے کانوں کے پیچھے کر رکھے تھے۔ دکتی رنگت والا چہرہ اور کالج سی سنہری آنکھیں، اس کے نقش مختلف تھے، مگر آنکھیں اور بال یوں تھے جیسے وہ آئینہ دیکھ رہی ہو۔

”تو تمہارا رشتہ انہوں نے اپنے بیٹے سے طے کر دیا ہے؟“



NEW TOUCHME  
**Minto**  
Calcium+Fluoride Toothpaste

## بدل دے زندگی کا ہر انداز



- ✓ کیلشیم اور فلورائیڈ سے دانت مضبوط
- ✓ Extra Whitening سے دانتوں پر انوکھی چمک اور سفیدی
- ✓ مکمل Tartar کنٹرول
- ✓ ماتھ داس سے مہکتی سانسیں



**Extra Whitening**

محمل نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔  
”تو تم انکار کرو۔“

”کس کے لیے انکار کروں؟ اس کے لیے جو بیچ راہ میں چھوڑ جاتا ہے؟“ وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ یہ تو ابھی اس نے اپنے دل سے بھی نہ کہا تھا، فرشتے سے کیسے کہتی؟

”نہیں کیوں انکار کروں؟ کیا میں صبر کر کے اجر نہ لوں؟“

”محمل! مظلومیت اور صبر میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق احتجاج کرنے کا حق رکھنے کا ہوتا ہے، بجائے اپنی زندگی خراب کرنے کے، تم ایک بہتر راستہ چن لو، صاف صاف انکار کرو۔“

”مجھے ان کے ری ایکشن سے ڈر لگتا ہے۔“  
”اس پہ تم صبر کر لینا۔“ وہ ہلکی سی مسکرائی۔ ”رشتہ داروں کے ساتھ بہت صبر سے گزارا کرنا پڑتا ہے لڑکی۔“

”آپ کرتی ہیں صبر؟“  
”کیا مطلب؟“

”آپ کے رشتہ دار ہیں فرشتے؟ آپ کے پیرئس؟ اور ہمایوں کے پیرئس۔“ اس نے سوال ادا دھور اچھوڑ دیا۔ جانتی تھی فرشتے کو ادھورے سوال پڑھنے آتے ہیں۔

”میری امی کی ایک ہی بہن تھیں، ہمایوں ان کا بیٹا ہے۔ ان کی ڈیٹھ کے بعد امی نے ہمایوں کو گود لے لیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے، ڈیڑھ سال پہلے میری امی کی ڈیٹھ ہو گئی۔ پھر میں نے اور ہمایوں نے فیصلہ کیا کہ گھر میں ہمایوں رہے اور میں ہاسٹل میں رہوں۔“

”اور آپ کے ابو؟“

”میں میٹرک میں تھی جب ان کی ڈیٹھ ہوئی۔“  
”آپ کے ابو کی کوئی بہن تو ہوں گی؟“ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”ہاں۔ ایک بہن ہیں۔“ فرشتے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”کدھر رہتی ہیں؟“

”یہیں اسی شہر میں۔“

”وہ آپ سے ملتی ہیں؟“

”نہیں، کچھ پراہلہمز کی وجہ سے وہ لوگ مجھ سے نہیں ملتے۔“

”اور آپ؟“

”میں کوشش تو کرتی ہوں کہ ہر عید پہ ان کے گھر ہو آؤں، لیکن وہ میرے اور دروازے بند کر دیتے ہیں۔“

”پھر؟“ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتی آگے کو ہوتی۔

”پھر میں کیک اور پھول دے کر واپس آجاتی ہوں۔ میری اتنی ہی استطاعت ہے، آگے کیا کر سکتی ہوں؟“

وہ سادگی سے مسکرائی۔

”کیک اور پھول؟ عیدوں پہ بہت جگہوں سے مٹھائی اور کیک پھول وغیرہ آتے تھے، کیا وہ بھی بھیجتی تھی؟“

”آپ کی پھوپھو کے کتنے بچے ہیں؟“

”ایک ہی بیٹی ہے۔“ اور اسے پتا تھا فرشتے جھوٹے نہیں بولتی، اس کا تجسس تھا کہ پڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کیا عمر ہوگی اس کی؟“

”مجھ سے تو چند سال چھوٹی ہی ہے۔“

”نام کیا ہے؟“

”یہ ضروری تو نہیں ہے محمل! فرشتے جیسے ذرا سی مضطرب ہوتی تھی۔“

”ہو سکتا ہے میں آپ کی فیمیلز کو ملانے میں کچھ مدد کر سکوں؟“

”نہیں۔“ فرشتے نے بغور اسے دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم میری پھوپھو کی بیٹی کو نہیں جانتیں۔“

”پھر بھی۔“

”کیا ہم ٹاپک چینج کر سکتے ہیں؟“

اس کے ازلی ٹھوس اور قطعی انداز پہ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”یہ کھڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔“ وہ کہہ کر پُرسوج انداز میں کھڑکی کے باہر اترتی صبح کو دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

رات کھانے کے بعد اس نے سب کے کمروں میں



چلے جانے کا انتظار کیا، یہاں تک کہ لاؤنج میں ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھی لڑکیاں بھی اٹھ کر جانے لگیں اور لاؤنج خالی رہ گیا تو وہ دبے قدموں باہر نکلی۔ آج اسے آغا جان کو صاف انکار کرنا تھا۔

لاؤنج اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ آغا جان کے بیدروم کے دروازے سے روشنی کی لکیر آرہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے تک آئی۔ قریب تھا کہ وہ دستک دے ڈالتی کہ اندر سے آتی آوازوں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

”اس لڑکی سے کوئی بعید نہیں۔ آج پھر میرے آفس آگئی تھی۔“ آغا جان کی سوچ میں ڈوبی آواز آئی۔

”کون؟ فرشتے؟“ تائی کا حیران کن لہجہ۔ ”پھر وہ ہی پرانی بات کرنے کے محمل کی جائیداد میں اس کا بھی حصہ نکالیں؟“

محمل کو لگا پوری چھت اس پہ آن گری ہے۔ ”ہاں“ آج وہ آفس آئی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر ہم نے وسیم سے محمل کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو۔“

تایا جان کچھ کہہ رہے تھے اور چند دن پہلے کی برہمی گئی ایک حدیث اس کے کان میں گونجی جس کا ہم کچھ اس طرح تھا کہ اگر کوئی تمہارے گھر میں جھانکے اور تم پتھر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ وہ گہرا لہجہ۔ اسے نہیں دیکھنا چاہیے۔ وہ غلط کر رہی ہے وہ کسی کی پراسیوسی میں جھانک رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ واپس کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ دروازے کی کنڈی لگا کر وہ پھولی سانس کو قابو کرتی بیڈ پر گری گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”محمل کی جائیداد میں فرشتے کا حصہ؟“ گوکہ اسے شک تھا کہ فرشتے کا اس سے تعلق ضرور ہے اور شاید بلکہ یقیناً وہ اس کے ان قطع تعلق کیے ہوئے ننھیالی رشتہ داروں میں سے ہے، لیکن پھر بھی تائی کے منہ سے اس کا نام سن کر اسے بہت برا جھٹکا لگا تھا۔ اس سے بھی برا جھٹکا فرشتے کا مطالبہ جان کر کیا

فرشتے نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ محمل کے حصے میں سے اسے بھی کچھ دیا جائے؟ مگر کیوں؟ فرشتے ایسے کیوں کرے گی؟

اس کی نگاہوں میں ایک سرپا لہرایا۔ سیاہ عبایا میں ملبوس گرے اسکارف میں ملائم چہرے کو مقید کیے سنہری آنکھیں جھکائے دونوں ہاتھوں میں چھوٹا قرآن پکڑے بال پوائنٹ سے منٹے پہ کچھ مارک کرتی فرشتے۔

وہ کون تھی؟ اس کا پورا نام کیا تھا؟ وہ ہالیوں سے زیادہ ملتی نہ تھی، لیکن محمل کے متعلق ہر خبر اس کے پاس ہوتی تھی۔ وہ کیوں اس کی خبر رکھتی تھی؟ اور وہ کیوں آغا جان سے ملتی تھی؟

بہت سی اجنبیوں کے سرے وہ سلجھانہ پارہی تھی، لیکن ایک بات طے تھی فرشتے کا عظمت بھرا وہ تصور جو اس نے ذہن میں بنارکھا تھا مگر کپاش پاش ہو گیا تھا پتا نہیں کیوں۔

وہ چینی کی پلیٹیں احتیاط سے کینٹ سے نکل کر کلوٹر پر رکھ رہی تھی جب آہٹ پہ چونک کر پلیٹیں چکن کے کھلے دروازے میں فضا چچی کھڑی اس کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

”جی چچی؟“ وہ قدرے الجھی۔ پھر ایک نظر خود پہ ڈالی۔ سادہ سی گلابی شلوار قمیص پر سیاہ دوپٹہ کندھوں کے گرد لپیٹے سلکی بالوں کو اونچی پونی ٹیل میں مقید کیے وہ ہردن کی طرح ہی لگ رہی تھی پھر چچی کو کیا ہوا تھا؟

”کچھ چاہیے چچی؟“ اس نے پھر پوچھا۔ ان کی نظریں اب اس کو پریشان کرنے لگی تھیں۔

”ہوں، نہیں۔“ فضا چچی نے سر جھٹکا اور واپس چلی گئیں۔ جاتے سے اسے ان کے چہرے پہ ہلکا سا شفر نظر آیا تھا۔

”ان کو کیا ہوا ہے؟“ وہ پلیٹیں کپڑے سے صاف کرتے ہوئے سوچنے لگی، پھر شانے اچکا کر کام میں مصروف ہو گئی۔ ڈنر کا ٹائم ہونے والا تھا اور اسے میز

لگانی تھی۔ سب آتے ہی ہوں گے۔ ”میں نے اور مسرت نے وسیم اور محمل کا رشتہ طے کر دیا ہے، آپ سب کو یقیناً علم ہو گا۔“ وہ رائیڈ کا ڈونگہ میز پر رکھ رہی تھی جب آغا جان نے سب کو مخاطب کیا۔

ڈانگنگ ہال میں سناٹا سا چھا گیا۔ گوکہ سب کو معلوم ہی تھا، پھر بھی سب چپ تھے۔ وہ سر جھٹکائے اپنی آخری کرسی پہ آ بیٹھی اور پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔

”یہ فیصلہ آپ نے بالائی ہال کر لیا یا مسرت چچی سے پوچھنے کی زحمت بھی کی؟“ حسن کے طنز پر لہجے نے سب کو چونکایا تھا۔ وہ بھی بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی جو اکھڑے تیروں کے ساتھ آغا جان کو دیکھ رہا تھا۔

”کیا مطلب؟ مسرت کی مرضی سے ہوا ہے رشتہ۔“ آغا جان برہم بھی ہوئے اور حیران بھی۔

”کیوں چچی؟“ اس نے خاموشی سے سر جھٹکائے بیٹھی مسرت کو مخاطب کیا۔ ”آپ کو اس وسیم کا رشتہ منظور ہے جسے خاندان میں کوئی بیٹی دینے کو تیار نہیں؟“

مسرت کا جھکا سر مزید جھک گیا، فضا نے ناگواری سے پہلو بدلا۔

”بتائیے چچی! اگر آپ خاموش رہیں تو اس کا مطلب ہے، آپ کے ساتھ آغا جان نے زبردستی کی ہے۔“

”کیا بکواس ہے یہ حسن؟“ ”آغا جان! مجھے مسرت چچی سے بات کرنے دیں۔“ حسن کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ سب دم بخود اس کو دیکھ رہے تھے۔

”بتائیے چچی! آپ کو یہ رشتہ منظور ہے؟“ ”نہیں!“ محمل نے قطعی انداز میں کہا۔ اسے معلوم تھا اس کی ہاں کچھ نہیں بول سکے گی۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ خود حسن بھی قدرے ٹھٹکا۔

”تم بیچ میں مت بولو۔“ آغا جان برہم ہوئے۔

”بھی نہیں بولی تو نکاح کے وقت انکار کروں گی۔ یہ حق مجھے میرے دین نے دیا ہے، آپ نے میرے ساتھ زبردستی کی تو میں کورٹ تک چلی جاؤں گی۔“ ”مگر تمہیں کیا مسئلہ ہے وسیم سے؟“ غفران چچا جھنجھلائے۔ ایسی ہی جھنجھلاہٹ فضا کے چہرے پہ بھی تھی۔

”اگر وسیم اتنا ہی اچھا ہے تو غفران چچا آپ ندایا سامیہ باجی کا رشتہ اس کے ساتھ کیوں نہیں کر دیتے؟“

بہت دنوں بعد پورے گھر نے پرانی محمل دیکھی تھی۔ ”شٹ اپ!“

”میں انکار کر چکی ہوں، اگر آپ لوگوں کو مزید اپنی بے عزتی کروانے کا شوق ہے تو میں نکاح کے موقع پہ اس سے بھی زوردار انکار کروں گی۔“

”ارے شکر کرو کہ ہم تمہیں ہونا رہے ہیں۔“ بہت دیر سے خاموش بیٹھی تائی متاب ضبط نہ کر سکی۔ ”ابھی تو ایک رات گھر سے باہر رہ چکی ہو، اب اسے کوئی شرم قبول کرنا، ہم ہوشیاری تو کون قبول کرے گا؟“

”میں!“ حسن جیسے بھڑک کر بولا تھا۔ ”میں قبول کروں گا محمل کو۔ وہ وسیم سے شادی نہیں کرنا چاہتی، میں اپنا نام مسرت چچی کے سامنے رکھ رہا ہوں اور چچی! میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔“

”ہرگز نہیں۔“ فضا پھٹ پڑی۔ ”میں اس لڑکی کو کبھی قبول نہیں کروں گی جو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“

”مٹی!“ وہ زور سے چیخا تھا۔ اس سے مزید سنا نہیں گیا، وہ کرسی دھکیل کر بھاگتی ہوئی ڈانگنگ ہال سے نکل گئی۔

بریگیڈیئر فرقان کا بنگلہ، جس کے ٹیرس پہ بوگن ویلیا کی بیلیوں کا راج تھا، آج بھی اسے ویسا ہی اداس اور



ویران لگا تھا بلکہ وہ شاید ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ مکیں کے خود قرآن پڑھنے اور مکان کو محض سنوانے میں بہر حال فرق تو ہوتا ہے۔

آج پھر وہ چند ہمفلٹس ہاتھ میں پکڑے ان کے گیسٹ پکڑی تھی۔

نیل یہ ملازم نے بھاگ کر چھوٹا دروازہ کھولا۔

”جی بی بی؟“ اس نے سراہر نکالا۔

”مجھے بریگیڈیئر فرقان سے ملنا ہے وہ اندر ہیں؟“

”جی وہ کام کر رہے ہیں۔“

”ان سے کہو محل آئی ہے!“ قدرے تحکم سے کہہ کر وہ سینے پہ بازو باندھے وہیں کھڑی ہو گئی۔ فوراً

ملازم اندر کودوڑا۔ چند لمحے ہی بعد اس کی واپسی ہو گئی۔

”صاحب کہہ رہے ہیں آپ اپنے یہ کلفڈ لے لیں۔“ اس نے پرانے ہمفلٹس اس کی طرف بڑھائے۔

”انہوں نے بڑھ لیے ہیں؟“

”نہیں جی وہ مصروف تھے۔“

”اپنے صاحب کو کہو یہ ان پہ میری امانت تھی جب انہوں نے لیے تھے تو میری سو فی گنی ذمہ داری بھی انہیں نبھانی تھی ورنہ لینے سے ہی انکار کر دیتے۔

انہوں نے خیانت کر کے یہ لوٹائے ہیں اور اگر میں نے معاف نہیں کیا تو ان کو معافی نہیں ملے گی۔“ ملازم

ہو نوقول کی طرح اسے دیکھنے لگا پھر اندر چلا۔

”صاحب آپ کو اندر بلارہے ہیں۔“ وہ پیغام دے کر جلد ہی واپس آیا تھا۔

”شکریہ۔“ وہ پورے اعتماد سے اندر چلی آئی۔

اسٹڈی کا دروازہ کھلا تھا۔ محل نے چوکھٹ میں کھڑے کھڑے دروازہ انگلی کی پشت سے بجایا۔

اسٹڈی نیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پہ بیٹھے بریگیڈیئر فرقان نے کتاب پہ جھکا سر اٹھایا اور عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا جو دروازے کے بیچ کھڑی تھی۔

یونیفارم کی سفید شلواریں اور چہرے کے گرد نفاست سے لپٹا تروتازہ گلابی اسکارف جو پیچھے سے

اونچی پونی کے باعث ذرا سا اٹھ گیا تھا۔ ہاتھ میں چند ہمفلٹس پکڑے وہ دراز قد سنہری آنکھوں والی لڑکی منتظری کھڑی تھی۔

”کم ان۔“ بریگیڈیئر فرقان نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا کتاب بند کی اور کرسی پہ قدرے پیچھے کو ٹیک لگائی۔

”میں کچھ ہمفلٹس دے کر گئی تھی۔“

”اور میں نے واپس کر دیے تھے اور کچھ؟“ ان کے بارعب چہرے پہ قدرے ناگواری تھی۔

”جی یہ کچھ اور ہیں۔“ وہ آگے بڑھی اور چند ہمفلٹس ان کی میز پر رکھے۔ ”یہ آپ پڑھ کر مجھے واپس کر دیجئے گا۔“

”مگر مجھے یہ نہیں چاہئیں۔“ وہ بے زار سے بولے۔

”میں نے آپ کو جو اس تو نہیں دی اسرا! آپ کو یہ لینے پڑیں گے میں کچھ عرصے بعد آکر واپس لے لوں گی۔ پڑھ کر سنبھال لیجئے گا ان پہ اللہ کا نام لکھا ہے۔

امید ہے آپ پھینکیں گے نہیں۔“ وہ کھڑی کھڑی کہہ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔

بریگیڈیئر فرقان نے تھملا کر ایک نظر ان ہمفلٹس کو دیکھا پھر دراز میں ڈال کر اپنی عینک اٹھائی اور کچھ بڑبڑاتے ہوئے کتاب کھول لی۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنی دھن میں راہ داری میں چلتی جا رہی تھی کہ اچانک دوسری طرف سے آئی فرشتے پہ نگاہ پڑی اس کے لب بھنج گئے بے اختیار ہی وہ پیچھے ہوئی تھی۔

فرشتے نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ چلتی نیچر سے فکر مندی سے کچھ کہتی چلی آ رہی تھی۔ محل

اگلے قدموں واپس ہوئی اور برآمدے میں رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق فرشتے نے اس کی موجودگی نوٹ نہیں کی۔ سا بھی اور نیچر کے ہمراہ

نیچر پر شہر مال کی سیڑھیاں اترتی گئی تھی۔

پر شہر مال میں ملک کے نامور مذہبی اسکالر ڈاکٹر سرور

مرزا کے لیکچر کا انعقاد تھا۔ وہ بھی ست روی سے چلتی ہوئی ایک درمیانی صف کی نشست پہ آئی تھی۔ ابھی

لیکچر شروع نہیں ہوا تھا۔ محل نے ہاتھ میں پکڑا پاکٹ سائز قرآن کھولا اور یوں ہی پڑھنے کے لیے صفحے پلٹنے لگی۔

فرشتے نے ایسا کیوں کیا؟ یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

اس نے آغا جان سے محل کی جائیداد میں سے حصہ کیوں مانگا؟ فرشتے جیسی لڑکی اتنی مادہ پرست ہو سکتی ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس نے مطلوبہ صفحہ پلٹا اور وہ آیات نکالیں جو آج پڑھائی جانے والی تھیں مگر ڈاکٹر سرور کے لیکچر کے باعث آج تفسیر کی کلاس نہیں ہونا تھی۔

”اور ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو ہمیں بری لگیں۔“

”اوہ! کبھی سانس لے کر محل نے قرآن بند کیا۔“

”میرا کچھ بھی بے اہمیت نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے گردن اوپر اٹھائی اور سر اڑھائے ہوئے

مسکرا کر سر جھکا۔ جب بھی ایسا ہوا اسے غصے کی لہر

سے حد بڑھاتا تھا۔ اسے لگتا تھا دنیا میں اس کے لیے کوئی کیونیکیشن موڈ ایجاد نہیں ہوا تھا۔

”مگر ایسا کیا ہے جو مجھے اس سوال کا جواب براگے گا؟“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پھر سے سوچنے لگی تھی۔

ڈاکٹر سرور لیکچر شروع کر چکے تھے۔ پورا بال کھینچ بھرا تھا۔ دور دور تک پنک اسکارف میں ڈھکے

سر دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیج کے قریب چیئر پر اسٹاف موجود تھا۔ فرشتے بھی وہیں ایک کرسی پہ بیٹھی

ڈائری پہ تیز تیز لیکچر نوٹ کر رہی تھی۔ اسے نوٹس لیتے دیکھ کر وہ خود بھی چونک کر ڈاکٹر سرور کی طرف متوجہ

ہوئی جو روٹروم پہ کھڑے تھے۔ سر پہ جناح کیپ سفید داڑھی، شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس وہ خاصے

منجھے ہوئے اسکارف تھے وہ اکثر ان کوئی وی پہ دیکھتی رہتی تھی۔

اپنی سوچوں کو جھٹک کر وہ بغور لیکچر سننے لگی۔

”بعض لوگ قرآن پڑھ کر بھٹکتے ہیں۔ واقعی ایسا ہوتا ہے۔“ وہ اپنی مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے

”اس لیے بہتر ہے کہ قرآن کسی اچھے غیر متعصب عالم سے زندگی میں ایک دفعہ ضرور پڑھ لیتا چاہیے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کا ”وامن“ پکڑنا ضروری ہے۔

بلکہ کسی غیر متعصب تفسیر کو پڑھ کر بھی کسی حد تک قرآن کی سمجھ بوجھ پیدا کی جاسکتی ہے۔

قرآن کو پڑھ کر ہم ہر آیت کے اپنے حالات کے مطابق کئی مطالب نکالیں وہ مطلب نکالنا غلط نہیں ہے، مگر ظاہر کو باطن سے تشبیہ دینا قطعاً غلط ہے۔

مثلاً ”بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا جو حکم اللہ سبحانہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے ذریعے دیا تھا وہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس واقعہ سے ہم یہ سبق تو نکال سکتے ہیں کثرت

سوال سے حکم مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ مگر اس سے پہ

مطلب ہرگز نہیں نکالا کہ وہاں گائے سے مراد ایک صحابی ہیں، نعموا اللہ بعض لوگوں نے ”واللہ“ یہاں

”گائے“ سے مراد ایک صحابی کو لیا ہے۔ ایک اور

مثال اس حدیث کی آری آیات میں ہے کہ اس حدیث کی

کی عبارت مگر یہاں تک کہ شمارے پاس لیکن آجائے۔

اب یہاں ”یقین“ سے مراد ”موت“ ہے یعنی موت آنے تک عبادت کرتے رہو۔ مگر بعض لوگ

یہاں ”یقین“ سے مراد belief لے کر اپنی عبادت کو کافی سمجھ کر بس کر دیتے ہیں کہ جی، ہمیں اپنی عبادت

پہ یقین آگیا ہے تو سب عبادتیں بس ختم!“

”سورہ حجر کہاں بھی بھلا؟“ اس نے آہستہ سے اپنا

چھوٹا قرآن کھولا اور صفحے پلٹنے لگی۔ سورہ حجر ملی تو اس

نے اس کی آخری آیات کھولیں۔ آیت وہی تھی جو وہ

کہہ رہے تھے۔ مگر آخر تین الفاظ عربی میں ”حتی یاتی

الیقین“ تھے۔ (حتی کہ یقین آجائے)

”یقین؟“ اس نے ”یقین“ یہ انگلی پھیری پھر الجھ

کر ڈاکٹر سرور کو دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”یہاں پہ یقین سے مراد یقین نہیں بلکہ موت



ہے۔ سو اس طرح کے الفاظ کا من چاہا مطلب نکالنا انسان کو بھٹکا سکتا ہے۔ اپنی کونسی جہن؟ انہوں نے رک کر ایک گہری نظر ہال پہ ڈالی۔

محمل نے ہاتھ فضا میں بلند کیا۔  
”ہیس؟“ انہوں نے سر کے اشارے سے اجازت دی وہ ہاتھ میں قرآن پکڑے اپنی نشست سے اٹھی۔  
”سر! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے پاس بغیر ترجمے والا مصحف ہے۔ اس میں مذکورہ آیت میں واقعاً ”یقین“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سو اس کا مطلب ”موت“ کیسے ہوا؟ دونوں الفاظ میں خاصا فرق ہے۔“

”اس کا مطلب موت ایسے ہے کہ۔“ وہ زرا دیر کو رکے اور بغور اسے دیکھا ”میں نے اس کا مطلب موت نکالا ہے۔“

”جی سر! میرا یہی سوال ہے کہ کیسے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟“

”دلیل یہ ہے کہ میں نے ”یعنی ڈاکٹر سرور مرزا نے اس کا مطلب موت لیا ہے۔ میں اس ملک کا سب سے بڑا اسلامک اسکالر ہوں۔ آپ میرے کریڈنشلز اٹھا کر دیکھیں، میری ڈگریز دیکھیں۔ کیا میری بات بطور ایک ٹھوس دلیل کے کافی نہیں؟“

اگلی صفوں میں بیٹھی لڑکیاں گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگی تھیں جو ہاتھ میں چھوٹا قرآن پکڑے کھڑی تھی۔

”سر! آپ کی بات یقیناً ”اہم“ ہے مگر قرآن کا بعض اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے، حدیث بھی یہ کرتی ہے۔ کیا قرآن یا حدیث میں کہیں یہ ذکر ہے کہ یہاں ”یقین“ سے مراد موت ہے؟“ وہ بہت شائستگی و لحاظ سے مؤدب سی پوچھ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرور کے چہرے پہ واضح ناگواری ابھری۔

”یعنی کہ اگر میں آپ کو اس مطلب کی دلیل نہ دوں تو اسے محض میری بات سمجھ کر آپ جھٹلا دیں گی؟ یعنی آپ کو میری بات کے اوپر مزید کوئی دلیل چاہیے۔؟“

”جی! اس نے ہولے سے سر ہلادیا۔

”پورے ہال میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکیاں قدرے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”یعنی آپ ایک دینی اسکالر کو چیلنج کر رہی ہیں۔؟“  
”سر! میں بہت ادب سے صرف دلیل مانگ رہی ہوں۔“

”اگر اس کی دلیل قرآن و حدیث میں نہ ہو تو کیا آپ ”یقین“ کا مطلب ”موت“ تسلیم کریں گی۔؟“  
”نہیں، سر کبھی بھی نہیں۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر سرور نے گہری سانس لے کر ہال پہ ایک نظر دوڑائی ”کیا کوئی اور بھی ہے جو اپنی عمر سے زیادہ طویل تجربے کے حامل ایک اسکالر کو چیلنج کرے؟ کسی اور کو بھی دلیل چاہیے؟“

بہت سے سرفنی میں مل گئے۔ وہ اکیلی کھڑی تھی۔  
”یعنی تین سو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو دلیل چاہیے؟ یہی پڑھا رہے ہیں آپ لوگ اس مسجد میں؟ کون ہیں آپ کی کلاس انچارج؟“

میڈم مصباح کھڑی ہوئیں۔  
”کیا آپ اس ناکام کلاس رپورٹ کی ذمہ داری لیتی ہیں؟ دن آؤٹ آف ٹھری ہنڈرڈ کی؟“

”جی سر! میڈم مصباح کا سر قدرے جھک گیا۔ ڈاکٹر سرور نے محمل کو دیکھا۔  
”کیا آپ کو ابھی بھی دلیل چاہیے؟“

”جی سر!“  
وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے پھر ہلکے سے مسکرائے۔

”المدثر آیت 43-47 میں یقین کا لفظ موت کے لیے استعمال ہے وہاں سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ یہاں بھی یقین سے مراد موت ہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مرعوب ہوئے بغیر ادب کے دائرے میں رہ کر مجھ سے دلیل مانگی اور مجھے افسوس ہے کہ صرف ایک پگھی نے یہ جرات کی۔ باقی سب خاموش رہیں۔ وہ سوناٹوے لڑکیوں میں یقیناً ”ابھی یہ کی موجود ہے جو

کہ ایک قرآن کلاس کی ناکام کارکردگی کا ثبوت ہے۔ کیا کوئی شخص ڈگریوں کا پلندہ لے کر آپ کے سامنے آئے، خود کو سب سے بڑا مذہبی اسکالر بتائے۔ تو آپ اس کی بات کو بطور دلیل مان لیں گے، کیا آپ کو پہلے دن ہی نہیں بتایا گیا تھا کہ دلیل صرف قرآن یا حدیث ہوتی ہے؟ کسی عالم کی بات دلیل نہیں ہوتی پھر؟“  
بہت سے گلابی اسکارف میں لپٹے سر جھک گئے۔

محمل سرخرو سی اپنی نشست پہ بیٹھی۔  
ڈاکٹر سرور اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر وہ سورہ المدثر کھول کر اس آیت کو کاؤنٹر چیک کر رہی تھی۔

(سورہ المدثر کی 43-47 تک کا ترجمہ ڈاکٹر سرور کی تصدیق کر رہا تھا)  
”محمل!“

لیکچر کے بعد وہ کارڈیڈور میں سے گزر رہی تھی جب فرشتے نے اسے پیچھے سے پکارا۔ اس کے قدم وہیں ٹھم گئے۔ مگر وہ مڑی نہیں۔ فرشتے تیز چلتی ہوا اس کے قریب آئی۔

”آئی ایم پراؤڈ آف یو، محمل!“ وہ یقیناً بہت خوش تھی۔ گرے اسکارف میں مقید اس کا چہرہ مک رہا تھا۔ محمل اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”ڈاکٹر سرور تم سے بہت خوش ہیں، انہوں نے ایک سیمینار کے لیے تمہارا نام دے دیا ہے، اور تم میرے ساتھ ادھر جا کر اسپینچ کرو گی۔“

”آپ کے ساتھ؟“ وہ بولی تو اس کی آواز میں خزاؤں کی سی خشکی تھی ”پھر مجھے نہیں جانا۔“  
”کیا مطلب؟“ فرشتے کی مسکراہٹ پہلے مدھم ہوئی اور پھر آنکھوں میں حیرت ابھری۔

”مجھے جھوٹے لوگ سخت ناپسند ہیں!“  
”محمل!“ وہ ششدر رہ گئی ”میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟“

”یہ سوال آپ خود سے کیوں نہیں کرتیں۔؟“  
”تم سے کسی نے کچھ کہا ہے؟“  
”میں بچی نہیں ہوں فرشتے۔“ وہ گویا پھٹ پڑی

تھی۔ اندر ابلتے لاوے کو باہر کا راستہ نظر آ گیا تھا۔  
”آپ کیوں گئیں میرے آغا جان کے پاس؟ کیا لگتے ہیں وہ آپ کے؟ میں ایک یتیم لڑکی ہوں، کیا آپ کو یتیم کے مال میں سے حصہ چاہیے؟ کیوں کی آپ نے ایسی حرکت؟ آپ کو جانے کس اونچی مسند پہ بٹھا رکھا تھا میں نے، بہت بری طرح خود کو گرایا ہے آپ نے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ایسے کریں گی، کیا رشتہ ہے آپ کا مجھ سے؟ آپ جھوٹ نہیں بولتیں، مگر سچ چھپانا بھی تو جھوٹ ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا، آپ کی پچھو کی بیٹی کا کیا نام ہے، آپ نے نہیں بتایا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟“

فرشتے کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ جذبات سے عاری، بالکل ساکت، جامد، وہ بنا پلک جھپکے محمل کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ کچھ کہہ نہ سکی پھر آہستہ سے لب کھولے۔

”کیونکہ میری پچھو کی بیٹی کا نام فاطمہ ہے۔“  
”جی؟“ اس کا دل غمک سے اڑ گیا۔

”میں نے کہا تھا کہ تم نہیں جانتیں۔ میری پچھو کی بیٹی کا نام فاطمہ ہے۔ میں فرشتے ابراہیم ہوں، آغا ابراہیم کی بیٹی جاؤ اپنے گھر میں کسی سے پوچھو، مگر وہ کیوں بتائیں گے؟ وہ میری حیثیت تسلیم نہیں کرتے تو کیسے بتائیں گے۔“

”وہ تھکے تھکے انداز میں کہہ کر اس کے ایک طرف سے نکل کر چلی گئی۔ محمل مڑ کر اس کو جاتا ہی نہ دیکھ سکی۔ اسے تو جیسے کسی نے ادھر ہی برف کا بنا دیا تھا۔ وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بچ کر ڈیڈور میں بت بنی کھڑی تھی۔

”فرشتے ابراہیم۔“  
”آغا ابراہیم کی بیٹی۔“  
اسے پوری مسجد میں ان چند الفاظ کی گونج پلٹ پلٹ کر سنائی دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆  
اسے نہیں معلوم وہ کن قدموں پہ چل کر مسجد کے



گیٹ تک آئی تھی۔ بس وہ پھر کب تک بنی خود کو گھسیٹی ہر شے سے غافل چلتی جا رہی تھی۔ اس کا بیگ اور کتابیں کلاس میں رہ گئے تھے اس نے انہیں ساتھ نہیں لیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بہت کچھ مسجد میں کھو گیا ہے وہ کیا کیا سمیٹتی؟

براہِ روا لے بنگلے کی دیوار کے ساتھ نصب بیچہ وہ گر سی گئی۔

”آغا ابراہیم کی بیٹی۔ فرشتے ابراہیم۔“

اس کا دل غ انہی دو جملوں پہ منجمد ہو گیا تھا۔ آگے بڑھتا تھا نہ پیچھے۔

دور کہیں یاد کے پردے پہ آغا جان کی آواز لہرائی۔

”اس لڑکی سے کچھ بعید نہیں۔ آج پھر میرے آفس آگئی تھی۔“

”پھر آگئی تھی اس کا ذہن جیسے چونک کر بیدار ہونے لگا تھا۔ پھر کا مطلب تھا وہ پہلے بھی ادھر جاتی رہتی تھی۔ وہ سب اس کو جانتے تھے۔ اور شاید اس سے خائف بھی تھے۔ تو کیا وہ واقعی آغا ابراہیم کی بیٹی تھی؟

”نہیں!“ اس نے تنفر سے سر جھٹکا ”آغا ابراہیم کی صرف ایک بیٹی ہے اور وہ ہے محمل ابراہیم۔ میری کوئی بہن نہیں ہے میں نہیں مانتی۔“

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلا رہی تھی اسے لگ رہا تھا آج اس کے دل غ کی رگ پھٹ جائے گی۔ غصہ تھا کہ اندر ہی اندر ابلا جا رہا تھا۔

”کیا واقعی وہ ابابکی بیٹی ہے؟ مگر اس کی ماں کون ہے؟ میری اماں۔؟ نہیں۔ مگر مجھے کون بتائے گا؟ آغا جان اور تائی تو کبھی نہیں۔ اماں کو تو شاید بتا بھی نہ ہو۔ پھر کس سے پوچھوں؟“

وہ چکر اُڑ رہی گئی اور سردیوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے جیسے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”ہمایوں!“ اور پھر اس نے کچھ نہیں سوچا اور گیٹ کی طرف لپکی۔

\*\*\*

”صاحب اندر ہیں؟ مجھے اندر جانا ہے۔“

”جی“ آپ چلی جاؤ۔“ چوکیدار فوراً سامنے سے ہٹا۔ وہ اندر کی طرف دوڑی۔ شاہانہ طرز کا لاؤنج خالی تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھی، پھر کچن کے کھلے دروازے کو دیکھ کر رکی۔ کچھ سوچ کر وہ کچن میں آئی۔ ماربل فلور کا چمکتا صاف ستھرا کچن خالی بڑا تھا۔ چیموں کا اسٹینڈ سامنے ہی تھا۔ اس نے لپک کر ایک بڑی چھری نکالی اور آستین میں چھپا کر ہار آئی۔

”ہمایوں؟“ لاؤنج میں کھڑے گردن اوپر کر کے اس نے پکارا۔ آواز گونج کر لوٹ آئی۔ اس کا کمرہ اوپر تھا یہ تو اسے یاد تھا۔ وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سیاہ ماربل کی چمکتی سیڑھیاں گولائی میں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ بالائی منزل پہ رکی، ادھر ادھر جھانکا، پھر تیسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف جانے لگی۔ دفعتاً سامنے والے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

”بلقیس؟“ وہ اندر سے غالباً ”علازمہ کو آواز دے رہا تھا۔“

وہ دوڑ کر اس کمرے کے دروازے تک آئی۔

”دروازہ کھولیں!“ اس نے دروازہ زور سے بجایا، اور پھر دھڑا دھڑا بجاتی چلی گئی۔

”کون؟“ ہمایوں نے حیران ساہو کر دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا تھا۔

”تم؟ خیریت؟“

”مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے، ٹھیک ٹھیک بتائیے گا۔“ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا!“

وہ اتنے جارحانہ انداز میں غرائی تھی کہ وہ پریشان ہی ہو گیا۔

”کیا ہوا ہے محمل؟“

”میری بات کا جواب دیں۔“

”اچھا اندر آ جاؤ“ وہ اسے راستہ دیتے ہوئے پیچھے ہوا۔ بلیک ٹراؤزر پہ گرے آدھے بازوؤں والی شرٹ پہنے ہاتھ میں تولیہ پکڑے وہ غالباً ”ابھی نما کر لگا تھا۔ ماتھے پہ بکھرے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔“

”وہ دو قدم اندر آئی یوں کہ اب دروازے کی

چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

”آپ فرشتے کے کزن ہیں؟“

”ہاں کیوں؟“

”فرشتے کس کی بیٹی ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟“

”باپ؟“ وہ ذرا سا چونکا ”اس نے تم سے کچھ کہا ہے۔“

”میں نے پوچھا ہے۔ فرشتے کس کی بیٹی ہے؟“ وہ دبی دبی سی غرائی تھی۔

”ادھر بیٹھو آرام سے بات کرتے ہیں۔“ وہ اس کو راستہ دیتا اس کے بائیں طرف سے قریب آیا۔

”میں بیٹھنے نہیں آئی مجھے جواب چاہیے۔“

”ادھر بیٹھو تو سہی، ٹھنڈے دماغ سے میری بات سنو۔“ وہ بچوں کی طرح اسے ہلاتے ہوئے آگے بڑھا، اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

”ہاتھ مت لگائیں مجھے۔“ وہ دھک کر پیچھے ہٹی۔

”محمل! ادھر آؤ۔ وہ دو قدم آگے اس کے قریب آیا

یہی تھا کہ محمل نے اچانک آستین میں چھپی چھری نکال لی۔

”مجھے آپ پہ ذرا بھروسہ نہیں ہے۔ دور رہیں۔“ وہ چھری کی نوک اس کی طرف کیے دو قدم مزید پیچھے ہٹی۔

”جی۔“

”چھری کیوں لائی ہو؟ مجھے مارنے؟“ اس کے ماتھے پہ ہل پڑے اور آنکھوں میں غصے کی لہر ابھری۔ وہ تیزی سے بڑھا اور محمل کا چھری والا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر مروڑا۔

”چھوڑیں مجھے ورنہ میں آپ کو مار دوں گی۔“ وہ اس کی مضبوط گرفت کے باوجود کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے کندھے کو پیچھے دھکیلنا چاہا۔ ہمایوں اس کے چھری والے ہاتھ کا رخ دوسری طرف موڑ رہا تھا اور پھر اسے پتا بھی نہیں چلا اور چھری کی تیز دھار گوشت میں گھسی چلی گئی۔

محمل کو لگا وہ مرنے والی ہے اس نے خون ابلتے ہوئے دیکھا اور پھر اپنی چیخ سنی۔ مگر نہیں اسے چھری

نہیں لگی تھی۔ پھر؟

وہ کراہ کر پیچھے ہٹا تو محمل کی کلائی آزاد ہو گئی۔ ہمایوں کے دائیں پہلو میں سے خون ابل رہا تھا۔ وہ چھری پہ ہاتھ رکھے لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

”اوہ میرے اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا۔“ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

چھری پہ رکھا ہمایوں کا ہاتھ خون سے سرخ پڑنے لگا تھا۔ وہ درد کی شدت سے آنکھیں بند کیے دیوار کے ساتھ بیٹھتا چلا گیا۔

وہ دہشت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کانپنے لگا تھا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس نے کہا ہے خدا یا یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتی قدم قدم ہٹنے لگی، اور پھر ایک دم مڑی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی گئی۔ پوری قوت سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ باہر بھاگی تھی۔

چوکیدار گیٹ پہ نہیں تھا، کہاں تھا اسے پروا نہ تھی۔ وہ تیز دوڑتی ہوئی مسجد میں داخل ہوئی تھی۔

”فرشتے۔ فرشتے کدھر ہیں؟“ پھولی سانسوں کے درمیان پوچھتی وہ ذرا دیر کو روک سہن پہ رکی تھی۔

”فرشتے تباہی لا رہے ہیں میں ہوں گی یا“

اس نے پوری بات نہیں سنی اور راہداری میں دوڑی گئی۔

لا سبریری کے اسی کونے میں کرسی ڈالے وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ بدحواس سی بھاگتی ہوئی اس کے سامنے جا رہی۔

آہٹ پہ فرشتے نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اسے دیکھ کر اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

”میں جانتی ہوں تم ہرٹ ہوئی ہو۔“ ایک گہری سانس لے کر وہ اپنی رو میں کہنے لگی گئی ”اور میں اسی ڈر سے تمہیں یہ پہلے نہیں بتا۔“ کہتے کہتے فرشتے نے نگاہیں اٹھائیں۔ اور پھر اگلے الفاظ اس کے لبوں پہ دم توڑ گئے۔

محمل کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

251

مئی 2011



”محمل کیا ہوا؟“ وہ پریشان سی کھڑی ہوئی۔  
”فرشتے فرشتے۔۔۔ وہ ہمایوں۔۔۔ وہ رو دینے کو تھی۔“

”کیا ہوا ہمایوں کو؟ بتاؤ، محمل!“ اس نے فکر مندی سے محمل کو دونوں شانوں سے تھام کر پوچھا۔

”وہ۔۔۔ ہمایوں۔۔۔ ہمایوں مر گیا۔“  
محمل کے شانوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔  
اسے لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔  
”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں نے جان۔۔۔ جان بوجھ کر نہیں۔ ہمایوں کو۔ وہ اسے چھری لگ گئی۔ میں نے غلطی سے اسے میری۔“

”وہ کدھر ہے۔ ابھی؟“ فرشتے نے تیزی سے بات کاٹی۔

”اپنے گھر۔۔۔ بیڈ روم میں۔“

فرشتے نے اگلا لفظ نہیں سنا اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتی تو ہمیشہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ آج اس نے اس کا ہاتھ نہیں تھامتا تھا۔ آج وہ اکیلی بھاگی تھی۔  
اسے خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بھی فرشتے کے پیچھے لپکی تھی۔

”ہمایوں۔ ہمایوں۔“ وہ محمل کے آگے بھاگتی ہوئی ہمایوں کے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اسے آوازیں دیتی میز پر ہیاں چڑھ رہی تھی۔  
”ہمایوں؟“

وہ آگے پیچھے گول میز میزوں کے دہانے پر رکی تھیں۔ ہمایوں کمرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگا زمین پر بیٹھا تھا۔ خون آلود چھری اس کے ایک طرف رکھی تھی۔

”ہمایوں! تم ٹھیک ہو۔“ وہ پریشان سی گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی۔ اس نے جیسے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

”تم ادھر۔۔۔؟“ اپنے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی فرشتے سے ہوتی ہوئی اس کی نظر اس کے پیچھے کھڑی

محمل پر جارکی۔

”مجھے محمل نے بتایا کہ۔“

”فرشتے تم جاؤ اور اس بے وقوف لڑکی کو بھی لے جاؤ۔“

”مگر ہمایوں۔“

”میں نے احمر کو کال کر دیا ہے، پولیس پہنچنے والی ہے، تم دونوں کی ادھر موجودگی ٹھیک نہیں ہے، جاؤ۔“  
وہ دردی شدت سے بدقت بول رہا تھا۔

”مگر۔۔۔“ فرشتے نے تذبذب سے گردن موڑ کر محمل کو دیکھا جو سفید پڑتا چہرہ لیے ادھر کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس وقت کیا کرے۔

”میں نے کہنا۔۔۔ جاؤ۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلایا تھا۔

”اچھا۔“ وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ بے شک مجھے پولیس پکڑ لے، مگر میں۔“

”محمل جاؤ!!!!“ وہ زور سے چیخا تھا۔

”چلو محمل۔“ فرشتے نے جیسے فیصلہ کر کے اس کا ہاتھ پکڑا اور میز پر ہیاں اترنے لگی۔

”ہمایوں! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ آئی ایم سوری۔۔۔ آئی ایم ریلی۔“ فرشتے اس سے آگے اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی میز پر ہیاں اتر رہی تھی، مگر وہ اسی طرح گردن موڑ کر ہمایوں کو دیکھتی روپاسی سی کہے جا رہی تھی۔

”جسٹ گو!“ وہ وہیں سے صخبلا کر بولا تھا۔ وہ اب میز میزوں کے درمیان میں تھیں، وہاں سے اسے ہمایوں کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ فرشتے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے باہر لے آئی تھی۔

”تم کیوں گئیں اس کے گھر محمل؟ مجھے بتاؤ، ادھر کیا ہوا تھا؟“ مسجد کے گیٹ پر فرشتے نے پوچھا تو اس نے اپنا ہاتھ نوز سے چھڑایا۔

”محمل! ناراض مت ہو۔ ابھی وہاں میری اور تمہاری موجودگی ٹھیک نہیں ہے۔“

”وہ ادھر مر رہا ہے اور آپ۔۔۔“ اس کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔

”وہ ابھی اسے ہسپتال لے جائیں گے، زخم بہت زیادہ نہیں تھا، وہ ٹھیک ہو جائے گا، مگر تم نے کیوں مارا اسے؟“

”میں بھلا یوں ہمایوں کو مار سکتی ہوں۔ میں کر سکتی ہوں ایسا؟“ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ فرشتے بری طرح سے چونکی تھی۔ محمل کے چہرے پر چھایا حزن، ملال، اور وہ آنسو۔ وہ عام آنسو تو نہ تھے۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا ایسا۔ آئی سوئیر۔“

”اچھا اندر آؤ، آرام سے بات کرتے ہیں۔“ اس نے خود کو سنبھال کر کہنا چاہا مگر وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی۔

”انہوں نے بھی یہی کہا تھا۔ میرا قصور نہیں تھا۔“  
وہ اسی طرح گیٹ پر کھڑی روئے چلی جا رہی تھی۔ ”وہ ٹھیک تو ہو جائیں گے فرشتے؟“

”ہوں۔“ فرشتے نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی۔ بس کم صدمہ سی اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی عام آنسو نہ تھے۔

”میں گھر جا رہی ہوں۔ پلیز۔ آپ مجھے ہمایوں کے بارے میں بتاتی رہے گا۔“

”اچھا۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔

محمل اب درختوں کی باز کے ساتھ دوڑتی ہوئی دور جا رہی تھی۔ وہ جیسے ندھال سی گیٹ سے لگی، ٹیک اسے دیکھے گئی۔

ہاں وہ آنسو بہت خاص تھے۔

\*\*\*

ہسپتال کا ٹائلز سے چمکتا کاریڈور خاموش پڑا تھا۔ کاریڈور کے انتہام پر وہ بیچ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ محمل جو دوڑتی ہوئی ادھر آ رہی تھی، اسے بیٹھے دیکھ کر لمحے بھر کو ٹھکی رکی، پھر بھاگتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

”فرشتے۔ فرشتے۔“

فرشتے نے ہاتھوں میں گرا سر اٹھایا ”وہ کیسا ہے؟“

محمل اس کے سامنے بچوں کے بل بیٹھی اور دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے۔

”بتائیں نا، وہ کیسا ہے؟“ وہ بے قراری سے اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھتی، جواب تلاش کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔“ وہ بھی محمل کی بھوری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”میں اس سے مل سکتی ہوں؟“

”اچھا، وہ ہوش میں نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ تڑپ کر بولی تھی، وہ فجر کا وقت تھا اور جیسے ہی فرشتے نے اسے اطلاع دی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

”ڈاکٹرز نے خود اسے سلا رکھا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا محمل! تم پریشان نہ ہو۔“

”میں کیسے پریشان نہ ہوں؟ میں نے ان کو چھری ماری ہے۔ میں۔“

”ایسا کیا ہوا تھا محمل؟ تم نے کیوں کیا ایسے؟“

”میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں ان سے ہونے لگی تھی کہ۔۔۔“ وہ لب کھاتی ڈنڈبائی آنکھوں سے آنسو چلی گئی۔ فرشتے اسی تھکے تھکے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم مجھ سے پوچھ لیتیں محمل! اس کو۔ خیر چھوڑو کوئی بات نہیں۔“

چند لمحے یونہی سرک گئے۔ وہ اسی طرح فرشتے کے سامنے فرش پر دوڑا نو بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک فرشتے کے گھٹنوں پر تھے۔ بہت دیر بعد اس نے خاموشی کو جبر دیا۔

”آپ نے کہا، آپ آغا براہیم کی بیٹی ہیں؟“

”ہاں۔ میں آغا براہیم کی بیٹی ہوں۔“

”میرے ابا کی۔۔۔؟“ اس کا گلہ بندھ گیا۔

”تمہیں یہ انہونی کیوں لگتی ہے؟ سوائے تمہارے، تمہارے سب بیٹوں کو علم ہے۔ تمہاری امی کو بھی۔“

”امی کو بھی؟“ اسے جھٹکا لگا تھا۔

”امی کو بھی؟“ اسے جھٹکا لگا تھا۔

باقی آئندہ شمار میں





محمل ابراہیم، آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تاپا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً "تائی متاب" کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور متاب تائی، نواد، حنان، وسیم، سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور نقضہ چچی کے تین بچے حسن، ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعبداللہ لائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو، معیز اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں مائی متاب اور آغا کریم کے فرزند نواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو، فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی متاب کے خاندان کی اس دکھتی رگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ نواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو، سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک براسر اور سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی، حال، مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل، آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکالرشپ مل

Scan & PDF  
FIAZ AHMED  
Friends Korner.com



جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایرونا نیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانس سونگھ جاتا ہے۔ تائی متاب فوراً انکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جھٹاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آکر مشینیں دیکھنے اور جاب کرنے کے لیے آقا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محل اس پر سراسر لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی تائی متاب سب کے ساتھ اسے رگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ تائی متاب اپنی بے عزتی پر بے حد تملاتی ہیں۔ محل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت سستی بھی سناتی ہے۔ اس رد عمل پر وہ لڑکی بھگی جاتی ہے۔

آقا فواد سب سے چھپ کر محل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی ممکنہ پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن محل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میرٹ میں ڈنر کا جھانسا دے کر فواد محل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ذیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈر امار چاکر محل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محل کو آقا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اسے ایس بی کے سامنے محل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محل چکر اکر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آقا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں محل کی آقا فواد سے بات کروا تا ہے تو وہ اسے رات اسی کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ محل اس دھوکہ دہی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کو بھی گے برابر میں سدرہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ محل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آقا کریم اور تمام بچپا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آقا فواد نے دھوکے سے اسے ذیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آقا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کروا دیتی ہے۔ تائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آقا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ مصلحتاً محل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس معاملے میں محل کو بھی قصور وار سمجھتی ہیں۔ محل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدد سے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آقا فواد کے خلاف محل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھروالوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محل کو بری طرح زدوکوب کرتے ہیں۔ وہ رو کر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ حسن گھروالوں کے اس سلوک پر ششدر رہے۔ مسرت محل کو آقا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محل انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے مصلحتاً جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا، وہ ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

چوکی قیظ

”ہاں۔ اب مجھ سے ملنے تھے۔ میری امی ان کی فرسٹ وائف تھیں ڈائوورس کے بعد امی اور اب الگ ہو گئے تھے پھر انہوں نے تمہاری امی سے شادی کی۔ دونوں ان کی پسند کی شادیاں تھیں ہے نا عجیب بات؟ خیر مجھ سے وہ ہر ایک اینڈ یہ ملنے آتے تھے میں اپنے چچاؤں سے متعارف تو نہ تھی مگر وہ سب جانتے تھے کہ میں کون ہوں کدھر رہتی ہوں۔ مگر اب انکی ڈنٹھ کے بعد انہوں نے مجھے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ میں بہت دفعہ اپنا حق مانگنے لگی، مگر وہ نہیں دیتے۔ اب انکی پہلی شادی خفیہ بھی سوائے ہمارے بیٹوں کے خاندان میں کسی کو علم نہ تھا۔ تم سے بھی چھپا کر رکھا گیا کہ کہیں تم میرے ساتھ مل کر حصہ نہ مانگنے کھڑی ہو جاؤ۔“

آپ نے کیس کیوں نہیں کیا ان پر؟ بہت دیر بعد وہ بول پاتی تھی۔ ”مجھے جائیداد سے حق نہیں، رشتوں سے حق چاہیے محل! میں بہت دفعہ تمہارے گھر پہ گئی ہوں، مگر اندر داخلہ۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے میں کئی برسوں سے اپنے حق کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ وارث اللہ نے بنائے ہیں اب انکی وارث ہوں۔ یہ ہی سوچ کر اب میں جائیداد میں سے حصہ مانگتی ہوں، مگر۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

”آپ کو پتا تھا میں آپ کے بارے میں نہیں جانتی؟“

”ہاں مجھے پتا تھا۔ میں نے جب بھی تم سے ملنے کی کوشش کی، کریم تایا نے یہ ہی کہہ کر روک دیا کہ محل ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو جائے گی اور اب اسے نفرت کرے گی پھر میں نے صبر کر لیا۔ میں جانتی تھی جو رب بن یا مین کو یوسف علیہ السلام کے پاس لاسکتا ہے وہ محل کو بھی میرے پاس لے آئے گا۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔ محل کو لگا اس کی سنہری آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

”فواد بھائی ان کا کیس۔“

”ہمایوں نے مجھے بتایا تھا کہ میرے کزن فواد نے

اس کے ساتھ کسی لڑکی محل کا معاملہ طے کیا ہے۔ کم عمر ہے اور خوب صورت بھی۔ میرا دل تب ہی سے کھٹک گیا تھا۔ مگر ہمایوں ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ فواد تمہارے ساتھ یہ کر سکتا ہے۔ اسے گمان تھا وہ کوئی اور لڑکی ہوگی۔ مگر جس لمحے میں نے مسجد کی چھت پہ تمہیں دیکھا تھا میں تمہیں پہچان گئی تھی۔“

”آپ نے تو مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا پھر۔“

”دیکھا تھا ایک دفعہ تمہارے اسکول آئی تھی تم سے ملنے۔ بیچ پہ بیٹھی تھیں دیکھتی ہی رہی، تم ابھی ابھی چڑچڑی سی لگ رہی تھیں پھر مجھ سے تمہیں مزید ذہنی اذیت نہیں دی گئی سو واپس پلٹ گئی۔“

فرشتے تھک کر چپ ہو گئی شاید اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ وہ یاسیت سے اسے دیکھے گئی جو بہت تھکی تھکی نظر آرہی تھی۔ بہت دیر بعد اس نے پھر لب کھولے۔

”تم خوش قسمت ہو محل! کہ تم رشتوں کے درمیان رہی ہو۔ تم یتیم نہیں رہی ہو۔ یتیموں والی زندگی تو میں نے گزاری ہے۔ اس کے باوجود میں نے کبھی یتیمی کا لیبل خود پہ نہیں لگایا۔ میری خالہ اور ہمایوں یہ ہی تھے میرے رشتے اور اب میرے پاس کھونے کو مزید رشتے نہیں بچے، ایک چیز مانگوں تم سے؟ کبھی مجھے اس آزمائش میں مت ڈالنا، میں مزید رشتے کھونا۔“

”اے ایس بی صاحب کے ساتھ آپ ہیں؟“ آواز یہ ان دونوں نے چونک کر سرائیایا۔ سامنے یونیفارم میں ملبوس نرس کھڑی تھی۔

”جی۔“ محل اس کے گھٹنوں سے ہاتھ ہٹاتی ہے چینی سے اٹھی۔

”ان کو ہوش آگیا ہے اب خطرے سے باہر ہیں آپ ان کی؟“

”میں۔ میں ان کی فریڈ ہوں۔“ اس نے جلدی سے فرشتے کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ”یہ ہمایوں صاحب کی بہن ہیں۔“

”بہن؟“ اس نے چونک کر محل کو دیکھا، مگر وہ



نرس کی طرف متوجہ تھی۔ ”ہسن؟“ وہ ہولے سے زیر لب بددعا کی۔ پھر لگا سانس میں سر ہلایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حمل نرس کے پیچھے جا رہی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہ سنا۔

وہ خالی ہاتھ بیٹھی رہ گئی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں شام اتر آئی تھی، حمل وہ شام نہ دیکھ سکی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر ہمایوں کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

وہ بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹا تھا اور چادر پڑی تھی۔ آہٹ پہ قدرے نقاہت سے آنکھیں کھولیں۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”حمل!“ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے جا رکی۔

بھورے سلی بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے فیروزنی شلوار قمیص ہم رنگ دوپٹہ شانوں پہ پھیلائے وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری، ہمایوں!“ آنسو آنکھوں سے پھسل پڑے تھے وہ بدقت مسکرایا۔

”ادھر آؤ۔“ وہ چند قدم آگے بڑھی۔

”مٹی غصے میں کیوں تھیں؟“ ”مجھے معاف کر دیں پلیز۔“ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ہمایوں نے بایاں ہاتھ اٹھایا اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا۔

”تم نے کیوں کہا تمہیں مجھ سے کوئی امید نہیں؟“ ”تو کیا رکھتی؟“ اس کے دونوں ہاتھ اور ہمایوں کا ہاتھ اور تلے ایک دوسرے میں بند ہو گئے تھے۔

”تمہیں لگتا ہے میں بچہ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے ہوں؟“ ”کیا نہیں ہیں؟“ آنسو اسی طرح اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔

”کیوں اتنی بدگمان رہتی ہو مجھ سے؟“

”بدگمان تو نہیں ہوں۔“ ”پھر چھری کیوں لائی تھیں؟ تمہیں لگتا تھا تم میرے گھر غیر محفوظ ہوگی؟“ وہ نرس سے کہہ رہا تھا۔

”آپ مجھے معاف کر دیں پلیز، آپ نے معاف کر دیا تو اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا۔“

”آپ آرام کریں، مجھے مدد سے بھی جانا ہے۔“ وہ دروازے کی طرف لپکی تھی۔

”مست جاؤ۔“ وہ بے اختیار لگا اٹھا تھا۔ ”میں گھر سے مدد سے کا کہہ کر نکلی تھی اگر نہ گئی تو یہ خیانت ہوگی اور پل صراط پہ خیانت کے کانٹے ہوں گے مجھے وہ پل پار کرنا ہے۔“

”تھوڑی دیر رک جاؤ گی تو کیا ہو جائے گا؟“ وہ جھنجھالیاتھا۔

”یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے اور۔“ ”تھک ہے تھک ہے، ماوام، آپ جا سکتی ہیں۔“

وہ مسکراہٹ بنا کر بولا تو اسے لگا وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے۔

”سوری۔“ ایک لفظ کہہ کر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

فرشتے اسی طرح بیچ پہ بیٹھی تھی۔ آہٹ پر سر اٹھایا۔

”میں چلتی ہوں فرشتے! مجھے مدد سے جانا ہے۔“ نامحسوس انداز میں اس نے اپنا ہاتھ دوپٹے کے اندر کیا کہ کہیں وہ اس پہ کسی کا لس نہ دیکھ لے۔

”مل لیں ہمایوں سے؟“ اس کی آواز بہت پست تھی۔

”ہاں۔“ اس نے بے اختیار نگاہیں چرائیں، فرشتے اسی طرح گردن اٹھا کر اسے دیکھتی جانے اس کے چہرے پہ کیا کھوج رہی تھی۔ وہ جیسے گھبرا کر جانے کو پلٹی۔

”حمل سنو!“ وہ جیسے بے چینی سے پکارا تھی اور اس سے پہلے کہ وہ چلتی اس نے نفی میں سر ہلاتے دھیرے سے کہا۔ ”نہیں کچھ نہیں جاؤ۔“

”نہیں پتہ؟“ ”جاؤ، تمہیں درہور ہی ہے۔“

”اوکے، السلام علیکم۔“ وہ راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتی دور ہوتی گئی۔ فرشتے نے پھر سے سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

اس کا دل بہت بو جھل سا ہو رہا تھا۔ مدد سے اگر بھی اسے سکون نہ مل رہا تھا۔ اسے تھوڑی دیر ہو گئی تھی اور تفسیر کی کلاس وہ مس کر چکی تھی۔ سارا دن وہ یوں ہی مضطرب سی پھرتی رہی۔ بریک میں ساریہ نے اسے جا لیا۔ وہ برآمدے کے اسٹیشن پر بیٹھی تھی۔ گود میں کتابیں رکھے چہرے پہ بے زاری سجائے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ سارا دھپ سے ساتھ آ بیٹھی۔

”نہیں۔“ وہ جھنجھلاتے ہوئے گود میں رکھی کتاب کھولنے لگی۔

”پھر بھی کوئی مسئلہ ہے؟“ ”ہاں ہے۔“

”کیا ہوا ہے؟“ ”اللہ تعالیٰ۔۔۔ بس۔۔۔“ وہ سر جھٹک کر صفحے پلٹنے لگی۔

”بیاناؤ۔“ ”اللہ تعالیٰ ناراض ہیں۔ ویش اٹ!“ زور سے اس نے کتاب بند کی۔

”اوہو، تم خواجواہ قنوطی ہو رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ کیوں ناراض ہوں گے بھلا؟“

”بس ہیں نا!“ ”تمہیں کیسے پتا کہ وہ اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں کیسے پتا کہ وہ ناراض ہیں؟“

”ایک بات بتاؤ!“ وہ جیسے کوفت زدہ سی اس کی

طرف گھومی۔ ”اگر تم کسی کے ساتھ چوبیس گھنٹے ایک ہی گھر میں رہو، تو گھر میں داخل ہوتے ہی تمہیں اس شخص کا موڈ دیکھ کر پتہ نہیں چل جاتا کہ وہ ناراض ہے؟“ بھلے وہ منہ سے کچھ نہ کہے، بھلے تمہیں اپنی غلطی بھی سمجھ میں نہ آ رہی ہو، مگر تم جان لیتی ہو نا کہ ماحول میں تناؤ ہے، اور پھر تم دوسروں سے پوچھتی پھرتی ہو کہ ”اسے کیا ہوا ہے؟“ اور پھر تم اپنی غلطی سوچتی ہو۔ میں بھی اس وقت یہی کر رہی ہوں سو مجھے کرنے دو!“

”تمہیں پتہ ہے اتنے عرصے سے میں روز ادھر آ کر قرآن سنتی تھی۔ آج میری تفسیر کی کلاس مس ہوئی ہے۔ آج میں قرآن نہیں سن سکی۔ تمہیں پتہ ہے کیوں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں، وہ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ سو ابھی پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو!“

سارا کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کتابیں سنبھالتی اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی اندر آئی۔

پر سیر ہال خالی پڑا تھا۔ قباں بجھی تھیں۔ وہ کھڑکی کے ساتھ آ بیٹھی۔ کھڑکی کے شیشے سے روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔

”اللہ تعالیٰ۔۔۔ پلیز۔۔۔“ الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ آنسو ٹپ ٹپ گالوں پہ گرنے لگے۔ اس نے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھا۔ یہ ہاتھ چند گھنٹے قبل ہمایوں کے ہاتھ میں تھے۔ لڑکے لڑکی کا ہاتھ پکڑنا تو اب عام سی بات بن گئی تھی مگر قرآن کی طالبہ کے لیے وہ عام سی بات نہ تھی۔ وہ کیسے جذبات کے ریلے میں بہہ گئی کہ خیال ہی نہ آیا کہ اسے یوں تنہا کسی کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمایوں نے خود کو کیوں نہ روکا؟ مگر نہیں وہ ہمایوں کو کیوں الزام دے؟ وہ تو قرآن کا طالب علم نہ تھا، طالبہ تو وہ تھی۔ سمعنا و اطعنا (ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی) کا وعدہ تو اس نے کر رکھا تھا۔ پھر؟

آنسو اسی طرح اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے وہ سر جھکائے آج کا سبق کھولنے لگی۔



اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا، ٹھیک ہے، میں لگاتی ہوں۔“  
”اور میرا قرآن؟“

”ہاں۔ وہ میں کل دھونڈ کے لے آؤں گی، ابھی تم یہ سنو، میں تیمور کو دھونڈتی ہوں۔“ اس نے پلے کا بٹن دبایا اور خود باہر نکل گئی۔

”بس شاید تم ان کے پیچھے اپنے آپ کو ہلاک کرنے والے ہو، اگر وہ اس کلام کے ساتھ ایمان نہ لائے، بہت افسوس کے ساتھ، بے شک جو بھی زمین پر ہے، ہم نے اسے اس کی خوب صورتی کے لیے بنایا ہے، تاکہ ہم ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے کون سب سے اچھے کام کرتا ہے اور بے شک ہم اس کو بنجر صاف میدان بنانے والے ہیں۔“

اس نے آنکھیں موند لیں۔ آنسو آہستہ آہستہ اس کے تکیے کو بھاگنے لگے تھے۔  
سورۃ کہف کے ساتھ اسے وہ تمام مناظر یاد آنے لگے جو کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھے۔

سنگ مرمر کی چمکتی راہ واریاں، روشنیوں سے گھرا ہاں جو اونچے سفید ستونوں پر گھرا تھا۔ مسجد کے برآمدے کے سامنے گھاس سے بھرا لان، وہ پنک اسکارف میں لپٹے بہت سے جھکے سر جو تیزی سے نوٹس لینے میں مصروف ہوتے، لائبریری کی اونچی گلاس دندوز جن سے فیصل مسجد دکھائی دیتی تھی۔ وہ کالونی کی سڑک پر درختوں کی گھنی باڑیاؤں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو اٹھ کر اس کے ذہن میں آیا تھا۔ ڈاکٹر ز ٹھیک کتے تھے وہ ذہنی طور پر بالکل فٹ تھی۔

سورۃ کہف ختم ہوئی تو کیسٹ رک گئی۔ اس نے بے بسی سے ٹیپ کو دکھا۔ وہ اس سے خاصے فاصلے پر تھا۔ وہ اٹھ کر اس کو ری پلے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کیسی بے بسی تھی، کیسی لاچار تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ہر راہ بند ہوتی دکھائی دینے لگی، ہر دروازے کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے لگا وہ اب ہمیشہ کسی اندھیرے بند کف میں مقید رہے گی۔

تیمور اور ہمایوں سے دور۔ بہت دور۔

\*\*\*

صبح وہ سو کر خاصی دیر سے اٹھی، رات بھر سونہ سکی تو فجر کے قریب ہی آنکھ لگی تھی۔

سسٹر میرین بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دوامیں رکھ رہی تھی، اسے جاگتے دیکھ کر مسکرائی۔

”گڈ مارننگ مسز ہمایوں، ہاؤ آر یو؟“

”فائن۔“ وہ جبرا ”مسکرائی، کس کا نام اس کے نام کے ساتھ جڑتا تھا، وہ جو خود ہی اس سے دور بھاگنے لگا تھا۔“

”آپ کی سسٹر صبح آئی تھیں، آپ سو رہی تھیں، وہ یہ بیک وے کر گئی ہیں۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

”فخر شے آئی تھی؟“ وہ چونکی، پھر اس کی اشارہ کردہ کتاب کی طرف دیکھا تو ٹھہری گئی۔

سیاہ ساہ جلد والی دبیز کتاب، اس کا سانس رک گیا، دل جیسے دھڑکنے لگا۔

”صحف قرآنی۔“ وہ زیر لب بڑبڑائی۔

”یہ آپ کا قرآن ہے میڈم؟“ سسٹر میرین نے اسے متوجہ پا کر احتیاط سے قرآن اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔ اس نے بے قراری سے اسے تھاما اور پھر سینے سے لگا لیا۔

”یو لو یور ہولی بک ٹو مج، رائٹ؟“ (آپ کو اپنی مقدس کتاب بہت عزیز ہے نا؟) وہ مسکرا کر کہتی اسے بیٹھنے میں مدد دینے لگی۔

”آف کورس سسٹر! وہ بہت خوش تھی۔“

پھر وہ بیٹھ گئی تو سسٹر میرین نے اس کے پیچھے تکیے سیٹ کر دیے۔

پھر سسٹر جانے کب وہاں سے گئی۔ اسے پتا بھی نہیں چلا، وہ بس اپنے قرآن میں گم تھی۔

اس نے دھیرے سے پہلا صفحہ کھولا تو عربی عبارات سے مزین اور اراق سامنے آئے، اس کا دل ایک دم رعب سے بھر گیا۔ ہاتھ ذرا سے کپکپائے، لب

رزے، آنکھوں کے گوشے بھگتے چلے گئے۔

اودہ خدایا، وہ کتنی نوازی گئی تھی۔ اسے اللہ نے اپنے کلام کو تھامنے کا موقع دے دیا تھا۔ وہ اس کی سن لیتا تھا، اور اس کو مخاطب بھی کرتا تھا۔ برسوں کا یہ ساتھ بھلا کیسے ٹوٹ سکتا تھا؟

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ اسے بھولا نہیں تھا، اس نے اسے یاد رکھا ہوا تھا۔

محمل ابراہیم اپنے رب تعالیٰ کو یاد تھی۔ کیا اسے واقعی اب کچھ اور چاہیے؟

اس نے شروع کے چند صفحات پلے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر سے پڑھنا شروع کرے۔ پھر اس نے آٹھویں رکے ایک بک مارک سے کھولا۔ وہ سورۃ بقرہ کے درمیان سے کھلا تھا۔ دوسرے سیدھے کے اوائل سے۔ برسوں پرانا بک مارک جلے کب اس نے اودھ رکھا تھا؟

اس نے دھڑکتے دل سے پڑھنا شروع کیا۔ ”بس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری مت کرنا۔“

آنسو اس کے رخساروں سے پھسل کر گردن پر لڑھک رہے تھے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے آپ کو خوشی میں یاد رکھا، آپ مجھے غم میں مت بھولیے گا، مگر لب کھل نہ پائے۔

اس نے آگے بڑھا۔

”اے ایمان والو، تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ساتھ ہی حاشے میں پین سے چھوٹا چھوٹا کچھ لکھا تھا۔ اس نے قرآن قریب کر کے پڑھنا چاہا۔ وہ اس کے اپنے لکھے تفسیر نوٹس تھے۔

”مصیبت میں صبر اور نماز وہ دو کنجیاں ہیں جو آپ کو اللہ تعالیٰ کا ساتھ دلواتی ہیں۔ ان کے بغیر یہ ساتھ نہیں ملتا۔ اس لیے کوئی مصیبت آئے تو نماز میں زیادہ توجہ اور لگن ہونا چاہیے۔ مصیبت میں خاموشی کے ساتھ اللہ کی رضا پر راضی ہو کر جو کچھ موجود ہے اس پر شکر

کرنا اور اللہ سے آگے اچھی امید رکھنا صحیح معنی میں صبر ہے۔“

یہ سب اس نے لکھا تھا؟ وہ اپنے لکھے یہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔ کلاس میں آگے بیٹھنا، پھر کی ہر ایک بات نوٹ کرنا، وہ سب اسے کتنا فائدہ دے گا، اس نے تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

اس نے قدرے آگے سے بڑھا۔

”اور البتہ ہم تمہیں کچھ چیزوں کے ساتھ ضرور آزمائیں گے۔ (یعنی) خوف سے اور بھوک سے جانوں اور مالوں کے نقصان سے۔ اور خوش خبری دے دو ان کو جو صبر کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، یہ کہتے ہیں بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ان ہی لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے عنایتیں اور رحمت ہے اور یہ ہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔“

اس نے ساتھ حاشیے میں لکھے اپنے الفاظ پڑھے۔ ”صابرین کا مصیبت یہ بس ان اللہ وانا الیہ راجعون کہہ دینا کافی نہیں ہے، بلکہ دراصل یہ الفاظ ان دو عقائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن پر جیسے بغیر کوئی صبر نہیں کر سکتا۔ اللہ (بے شک ہم اللہ کے لیے ہیں) عقیدہ توحید ہے اور وانا الیہ راجعون (بے شک ہم اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے) عقیدہ آخرت ہے ایمان ہے کہ ہر دکھ اور مصیبت ایک دن ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ ساتھ رہے گا تو صرف آپ کے صبر کا اجر۔“

اس نے اگلی آیت پڑھی۔ ”بے شک صفا اور مردہ شعائر اللہ میں سے ہیں تو جو کوئی حج کا ارادہ کرے۔“

صبر کے فوراً بعد صفا مردہ اور حج کا ذکر؟ وہ ذرا حیران ہوئی، پھر اپنے ہاتھ کے لکھے نوٹس پڑھے۔

”صفا اور مردہ دراصل ایک عورت کے صبر کی نشانی ہیں، جب آپ کو بے قصور کسی تپتے صحرا میں چھوڑ دیا جائے اور آپ اس توکل پر کہ اللہ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا، صبر کریں تو پھر زم زم کے پیٹھے چشے

نہیں کرے گا، صبر کریں تو پھر زم زم کے پیٹھے چشے



freedom to live happily!

freedom®

freedom  
STICK ON  
16  
THIN  
HAPPY

freedom  
STICK  
16  
THIN  
HAPPY

444/444/444

”شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔“  
بست دیر سے روتے دل کو ذرا امید بندھی۔ ذرا اقرار  
آیا۔

یہ توبہ کی قبولیت کی نوید تو نہ تھی، مگر امید ضرور  
تھی۔

اس نے آہستہ سے قرآن بند کیا۔ میڈم مصباح  
کہتی تھیں، ”اگر قرآن کی آیات میں آپ کے لیے  
ناراضی کا اظہار ہو تو بھی بخشش کی امید رکھا کریں۔ کم  
از کم اللہ آپ سے بات تو کر رہا ہے۔“

”وہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔“ حمل نے اٹھتے ہوئے  
سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆  
مستاب تائی نے کرے کے کھلے دروازے سے  
اندر جھانکا۔

”حمل سے کمو شاپنگ کے لیے چلے۔ اس کے  
جوتے کا ناپ لیتا ہے۔ ورنہ بعد میں خود گمے گی کہ پورا  
نہیں آتا۔“

وہ بیڈ پر کتابیں کھولے بیٹھی تھی، جبکہ مسرت  
الہاری سے کچھ نکال رہی تھیں۔ تائی کی آواز پہ دونوں  
نے بری طرح چونک کر انہیں دیکھا تھا جو اسے نظر  
انداز کیے مسرت سے مخاطب تھیں۔

(تو وہ و سیم والا قصہ ابھی تک باقی ہے؟) اس نے  
کوفت سے سوچا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں میں پے در پے  
ہونے والے واقعات نے وقتی طور پر اسے وہ معاملہ  
بھلا دیا تھا۔ یہ بھی کہ حسن کی مخالفت ابھی برقرار تھی۔  
”مگر تائی! میں انکار کر چکی ہوں۔“

”لو کی! میں تمہاری ماں سے بات کر رہی ہوں۔“  
”مگر میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ  
نرم مگر مضبوط تھا۔

”مسرت؟ اس سے کمو تیار ہو جائے، میں گاڑی  
میں اس کا ویٹ کر رہی ہوں۔“ وہ کھٹ کھٹ کرتی  
وہاں سے چلی گئیں۔ اس نے بے بسی سے ماں کو  
دیکھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ بے بس نظر آرہی

”اللہ تعالیٰ! پلیز مجھے معاف کر دے، مجھے ہدایت پہ  
قائم رکھ۔“

اس نے دل میں دعا مانگتے ہوئے مطلوبہ صفحہ کھولا۔  
”کس طرح اللہ اس قوم کو ہدایت دے سکتا ہے جو  
اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کریں؟“

اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے۔ اس کا رب اس  
سے بہت ناراض تھا۔ اس کی معافی کافی نہ تھی۔ وہ  
سکیوں کے درمیان پھر سے استغفار کرنے لگی۔

”اور انہوں نے رسول کے برحق ہونے کے گواہی  
دی تھی، اور ان کے پاس روشن نشانیاں آئی تھیں، اور  
اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

وہ جیسے جیسے بڑھتی جا رہی تھی، اس کا رواں رواں  
کانپنے لگا تھا۔ قرآن وہ آئینہ تھا جو بہت شفاف تھا۔  
اس میں سب کچھ صاف نظر آتا تھا۔ اتنا صاف کہ کبھی  
کبھی دیکھنے والے کو خود سے نفرت ہونے لگتی تھی۔

”ان لوگوں کی جزا یہ ہے کہ بے شک ان سے اللہ کی  
لعنت ہے۔ اور فرشتوں کی اور سب کے سب لوگوں کی  
(لعنت ہے) ہمیشہ رہنے والے ہیں اس میں۔ نہ ان  
سے عذاب ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ہی وہ مہلت دیے  
جائیں گے۔“

اس نے قرآن بند کر دیا۔ یہ خالی زبانی استغفار کافی  
نہ تھا۔

اس نے نوافل کی نیت باندھی، اور پھر کتنی ہی دیر  
وہ سجدے میں گر کر روتی رہی۔ جس کے ساتھ ہرمل  
رہو، جو رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہو، اس کی  
ناراضی محسوس ہو ہی جاتی ہے اور انسان اس کی  
ناراضی دور کرنے کے لیے اتنا ہی کوشش کرتا ہے جتنی  
وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

جب دل کو کچھ سکون آیا تو اس نے اٹھ کر آنسو  
پونچھے، اور قرآن اٹھا کر ٹھیک اسی آیت سے کھولا  
جہاں سے چھوڑا تھا۔ آیت روز اول کی طرح روشن  
تھی۔

”مگر اس کے بعد جن لوگوں نے توبہ کر لی۔“ (اس  
کا دل نور سے دھڑکا) اور انہوں نے اصلاح کر لی توبہ



پھوٹے ہیں۔“

اس کے بے قرار دل کو جیسے ڈھیروں ٹھنڈک مل گئی تھی۔ آنسوؤں کو قرار مل گیا۔ اندر باہر سکون سا اثر کیا۔ اور اس کے بعد جیسے گہری خاموشی چھا گئی۔

سارے ماتم دم توڑ گئے تھے۔ اسے صبر آ ہی گیا تھا۔ اب رونے کا پھر تمام ہوا تھا۔ کتاب اللہ اس کے پاس تھی وہ رسول اللہ کی آتی تھی دین کا علم اسے عطا کیا گیا تھا۔ اب کسی شکوے کی گنجائش باقی نہ تھی۔ دور جاہلیت سے نکلنے والے انسان کی زندگی میں مکہ کی سختیاں مدینہ کی ہجرت بدر کی جیت اور احد کی شکست آتی ہے۔ طائف کے پتھر بھی آتے ہیں اور اسری اور معراج کی بلندیاں بھی۔ مگر آخر میں ایک فتح مکہ ضرور آتا ہے اور اس سفر میں کسی کا کی دور بعد میں آتا ہے اور مدنی دور پہلے آجاتا ہے۔

وہ ایک سال جو اس نے ہمایوں کے ساتھ اپنے گھر میں گزارا ایک پرسکون من چاہی ریاست میں وہ دور ختم ہو چکا تھا۔ اس کا مکہ اب شروع ہوا تھا۔ طائف کے پتھر اب لگنے لگے تھے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کمزوروں کا رب اس کے ساتھ ہے تو اسے بھی کسی عتبہ اور شیبہ کے باغ میں پناہ مل جائے گی۔ اسے بھی انکور کے خوشے مل جائیں گے۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف کی دعا یاد آئی اور اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ تب ہی دروازہ کھول کر سسٹر اندر داخل ہوئی۔ اسے جاگتا دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور آگے بڑھی۔

”کیسا میل کر رہی ہیں آپ؟“ وہ اس کے ساتھ لگی ڈرپ کو جیک کرنے لگی تھی۔

”ہوں۔“ وہ جیسے کسی خیال سے جاگی۔ ”فائن۔“ الحمد للہ۔“

”آپ کو بہت ناٹم بعد ہوش آیا ہے۔ ڈاکٹر زہوب کھو چکے تھے۔“

”معلوم نہیں۔“ وہ قدرے بے بسی سے مسکرائی۔ ”میں نے تو وقت کا تعین بھی کھو دیا تھا۔“

”مایوسی کی باتیں مت کریں میم اخداوند آپ کی

مدد کرے گا۔“

وہ ذرا سی چوکی یہ انکور کے خوشے لے کر ہمیشہ نینا کے عدا اس کیوں آتے ہیں۔ اس نے بے اختیار سوچا تھا۔

”ہاں مجھے یقین ہے وہ میری مدد کرے گا۔“ وہ کھل کر مسکرا دی۔ شاید پہلی دفعہ وہ یوں مسکرائی تھی۔ ”تمہارا اس کی مدد یہ کتنا ایمان ہے سسٹر؟“

”بہت زیادہ“ میم اکرانسٹ مدد مانگنے والوں کو خالی نہیں لوٹاتا۔“

”ہوں۔“ وہ نرمی سے مسکراتی اس کا ریتین چہرہ دیکھے گئی۔ ”تم جانتی ہو عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ قرآن کیا کہتا ہے؟“

”نگلی کو تھامے سسٹر میرن کے ہاتھ لمحے بھر کو تھمے۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت، پھر سوال ابھرا تھا۔

”محمل نے ایک ٹائیٹ کو اس کی آنکھوں میں دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔

”ہینڈ سم اسے دیری ہینڈ سم میں ہی داز مسیح عیسیٰ بن مریم۔“

”ریٹلی؟“ سسٹر میرن کی آنکھوں میں دیپ سے جل اٹھے۔

”آف کورس ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بے حد ہینڈ سم تھے بہت وجہہ صرف بیان نہیں ان کے پاس رانشنگ پاور بھی تھی۔ قلم کی طاقت وہ بہت اچھا لکھتے تھے اور جانتی ہو وہ اپنے ان مرکلز اور ٹیلنٹس کے بارے میں کیا کہا کرتے تھے؟“

”کیا؟“ وہ دم بخود بنا لیک جھپکے سن رہی تھی۔

”وہ کہتے تھے یہ مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔“ وہ سانس لینے کو رکی پھر جیسے یاد کر کے بتانے لگی۔ ”جب سے مجھے یہ بتا چلا میں اپنی کوئی بھی تعریف سن کر عیسیٰ علیہ السلام کو کوڈ کرتی تھی کوئی میری تعریف کرتا تو میں کہتی یہ مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔“

”بیوٹی فل!“ سسٹر میرن بے خود سی کہہ اٹھی۔ پھر

آہستہ سے چیزیں سمیٹنے لگی۔

”مسز ہمایوں آپ پہلی مسلم ہو جس نے بتایا ہے کہ آپ کی ہولی بک یسوع مسیح کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ ورنہ مسلم ہمیشہ بہت سختی سے کہتے ہیں کہ تمہارا عقیدہ غلط ہے۔“

”السلام علیکم!“ فرشتے نے جھانکا تم اٹھ گئیں؟“

”ہاں کب کی۔“ وہ چوکی پھر سنبھل گئی۔ فرشتے اندر چلی آئی۔ عبایا اور سیاہ حجاب کو چہرے کے گرد لپیٹے ہمیشہ کی طرح تازہ اور خوب صورت۔

”آپ نے شادی نہیں کی فرشتے!“ محمل نے کہا اور پھر اس نے دیکھا کہ فرشتے کی سنہری آنکھوں میں سایہ سا لہرایا ہے۔

”شادی میں کیا رکھا ہے محمل؟“ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”سنت سمجھ کے کر لیں۔“ وہ سر جھکائے چادر پہ انگلی سے ناؤیدہ لکیریں کھینچنے لگی۔

”پھر آپ شادی کر لیں گی نا؟“

”جب تک تم ٹھیک نہیں ہو میں میں شادی نہیں کروں گی۔“

”اور اگر میں کبھی ٹھیک نہ ہوئی تو؟“

”تو میرے لیے تم ہمایوں اور تیمور بہت ہو مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے، چلو تمہاری فزیو تھیراپسٹ آنے والی ہوگی۔ اس سے بنا کر رکھو اب اس کو بھگانا نہیں ہے۔ گھر شفٹ ہو کر بھی روز اس کی شکل دیکھنا تو ہوگی نا۔“ فرشتے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اور وہ ایک خیال اسے اطمینان بخش گیا۔

گھر۔ اس کا گھر۔ اپنا گھر۔ اس ہفتے وہ واپس چلی جائے گی۔

اس نے طمانیت سے سوچا تھا۔

سسٹر میرن فائل ہاتھ میں پکڑے پین سے اس میں کچھ اندراج کر رہی تھی۔ محمل ٹکیوں کے سہارے ٹیک لگائے خاموش

گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس کے بھورے سیدھے لمبے بال شانوں پہ پھلتے کمر پہ گر رہے تھے۔ یہ بال کبھی بے حد گھنے اور سلکی ہوتے تھے۔ مگر طویل بیماری نے انہیں بے حد پتلا اور مرجھائے پھول کی پتیوں جیسا کر دیا تھا۔

”میڈم!“ لکھتے لکھتے ایک دم سسٹر نے سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پہ یکایک ڈھیروں نظر انداز آیا تھا۔

”ہوں۔“ وہ چوٹی۔ آج کل وہ پکارے جانے پہ یوں ہی چونک اٹھتی تھی۔

”کافی دن ہو گئے وہ نہیں آئے۔“

”کون؟“

”وہ کوئی صاحب ہیں کافی عرصے سے آپ کو دیکھتے آرہے ہیں۔ کافی بڑی عمر کے ہیں اتنی لمبی داڑھی بھی ہے۔ بہت کاٹنڈ اور جینٹل سے ہیں۔“

”کب سے آرہے ہیں؟“

”میں تین سال سے ادھر ہوں، جب سے انہیں آنا دیکھتی ہوں عموماً“ فرائی ڈے کو آتے ہیں ہیں ادھر سے جھانک کر۔“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے آپ کا حال پوچھ کر چلے جاتے ہیں، کبھی آپ کے پاس رکے نہیں۔“

”کیا میرے کوئی رشتہ دار ہیں؟“ سوال کرنے کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پہ بہت سے چہرے ابھرے۔ آغا ہاؤس کے خوش حال و مطمئن چہرے، ایک کسک سی دل میں اٹھی۔ کیا ان کو وہ یاد ہوگی؟ کیا کبھی اپنے عیش و آرام سے فرمت پا کر انہوں نے اس کے لیے چند لمحے نکالے ہوں گے؟

”نہیں وہ کہتے تھے کہ وہ آپ کے رشتہ دار نہیں ہیں۔ بس یوں ہی جاننے والے ہیں۔“

”فرشتے اور میرے ہر مینڈ۔ ان کو جانتے تھے وہ؟“

”ان کے ہوتے ہوئے تو وہ کبھی نہیں آئے ہمیشہ ان کی غیر موجودگی میں آتے ہیں۔ مگر اب کافی دن ہو گئے نہیں آئے۔“

”کوئی نام آتا ہے؟“

”کبھی بتایا نہیں۔“ سسٹر اب دوبارہ فائل پہ جھکی اندراج کرنے لگی۔ وہ مایوس سی ہو گئی۔ جانے کون تھا



تھیں۔

”اماں آپ۔۔۔۔۔“

”بھی چلی جاؤ! حمل! ورنہ وہ ہنگامہ کر دیں گی۔“  
”یہ بچھتی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ نرج سی ہو کر  
کتابیں رکھنے لگی۔

”شاید حسن کچھ کر سکے۔ مجھے حسن سے بہت امید  
ہے۔“

”اور مجھے اللہ سے ہے!“ وہ کچھ سوچ کر عبایا پہننے  
لگی۔ پھر سیاہ حجاب چہرے کے گرد لپیٹنا اور پن لگائی۔  
خواتین وہ ہنگامہ کرنے کا فائدہ نہ تھا۔ چلی ہی جائے تو بہتر  
ہے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔

لاؤنج میں سیڑھیوں کے پاس لگے آئینے کے  
سامنے وہ رکی۔ ایک نظر اپنے عکس کو دیکھا۔ سیاہ  
حجاب میں سنہری چہرہ دمک رہا تھا۔ اونچی پونی ٹیل سے  
حجاب پیچھے سے اٹھ سا گیا تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔  
وہ یونہی خود کو دیکھتی پلٹی ہی تھی کہ آخری سیڑھی  
اترتے حسن پہ نظر پڑی۔

”کدھر جا رہی ہو؟“

”تائی اماں کے ساتھ شادی کی شاپنگ ہے۔“  
”تم راضی ہو حمل؟“ وہ بھونچکا سا اس کے قریب  
آیا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔

”اس گھر میں مجھے اپنی رضا سے اس فیصلے کا اختیار  
نہیں ملا حسن بھائی۔“

وہ کتنے ہی لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر  
آہستہ سے لب واکے۔

”ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“  
اور حمل کو لگا اس نے پھٹوڑے مارا ہے۔

”آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ بمشکل  
ضبط کر پائی تھی۔

”ہاں میں تمہیں اس دلدل سے نکالنے کی بات  
کر رہا ہوں۔“

”آپ کورٹ میرج کی بات؟ انا اللہ وانا الیہ  
راجعون۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ مجھ  
سے یہ بات کریں گے۔“

”تمہیں اعتراض کیوں ہے حمل! یہ تمہاری شادی  
زبردستی و سیم سے کر دیں گے اور تم۔“  
”حسن بھائی پلینز آپ کو پتا ہے کورٹ میرج کیا  
ہوتی ہے؟ سرکاری شادی کاغذوں کی شادی۔ میں ایسی  
شادی کو نہیں مانتی جس میں لڑکی کے دلی کی مرضی  
شامل نہ ہو۔“

اور میں کیوں یوں پھپھ کر شادی کر دیں گی؟ نہ آپ  
سے نہ و سیم سے۔ میرا راستہ چھوڑیں۔“ وہ بے بس  
ساسا منے سے ہٹا تو وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔  
گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھی مہتاب تائی اس کا  
انتظار کر رہی تھیں۔ وہ اندر بیٹھی اور دوا نہ ذرا زور  
سے بند کیا۔

اسی بل ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر کوئی اندر  
بیٹھا۔ اس نے ڈرائیور سمجھ کر یونہی بیک ویو میں دیکھا  
تو جھٹکا سا لگا۔

وہ و سیم تھا۔ اپنے انڈی معنی خیز انداز میں مسکراتے  
وہ گاڑی اشارت کر چکا تھا۔ اسے لگا اس سے غلطی  
ہو چکی ہے مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا؟

لب چلتی وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔  
تائی مہتاب منگنی کی شاپنگ کر رہی تھیں یا شادی  
کی وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ بس چپ چاپ ان کے ساتھ  
میٹرو میں چلی آئی۔ وہ جہاں بیٹھیں ان کے ساتھ بیٹھ  
گئی۔

”سنائے تم نے برا شور ڈالا تھا۔“ تائی اٹھ کر ایک  
شوکیں کے قریب گئیں تو وہ اس کے ساتھ صوفے  
میں دھس کر بیٹھا۔ حمل بدک کرا تھی۔

”ارے بیٹھو بیٹھو۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“  
شاپ کی تیز پہلی روشنیاں و سیم کے چہرے پہ  
پڑ رہی تھیں گریبان کے کھلے ٹخن گردن سے لپٹی  
چھین اور شوخ رنگ کی شرٹ اف اسے اس سے  
کراہت آئی تھی۔

”کیا بات کرنی ہے؟“  
”تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کس سے کرنا  
چاہتی ہو؟“ وہ استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا

تھا۔ اس کے ذہن کے پردے پہ ایک چہرہ سا ابھرا۔  
ایک اندرونی خواہش۔ ایک دہتی دہانی محبت کی  
ادھوری داستان اس نے بے اختیار سر جھٹکا۔  
”نہ آپ سے نہ کسی اور سے۔ آپ میرا پیچھا  
چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”ایسے نہیں حمل ڈیر! ابھی تو ہم نے بہت وقت  
ساتھ گزارنا ہے۔“ وہ کھڑے ہو کر اس کے قریب آیا۔  
وہ پھر دو قدم پیچھے ہٹی دکان لوگوں سے بھری ہوئی  
تھی۔ پھر بھی حمل کو اس کے بے باک انداز سے خوف  
آتا تھا۔ نہ معلوم وہ کیا کر ڈالے۔

”چھا ادھر آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ  
قدم اٹھاتا اس کے نزدیک آ رہا تھا ”ادھر آؤ کریم  
پارلر میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”تائی۔۔۔۔۔ تائی اماں۔“ بے بس سی وہ بھیڑ میں  
تائی مہتاب کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”تمہاری تائی کو ان کی کوئی فریڈنڈ مل گئی ہے وہ ابھی  
نہیں آئیں گی۔ تم ادھر قریب تو آؤ نا حمل ڈیر۔“ و سیم  
نے ہاتھ برہا کر اس کی کھائی تھامنا چاہی اس کی  
انگلیاں اس کی کھائی سے ذرا سی مس ہوئیں۔ حمل  
کو جیسے کرنٹ سا لگا۔ ہاتھ میں پکڑا بند ٹیک اس نے  
پوری قوت سے و سیم کے منہ پہ دے مارا۔

”کھنٹیا آؤی پیچھے ہوا!“ وہ چلائی تھی۔  
بیک اس کی ناک پہ زور سے لگا تھا وہ بلبللا کر پیچھے

ہٹا۔ شور کی آواز بہت سے لوگ ادھر متوجہ ہوئے۔  
سیلز بوائز کام چھوڑ کر ان کی طرف لپکے۔

”یو۔۔۔۔۔ یو بچ! و سیم تو غصے سے پاگل ہی ہو گیا۔  
ناک پہ ہاتھ رکھے وہ جارحانہ انداز میں اس کی طرف

برہا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے اسے پیچھے سے پکڑ لیا۔  
”کیا تمنا ہے؟ کیوں بچی کو تنگ کر رہے ہو؟“

”میڈم کیا ہوا ہے؟ یہ بندہ تنگ کر رہا تھا آپ کو؟“  
بہت سی آوازیں اس پاس ابھریں۔ کچھ لڑکوں نے

و سیم کو بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔  
”یہ مجھے تنگ کر رہا تھا۔ اکیلی لڑکی جان کر۔ اس  
نے بمشکل خود کو سنبھالا اور کہہ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسے

☆ ☆ ☆

معلوم تھا اب کیا ہو گا۔ اور واقعی وہی ہوا اگلے ہی  
لمحے وہ لڑکے و سیم پہ پل پڑے۔ وہ گالیاں بکتا خود کو  
چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ سب بہت زیادہ  
تھے۔ ”مارو۔۔۔۔۔ اسے اور مارو۔ شریف لڑکیوں کو  
چھیڑتا ہے۔“

ایک عمر رسیدہ صاحب ہجوم کے پاس کھڑے غصے  
سے کہہ رہے تھے۔

”زور سے مارو۔ اسے عبرت کی مثال بنادو۔“  
”اپنے گھر ماں بہن نہیں ہے کیا۔؟“

اور وہ ماں جب تک دوکان میں لگے ہجوم تک پہنچی  
وہ و سیم کو مار مار کر ادھ موا کر چکے تھے تائی اس کی  
طرف لپکیں۔ تھوڑی ہی دور صوفے پہ حمل بیٹھی  
تھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے ”مطمئن سی و سیم کو پیٹے دیکھ  
رہی تھی۔“

”حمل۔ یہ اسے کیوں مار رہے ہیں۔؟“  
”کیونکہ اس کے باپ کے کہنے پہ مجھے کبھی ایسے ہی  
مارا گیا تھا۔“

”تو اس مت کرو۔“  
”بڑی دلچسپ بکواس ہے یہ آپ بھی انجوائے  
کریں نا۔“ وہ محظوظ سی و سیم کو پیٹے دیکھ رہی تھی۔

شاپ کا بو کھلایا ہوا مینجر اور سیلز بوائز مشتعل نوجوانوں  
کو چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”سر پلینز۔ سر دیکھیں۔“ سیلز بوائز کی منت کے  
باوجود وہ لڑکے ان کو دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کر رہے  
تھے۔ حواس باختہ سی تائی مہتاب ان کی طرف

دوڑیں۔  
”میرے بیٹے کو چھوڑو بڑے ہو مردو!“ وہ چلا چلا  
کر ان لڑکوں کو ہٹانے کی سعی کر رہی تھیں۔

صوفے پہ بیٹھی حمل مسکراتے ہوئے چپس کا  
پیکٹ کھول رہی تھی۔

”اب یہ مرتے دم تک مجھے ساتھ نہیں لائیں  
گی۔“ ساری صورت حال سے لطف اندوز ہوئی وہ چپس  
نکال کر کترنے لگی۔

☆ ☆ ☆



کیوں آتا تھا۔

رات میں فرشتے آئی تو اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔  
”مجھے ادھر دیکھنے کون کون آتا ہے فرشتے؟“

”ہم سب۔“ وہ اس کے بھورے بالوں میں برش کر رہی تھی۔

”آنا جان لوگ کبھی نہیں آئے؟“

”پتا نہیں۔“ دونوں ہاتھوں میں اس کے بال پکڑ کر اس نے اونچے کیے اور پونی باندھی، پھر سیدھی لمبی پونی ٹیل کو احتیاط سے آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے برش کرنے لگی۔

”کوئی تو آیا ہوگا۔“

”میں ان لوگوں کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پلیز مجھے دکھ مت دو۔“ اس کے انداز میں منت بھرا احتجاج تھا، پھر محمل کچھ نہ پوچھ سکی۔ سر جھکائے بال بنوائی رہی۔

”یہ دیکھو۔“ فرشتے نے پاکٹ مرر اس کے چہرے کے سامنے کیا۔ اس نے جھکا سر اٹھایا، آنچنے میں اپنا عکس دکھائی دیا تو لمحے بھر کو وہ پہچان ہی نہ پائی۔

بے حد کمزور چہرہ اندر کو دھنسنے ہوئے گل زردی مائل پھیک رنگت آنکھوں کے نیچے گہرے جامنی حلقے پر مشرود، بیمار روکھا پیکا سا چہرہ، اوپر اونچی پونی ٹیل جو کبھی اس تو تازہ سی محمل ابراہیم پہ بہت اچھی لگتی تھی اس بیمار لاغر محمل پہ بہت بری لگ رہی تھی۔

”رہنے دیں، مجھے یہ بال نہیں بنانے۔“ اس نے ہاتھ سے پونی پکڑ کر کھینچی۔ بال شکنجے سے نکل کر شانوں پہ بکھر گئے اور پونی اس کے ہاتھ میں آگئی۔

”کیوں کھول دیے؟“ فرشتے کو تاسف ہوا۔

”میں ایسے بال نہیں بنانا چاہتی، پلیز مجھے دکھ مت دیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے الفاظ لوٹا گئی۔ فرشتے جیب سے ہو گئی اور پھر کمرے سے نکل گئی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ اس وقت محمل کو تنہا چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔

\*\*\*

ہمایوں کا گھر۔ محمل کا گھر۔ ہمایوں اور محمل کا

گھر۔

وہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ خوب صورتی سے آراستہ کونا کونا چمکتا ہوا قانون کی روشنیاں، ہلکے جگر کرتی بتیاں، قیمتی پردے، یہ ہی سب پہلے بھی اس کے گھر میں تھا، اب بھی تھا، مگر رنگ بدل گئے تھے۔

لاؤنج کے صوفے پر دے یہاں تک کہ کیلے بھی بدل گئے تھے۔ چیزیں رکھی گواہی تر تیب میں تھیں، مگر ان کا رنگ پہلے جیسا نہ تھا۔ ہر شے نئی تھی، جیسے ہمایوں تھا۔ اپنی جگہ یہ ویسے ہی موجود، مگر پھر بھی بدل چکا تھا۔

”کیسا لگا تمہیں اب؟“ اس کی وہیل چیر رہی تھی۔

وہ گم صم سی خالی خالی آنکھوں سے درو دیوار کو دیکھ گئی۔ سات سال پہلے وہ اس کا گھر تھا۔ اب شاید وہ صرف ہمایوں کا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کا مزید اسپتال میں رہنا بے فائدہ کہہ کر اسے گھر شفٹ کر دیا تھا۔ اس کی بیماری وہیں تھی۔

دایاں ہاتھ ٹھیک، بائیں ہاتھ وہ بازو راست اور پچھلا ہوا مکمل طور پر مفقود، وہ کہتے تھے کہ وہ اچانک۔۔۔ بھی ٹھیک ہو سکتی ہے اور ساری عمر بھی اس طرح رہ سکتی ہے۔ بس آپ دعا کریں، اب وہ کیا کہتی، آپ کو لگتا ہے کہ ہم دعا نہیں کرتے؟ مگر ایسی باتیں کئی کہاں جاتی ہیں۔

فرشتے اسے لاؤنج کے ساتھ بنے کمرے کی طرف لے گئی۔ اس نے وہ اس کے مطابق سیٹ کروا دیا تھا۔

”مگر میرا کمرہ تو اوپر تھا فرشتے۔“

”محمل۔ سیڑھیاں چڑھنا اس وہیل چیئر کے ساتھ۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”اور ہمایوں کا سامان؟“ کچھ دیر بعد چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھی۔ ”ان کا سامان کدھر ہے؟“

”ہمایوں تو۔۔۔ میں نے اسے کہا تھا۔ مگر آئی تھنک وہ اپنے کمرے میں زیادہ کمفر ٹیبل ہے۔“

”تو وہ یہاں نہیں آئیں گے؟“ محمل ششدر رہ گئی۔

”کوئی بات نہیں محمل! وہ اسی گھر میں رہتا ہے، کسی بھی وقت آ جاسکتا ہے۔“ فرشتے خوا خواہ شرمندہ ہو رہی تھی۔

”نہیں فرشتے! تم ان سے کہو کہ وہ مجھے یوں اکیلا تو نہ کریں۔“

اس نے بے اختیار فرشتے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہ صرف ایک دفعہ اس سے ملنے آیا تھا، پھر کبھی نہیں آیا۔

”محمل، پلیز میرے لیے تم دونوں بہت عزیز ہو، وہ کزن ہے اور تم بہن، اس لیے میں نہیں چاہتی کہ میری کسی بات سے وہ یا تم ہرٹ ہو۔ پلیز مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں تم دونوں کے پرسنلزم میں دخل دوں، مجھے اس کا کوئی حق نہیں ہے۔“ اس نے بہت نرمی سے اسے سمجھایا۔ وہ اس کے ہاتھ تھامے گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ محمل لا جواب سی ہو گئی۔

”اور تیمور؟ اس کا کمرہ کدھر ہے؟“ بے اختیار اسے یاد آیا۔

”لاؤنج کے اس طرف والا کمرہ۔“

”ہمایوں اسے اپنے ساتھ نہیں سلاتے؟ وہ اتنا چھوٹا ہے، وہ اکیلا کیسے سو سکتا ہے؟“ اس کا دل تڑپ کر رہ گیا۔

”جن بچوں سے بچپن میں ہی ان کے ماں باپ دونوں چھن جائیں، وہ عادی ہو جاتے ہیں محمل! اگر وہ مجھے پسند کرتا ہوتا تو میں اسے ساتھ سلاتی، مگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔“

”کیوں؟“ وہ بنا سوچے بول اٹھی۔ جواباً فرشتے اور اسی سے مسکرائی۔

”وہ تو تمہیں بھی پسند نہیں کرتا، کیا اس میں تمہارا قصور ہے؟“

محمل کا سر آہستہ سے نفی میں ہل گیا۔

”سو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، اگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا، تم بیٹھو، میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔ اب تم نارمل فوڈ لے سکتی ہو۔ میں نے ڈاکٹر

سے بات کر لی تھی۔“ وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو محمل بے اختیار کہہ اٹھی۔

”آپ بہت اچھی ہیں فرشتے! میں کبھی آپ کی اس کیئر کا بدلہ نہیں دے سکتی۔“

”میں نے بدلہ کب مانگا ہے؟“ وہ نرمی سے اس کا گل تھپتھا کر باہر نکل گئی۔

\*\*\*

دن پڑمردگی سے گزرنے لگے۔ وہ سارا دن کمرے میں پڑی رہتی، یا فرشتے کے زبردستی مجبور کرنے پہ باہر لان میں آتی اور وہاں بھی گم صم ہی رہتی، فرشتے ہی کوئی نہ کوئی بات کر کے اس کا ذہن بٹا رہی ہوتی اور یہ باتیں عموماً فرشتے اس سے نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے کبھی وہ کیاری میں گڈی کرتے مالی سے مخاطب ہوتی، تو کبھی برآمدے کا فرش دھوتی ملازمہ سے فرشتے اب اتنا نہیں بولتی تھی جتنا پہلے بولتی تھی۔ اس کا انداز پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اور یہ وقت کا اثر تھا، وہ اثر جو نہ چاہتے ہوئے بھی وقت ہر انسان پہ چھوڑے ہی جاتا ہے۔

فرشتے نے گھر کو اچھی طرح سے سنبھالا ہوا تھا۔ گوکہ ہر کام کی جزوقتی ملازمتیں رکھی ہوئی تھیں، مگر تمام انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود وہ نہ کسی پہ حکم چلاتی تھی، نہ اس گھر کی پرائیویسی میں دخل دیتی تھی۔ محمل یا ملازمیوں سے بات کرنے کے علاوہ وہ زیادہ کلام بھی نہ کرتی تھی۔ تیمور اور ہمایوں کے کمرے کے اندر وہ نہیں جاتی تھی، بلکہ دروازے پہ کھڑے ہو کر صفائی کرواتی۔ ملازموں کو تنخواہ ہمایوں دیتا تھا۔ فرشتے گیسٹ روم میں ہی قیام پذیر تھی۔ ہمایوں سے بات وہ بہت کم کرتی تھی، وہ بھی شدید ضرورتاً اور تیمور تو ویسے بھی ہر شے سے چڑا ہوا لڑکا تھا۔ سو وہ اسے مخاطب نہیں کرتی تھی۔ کبھی جو کر لے تو تیمور اس بد تمیزی سے پیش آتا کہ الامان۔

محمل نے نوٹ کیا تھا کہ تھوڑی دیر بد تمیزی کر کے تیمور چیخنے چلانے پہ آجاتا تھا اور اگر مزید کچھ کہا



اس نے دروازہ ہولے سے بجایا۔ مدھم دستک نے خاموشی میں ارتعاش ساید کیا۔  
”آجائو محل!“ اندر سے فرشتے کی تھکن زدہ مسکراتی آواز آئی اس نے حیرت سے دروازہ کھولا۔  
”السلام علیکم۔ اور آپ کو کیسے پتا کہ یہ میں ہوں؟“

”میں تمہاری چاپ پہچانتی ہوں۔“ وہ بیڈ پہ بیٹھی تھی، گھٹنوں پہ لحاف پڑا تھا۔ ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ بھورے سیدھے بال شانوں پہ تھے۔ اور چہرے پہ ذرا سی تکان تھی۔ محل اندر داخل ہوئی تو فرشتے نے کتاب ساید ٹیبل پہ ڈال دی اور ذرا سا کھسک کر جگہ بنائی۔ ”او بیٹھو۔“

”تائس روم۔ فرسٹ ٹائم آئی ہوں آپ کے ہاسٹل!“ محل ستائشی نگاہیں اطراف میں ڈالتی بیڈ کی پائنتی کے قریب بیٹھی۔ وہ اسکول یونیفارم میں ملبوس تھی جبکہ فرشتے بالکل مختلف گھر۔ والے جیلے میں تھی۔

”پھر کیا لگا ہاسٹل؟“  
”بہت اچھا اور آپ آج اسکول کیوں نہیں آئیں؟“

”مونہ۔ طبیعت ذرا مضطرب سی تھی۔“ وہ تکان سے مسکراتی۔ اس کا چہرہ محل کو بہت زرد سا لگا تھا۔ شاید وہ بیمار تھی۔

”اپنا خیال رکھا کریں۔“ پھر قدرے توقف سے گویا ہوئی، ”آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر چل کر کیوں نہیں رہتیں؟ وہ آپ کا بھی گھر ہے، آپ کا حق ہے اس پہ، آپ کو اس گھر میں سے اپنا حصہ مانگنا چاہیے۔“

”مجھے مٹی کے مکان کا کیا کرنا ہے؟ وہ تو میں ایک دن خود بھی بن جاؤں گی مجھے تو رشتوں میں سے حق چاہیے۔“

”تو ان پہ زور دینا۔“  
”کوئی اور بات کرو محل!“  
”اف!“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ ”مجھے علم

ہی نہ تھا کہ میری ایک بہن بھی ہے اور ساری عمر میں بہن کے لیے ترستی رہی۔“  
”ہم لوگوں کے ساتھ کے لیے نہیں ترستے محل، ہم لوگوں کے ساتھ کی ”چاہ“ کے لیے ترستے ہیں اور اسی چاہ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ لوگ مل جاتے ہیں تو پھر یوں لگتا ہے کہ وہ تو کچھ نہ تھے۔ سب کچھ تو وہ چاہ تھی جس کی ہم نے صدیوں پرستش کی تھی۔“  
”آپ بیان ہو کر کافی فلسفی ہو گئی ہیں، سو پلیز، اچھا سنیں، ایک بات بتاؤں۔“ وہ پرجوش سی بتانے لگی۔ ”کل تالی اماں مجھے وسیم کے ساتھ شائنگ پہ لے گئیں، اور میں نے اسے شاپ میں لوگوں سے پڑایا۔“

”آپ پتارہ کر کافی فلسفی ہو گئی ہیں، سو پلیز، اچھا سنیں، ایک بات بتاؤں۔“ وہ پرجوش سی بتانے لگی۔ ”کل تالی اماں مجھے وسیم کے ساتھ شائنگ پہ لے گئیں، اور میں نے اسے شاپ میں لوگوں سے پڑایا۔“

”بریں بات۔ قرآن کی طالبہ ایسی ہوتی ہے کیا؟“  
”ارے اس نے میرے ساتھ بد تمیزی کی تھی اور اسے سبق سکھانے کے لیے یہ ضروری تھا یونو، سیلٹ ڈیس! ہمایوں کیسا ہے؟“ ایک دم اس نے پوچھا اور خود بھی حیران رہ گئی۔  
”اب بستر ہے۔“

”وہ شکر الحمد للہ۔“ وہ واقعتاً خوش ہوئی تھی۔ چہرہ جیسے کھل اٹھا تھا۔ فرشتے بغور اس کے تاثرات جانچ رہی تھی۔

”تم اسے پسند کرتی ہو، رائٹ؟“  
اس کی نگاہیں بے اختیار جھک گئیں۔ رخسار گلانی پڑ گئے۔ اسے توقع تھی کہ فرشتے اتنے آرام سے پوچھ لے گی۔

”بتاؤ نا۔“ فرشتے ٹیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی اور غور سے اس کا جھکا چہرہ دیکھا۔  
”تائس!“  
”مجھے بچ بولنے والی محفل پسند ہے۔“

”ہاں شاید۔“ اس نے اعتراف کرتے ہوئے پل بھر کو نگاہیں اٹھائیں۔ فرشتے ہنوز سنجیدہ تھی۔  
”اور ہمایوں؟“

”ہمایوں؟“ اس کے لب مسکرا دیے۔ ”وہ کتنا ہے، وہ بچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں ہے۔“ وہ سر جھکائے مسکراتی ہوئی بیڈ شیٹ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ دوسری طرف دیر تک خاموشی چھائی رہی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

فرشتے بالکل خاموش تھی۔ اس کے دل کو یونہی شک سا ہوا۔ ”کیسے فرشتے تو ہمایوں سے۔۔؟ آخر وہ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے۔“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

”کیا سوچ رہی ہیں؟“  
”یہی کہ جب میں ہمایوں کے لیے تمہارا رشتہ لینے جاؤں گی تو کریم چچا مجھے شوٹ تو نہیں کر دیں گے؟ آخر میں ہمایوں کی بہن ہوئی نا!“

اور محل کھلکھلا کر ہنس دی۔ سارے وہم، شک و شبہ ہوا ہو گئے۔ فرشتے جھلا ایسی فیلنگز کیسے رکھ سکتی تھی؟ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔  
”اچھا یہ دیکھو۔“ اس نے کتاب میں سے ایک لفافہ نکالا۔ ”ایک لچ انوی میشن ہے۔ مجھے انویٹ کیا ہے نسیم آنٹی نے۔ وہ اماں کی ایک پرانی فرزند ہیں، ان ہی کے کلب میں ہے اس سنڈے کو۔ تم چلو گی۔؟“  
”مگر ادھر کیا ہو گا؟“

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ صرف لچ ہے۔ آنٹی نے کہا اگر میں آجاؤں تو اچھا ہے، اماں کی کچھ پرانی فرزند سے بھی مل لوں گی۔ تم چلو گی؟“  
”شیوہ!“ وہ پورے دل سے مسکراتی، اور پھر کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلی آئی۔

☆ ☆ ☆  
اتوار کی دوپہر وہ مقررہ وقت پہ مدر سے کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا میں ملبوس سیاہ حجاب چہرے

کے گرد لپیٹے، وہ کھڑی بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی تھی۔ عبایا وہ اب کبھی کبھی باہر پہنچتی تھی، ہاں نقاب نہیں کرتی تھی، صرف حجاب لے لیتی۔  
دفععتاً اوپر سیڑھیوں پہ آہٹ ہوئی۔ محل نے سر اٹھایا۔

فرشتے تیزی سے زینے اتر رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں چابی پکڑے، دوسرے سے وہ پرس میں کچھ کھنکھال رہی تھی۔

”السلام علیکم، تم پہنچ گئیں، چلو!“ عجلت میں کہتے ہوئے اس نے پرس بند کیا، اور برآمدے کی سیڑھیاں اتر گئی۔ محل اس کے پیچھے ہوئی۔

”ہمایوں گھر میں ہی ہو گا، مل نہ لیں؟“ وہ گیٹ کے باہر رک کر یوں تو محل مسکرا دی۔  
”شیوہ!“

وہ لاؤنج میں ہی تھا، صوفے پہ بیٹھے، پاؤں میز پہ رکھے، چند فائلز کا سرسری سامنا کر رہا تھا۔ انہیں آتے دیکھا تو فائلز رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔  
”خوش آمدید!“ فرشتے کے پیچھے آتی محل کو دیکھ کر وہ مسکرا دیا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے قدرے کمزور لگ رہا تھا مگر ہسپتال میں پڑے ہمایوں سے وہ خاصا بہتر تھا۔

”میں ہمایوں کو اتنے سالوں میں بھی السلام علیکم کہنا نہیں سکھا سکی، محل! اور کبھی تو مجھے لگتا ہے میں اسے کچھ بھی نہ سکھا سکوں گی۔“

”اچھا بھی۔ السلام علیکم۔“ وہ ہنس دیا تھا۔  
”بیٹھو۔“

وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی مگر فرشتے کھڑی رہی۔  
”میں ہمایوں ہمارے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔“

”مگر تمہاری بہن تو بیٹھ گئی ہے۔“  
فرشتے نے مڑ کر محل کو دیکھا جو آرام سے صوفے پہ بیٹھی تھی۔







”ہن! اٹھو ہم بیٹھے نہیں آئے۔“

محمل ایک دم گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

فرشتے ہمایوں کی طرف پلٹی۔

”ہم بس تمہارا حال پوچھنے آئے تھے۔ تم اب ٹھیک ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں مگر بیٹھو تو سہی۔“

”نہیں۔ ہمیں سچ یہ جانا ہے کہ تم کیم آنٹی کی طرف۔“

اماں کی کچھ فرزند ز سے بھی مل لیں گے۔“

”اور محمل؟“ اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

”محمل ظاہر ہے میری بہن ہے تو میرے ساتھ ہی رہے گی نا۔“

وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ عیال میں ملبوس وہ دونوں

دراز قد لڑکیاں اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ سیاہ حجاب

چہرے کے گرد لپیٹے، دونوں کی ایک جیسی سنہری

آنکھیں تھیں، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے

کون زیادہ خوبصورت تھی۔ ہاں فرشتے دو اونچ زیادہ لمبی

ضرور تھی۔ اس کے چہرے پہ ذرا سنجیدگی بھی، جبکہ

محمل کے چہرے پہ کم عمری کی معصومیت برقرار تھی۔

سب اور یہ وہ محمل تو نہ تھی جس سے وہ پہلی بار اسی

لاؤنج میں ملا تھا۔ سیاہ مٹیش کی ساڑھی، چھوٹی

آستینوں سے جھلکتے گداز بازو، اور اونچے جوڑے سے

نکلتی گھٹکر پائی لٹوں والی۔ اسے اس کا ایک ایک نقش

یاد تھا۔ وہ کوئی اور محمل تھی اور یہ عیال اور حجاب والی

کوئی اور تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

”یہی کہ تم نے محمل کو اپنے رنگ میں رنگ لیا

ہے۔“

”یہ میرا رنگ نہیں ہے، یہ صبغت اللہ ہے اور

اللہ کے رنگ سے بہتر کون سا رنگ ہو سکتا ہے، چلو

محمل۔ اوکے ہمایوں! اپنا خیال رکھنا۔ السلام علیکم۔“ وہ

محمل کا بازو تھامے مڑی ہی تھی کہ وہ پکار اٹھا۔

”سنو فرشتے!“

”ہاں!“ وہ دونوں ساتھ ہی پلٹیں۔

”تم بہت بولتی ہو اور تم نے محمل کو ایک لفظ بھی

نہیں بولنے دیا۔ ہمیں معلوم ہے؟“

”مجھے معلوم ہے اور تم نے ساری عمر تو اسی کو سننا

ہے، یہ کم ہے کہ میں نے تمہیں اس سے ملوایا ہے؟

مگر نہیں، بے شک انسان بہت ناشکرا ہے، چلو محمل!“

وہ محمل کو بازو سے تھامے اسی طرح جلت میں واپس لے

گئی۔ اور وہ حیرتوں میں گہرا کھڑا رہ گیا۔

پھر سر جھٹک کر مسکرا دیا تھا۔ ”یہ فرشتے کو کس نے

بتایا؟“



اس گول میز کے گرد دونوں اپنی نشستوں پہ بوری

بیٹھی تھیں۔

باقی کرسیوں پہ آنٹی ٹاپ چند خواتین جلوہ افروز

تھیں۔ محمل بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھتی۔ وہ

واقعی بہت بور ہو رہی تھی۔

فرشتے ہی تھی جو اپنے ساتھ بیٹھی نسیم آنٹی سے

کوئی نہ کوئی بات کر لیتی، ورنہ وہ تو مسلسل جہابی روکتی

بے زاری سے اوہرا دھردیکھ رہی تھی۔

”اس ملک میں عورتوں کو وہ حقوق حاصل نہیں جو

مردوں کو ہیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسز رضی کی

طرف متوجہ ہو گئی جو ناک چڑھائے اپنا انگوٹھیوں سے

مزین ہاتھ ہلا کر کہہ رہی تھیں۔

”اور یہ اس صدی کی سب سے بے وقوفانہ بات

ہے اگر کوئی کہے کہ مرد عورت سے برتر ہے۔ میں تو

نہیں مانتی ایسی کسی بات کو!“

”بالکل!“ وہ سب غرور و تفاخر میں ڈوبی عورتیں

ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ محمل کا

پرس میز پہ رکھا تھا۔ اس نے اس کو اٹھا کر گود میں رکھا،

پھر اندر سے اپنا سفید کوروا قرآن نکالا جو وہ ہمیشہ ساتھ

رکھتی تھی۔

”یہ سب جمالت کی باتیں ہیں مسز رضی، جب تک

اس ملک میں تعلیم عام نہیں ہوگی تو گ عورت اور مرد

کے برابر حقوق تسلیم نہ کر سکیں گے۔“

”اور نہیں تو کیا، اسی قدامت پرستی کی وجہ سے ہم

ان ہاں ہیں اور دنیا چاند پہ پہنچ گئی ہے۔“

اس نے سر اٹھایا۔ اور ذرا سا کھنکھاری۔

”مجھے آپ لوگوں سے اتفاق نہیں ہے۔“

تمام خواتین چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”اور میرے پاس اس کے لیے دلیل بھی ہے۔ یہ

ریاضیں۔“ اس نے گود میں رکھا قرآن اوپر کیا ”لوہر

سورہ نساء میں۔“

”نہیں، پلیز!“

”اف نہیں! ناٹ اگین۔“

”oh please don't open it“

”جلی ناگوار، مضطرب سی آوازوں پہ وہ رک کر

ناکھی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔

”جی؟“

”خدا کے لیے اس کو مت کھولیں۔“

وہ کہہ رہی تھیں اور وہ حق دق بیٹھی رہ گئی۔

یہ مسلمان عورتیں تھیں؟ یہ واقعی مسلمان

عورتیں تھیں؟ ان کو کہانی کتابوں پہ ایمان نہ تھا؟ یہ

قرآن کو نہیں سننا چاہتی تھیں، اس اللہ کی بات نہیں

سننا چاہتی تھیں جس نے ان کو ان کا مال اور حسن دیا

تھا۔؟ جو چاہتا تو ان کی سانسیں روک دیتا، ان کے دل

بند کر دیتا۔ مگر اس نے ان کو ہر نعمت دے رکھی تھی، پھر

بھی وہ اس کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں؟

”یہ تو قرآن کی آیت ہے، اللہ کا کلام ہے، آپ

سین تو سہی، یہ تو۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”پلیز، آپ ہماری ڈسکشن میں خل نہ ہوں۔“

اور وہ خاموش ہو گئی۔ اتنی ہٹ دھرمی، شاید وہ

بد نصیب عورتیں تھیں، جن کو اللہ اپنی بات سنوانا پسند

نہیں کرتا تھا اور ہر وہ شخص جو روز قرآن نہیں پڑھتا، وہ

بد نصیب ہوتا ہے اللہ اس سے بات کرنا بھی پسند

نہیں کرتا۔

پھر وہ ادھر نہیں بیٹھی، تیزی سے اٹھی، قرآن بیگ

میں رکھا اور فرشتے سے ”میں گھر جا رہی ہوں“ کہہ کر

بغیر کچھ نہ وہاں سے چلی آئی اس کا دل جیسے درد سے

پھٹا جا رہا تھا۔ آنسو اٹنے کو بے تاب تھے۔ سمجھ میں

نہیں آرہا تھا وہ کیسے اس غم کو قابو کرے، کیسے۔ کیسے

مسلمان ہو کر وہ یہ سب کہہ سکتی تھیں؟ اسے ابھی

تک یقین نہیں آرہا تھا۔

دل بہت بھر آیا تو آنسو بہہ پڑے، وہ چہرہ پھیرے

کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سڑک کے ایک طرف

درخت پیچھے کو بھاگ رہے تھے گاڑی ڈرائیور چلا رہا

تھا جسے وہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ تائی متاب کی ہو

بننے پہ یہ اعزاز تو اسے ملنا ہی تھا اور روک ٹوک بھی

قدرے تم ہو گئی تھی مگر ابھی وہ ان باتوں کو نہیں سوچ

رہی تھی، اس کا دل تو ان عورتوں کے رویے پہ انک

سا گیا تھا۔ اسے لگا۔

ایک دم گاڑی جھٹکے سے رکی۔ وہ چونک کر آگے

دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟“

”بی بی! گاڑی گرم ہو گئی ہے، شاید ریڈی ایٹر

میں پانی کم ہے، میں دیکھنا بھول گیا تھا۔ ڈرائیور پریشانی

سے کتابا ہر نکلا۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

سڑک قدرے سنسان تھی گو کہ وقفے وقفے سے

گاڑیاں گزرتی دکھائی دیتی تھیں مگر ارد گرد آبادی کم

تھی۔ وہ کوئی اینڈ سٹرل ایریا تھا۔ بہت دور اونچی عمارتیں

دکھائی دیتی تھیں۔ ڈرائیور بونٹ کھول کر چیک کرنے

لگ گیا تو وہ سر سیٹ سے ٹکائے، آنکھیں موندے

انتظار کرنے لگی۔

”بی بی!“ تھوڑی دیر بعد اس کی کھڑکی کا شیشہ بجلا۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ باہر ڈرائیور کھڑا

تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے شیشہ نیچے کیا۔

”مجن گرم ہو گیا ہے، میں کہیں سے پانی لے کر

آتا ہوں، آپ اندر سے سارے دروازے لاک

کر لیں، مجھے شاید تھوڑی دیر لگ جائے۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے جاؤ۔“ اس نے شیشہ چڑھایا،



بعد اس نے زوردار آواز سے تیمور کے کمرے کے دروازہ کو بند ہوتے سنا۔

”کیا تمہیں چھوڑنے میں میرا اپنا اختیار تھا تیمور؟ تم اتنی سی بات پہ مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتے۔ شاید تمہارے باپ نے تمہیں مجھ سے بدظن کیا ہے۔“ وہ دکھی دل سے سوچتی واپس کمرے تک آئی تھی۔ اس کے ripple بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ سیاہ کور والا قرآن رکھا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اسے اٹھایا اور دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے سامنے کیا۔

سیاہ کور پہ مدھم سامنا مناسا ”م“ لکھا تھا۔ جانے اس نے کیوں اور کب ادھر لکھا تھا؟ وہ کوشش کے باوجود یاد نہ کر پائی، پھر سر جھٹک کر اسے وہاں سے کھولا جہاں سے فجر کے بعد تلاوت چھوڑی تھی۔ اس نے وہ آیت دیکھی جہاں بک مارک لگا تھا، پھر تودو تسمیہ پڑھا اور اگلی آیت سے پڑھنا شروع کیا۔

”ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ان کی بات غمگین کرتی ہے۔“

اس نے بے یقینی سے اس آیت کو دیکھا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تمہیں ان کی بات غمگین کرتی ہے، پس بے شک وہ تمہیں نہیں جھٹلاتے، بلکہ وہ ظالم تو اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔“ اس نے پھر سے پڑھا اور پھر دم بخود ہی ہو کر ایک ایک حرف کو انگلی سے چھونے لگی۔ کیا وہ واقعی ادھر لکھا تھا؟

”وہ اللہ تعالیٰ۔“ اس کے آنسو پھر سے گرنے لگے تھے۔ ”آپ کو۔ آپ کو ہمیشہ پتا چل جاتا ہے میں۔ میں کبھی بھی آپ سے کچھ نہیں چھپا سکتی۔“ وہ بری طرح رو دی تھی۔ اب کی بار یہ دکھ کے آنسو نہ تھے، بلکہ خوشی کے تھے۔ سکون کے تھے، رضا کے تھے۔ ”مگر آپ مجھ سے یوں ہی بات کرتے رہیں تو پھر مجھے جس حال میں بھی رکھیں میں راضی! میں راضی! میں راضی! اس نے چہرہ اٹھایا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

اب اسے رونا نہیں تھا۔ اب اسے صبر کرنا تھا، طائف کے پھر دراصل اب لگنے شروع ہوئے تھے۔

صبر اور شکر۔ اس نے ان دو سہاروں کو بالآخر تمام ہی لیا تھا۔



شام بہت سہانی سی اتری تھی۔ کالونی کی صاف سڑک کے اطراف سبز درختوں کے تازہ پتوں کی مہک، ٹھنڈی ہوا سے ہر سو بکھری تھی۔

بلقیس اس کی وہیل چیئر و حکایتی سڑک کے کنارے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی باتیں بھی کر رہی تھی۔ مگر محمل کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ گم صم سی دوران کو دیکھ رہی تھی، جہاں برندوں کے غول اڑ رہے تھے۔ اس روز کے طوفان کے بعد موسم بہت ٹھنڈا ہو گیا تھا اور اس ٹھنڈی ہوا میں باہر نکلتا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

بلقیس اس کی وہیل چیئر و حکایتی دور پارک تک لے آئی تھی۔ اس سے آگے ان کے سیکٹر کا مرکز تھا۔ وہاں پوٹیکس، شاہیں اور ریسٹورنٹ کی چمیل پہل ہوتی تھی اور ایسی جگہوں پہ جاتے ہوئے اس کا دل گھبراتا تھا سو اس نے بلقیس کو آگے جانے سے منع کر دیا۔

”جس بیس پارک تک ٹھیک ہے، اسی میں چلتے ہیں۔“

بلقیس سر ہلا کر وہیل چیئر اندر لے جانے لگی۔

”جب آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا نا محمل بی بی تو صاحب بہت روئے تھے۔ میں نے خود انہیں روتے دیکھا تھا۔ بہت سوچ کا لگا تھا ان کو۔“

”کون؟ ہمایوں؟“ وہ چونکی تھی۔

”ہاں جی! انہوں نے چٹھی لے لی تھی، کئی ماہ تو وہ اسپتال میں آپ کے پاس ہی رہے تھے۔ تیمور بابا کو تو بھلا ہی دیا تھا میں نے بڑا کیا ہے جی تیمور بابا کو۔ بڑا پیارا بچہ تھا ہمارا بابا، جب چار سال کا تھا تو آپ کے لیے پھول لے کر جاتا تھا، اور وہاں اسپتال میں آپ کے سر ہاتے بیٹھ کر گھنٹوں بولا کرتا تھا۔“

”پھر اب کیا ہوا ہے اسے بلقیس؟“ اس نے دیکھا

سے پوچھا تھا۔ بلقیس آہستہ آہستہ پارک کی پتھریلے روش پہ وہیل چیئر چلا رہی تھی۔ دور گھاس پہ بیٹے کھیل رہے تھے۔ ایک طرف ایک بچہ ماں کی انگلی پکڑے رو رہا تھا۔ اسے ہر بچے میں اپنا تیمور نظر آ رہا تھا۔

”تیمور بابا ایسا نہیں تھا بی بی! وہ تو بہت پیار کرنے والا بچہ تھا، مگر پھر اب پچھلے دو ایک سالوں میں بہت چیز اُہو گیا ہے۔ صاحب بھی تو اسے توجہ نہیں دیتے، پہلے تو چھوٹا تھا، پر اب بہت سمجھ دار ہو گیا ہے، ساری باتیں سمجھتا ہے، اسی لیے سب سے ناراض رہتا ہے۔“

”اور تمہارے صاحب؟ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

”پتا نہیں بی بی! وہ شروع میں آپ کا بہت خیال رکھتے تھے، پھر آپ کے حادثے کے چوتھے برس ان کی کراچی پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ وہ سو سال ادھر رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو بہت بدل گئے تھے جی۔ اب تو میٹھ سال ہو گیا ہے ان کو واپس آئے ہوئے، مگر اب تو وہ آپ کا تیمور بابا کا حال بھی نہیں پوچھتے۔“

”کراچی میں ایسا کیا ہوا جو وہ بدل گئے؟“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔

”معلوم نہیں بی بی، مگر۔“ وہ لمحے بھر کو ہچکائی۔

”ان کے کراچی جانے سے کوئی دو ہفتے پہلے مجھے یاد ہے، ادھر آپ کے گھر آپ کے کوئی رشتے دار آئے تھے، ان سے بہت۔ بہت لڑائی ہوئی تھی صاحب کی۔“

”کون؟ کون آیا تھا؟“ اس نے وحشت زدہ سی ہو کر گردن گھمائی۔ بلقیس کے چہرے پہ تذبذب کے آثار تھے۔

”مصل میں بی بی! آپ کے رشتے دار کبھی آئے نہیں، تو وہ جو بس ایک ہی دفعہ آئے تو مجھے یاد رہ گیا آپ کے تایا کے بیٹے تھے۔“

”کون؟ فواد؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

”نام و ام تو نہیں معلوم، مگر صاحب نے ان سے بہت جھگڑا کیا تھا۔ دونوں بہت دیر تک اونچا اونچا لڑتے

رہے تھے۔“

”مگر کیا ہوا تھا؟ بگڑا کیوں ہوا ان کا؟“ وہ مضطرب اور بے چین سی ہو گئی تھی۔

”نہیں بچن میں جی بی بی! کچھ سمجھ میں تو نہیں آیا کہ وہ کیوں جھگڑ رہے تھے، مگر شاید کوئی پکھری وغیرہ کا معاملہ تھا اور دونوں آپ کا نام بار بار لیتے تھے، پھر صاحب نے فرشتے لی بی کو بھی ادھر بلوایا۔ وہ پتا نہیں کچھ بولیں یا نہیں، ان کی آواز ہی نہیں آئی مجھے، پھر وہ آپ کے تایا زاد چلے گئے اور صاحب دیر تک فرشتے لی بی پہ چیختے رہے، میں کھانے کا پوچھنے گئی تو دیکھا کہ فرشتے لی بی رو رہی تھیں اور اپنا سامان پیک کر رہی تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ جا رہی ہیں میں نے پوچھا کہ گدھر تو بولیں، پتا نہیں اور روتی جا رہی تھیں، پھر اگلے دن رشید نے بتایا کہ صاحب اپنا ٹرانسفر کراچی کر دیا ہے ہیں، پھر صاحب چلے گئے اور فرشتے لی بی روک گئیں۔“

وہ دم سا دھم ماری تفصیلات سن رہی تھی۔ اس کے پیچھے کیا کیا ہوا رہا، اسے خبر ہی نہیں ہو سکی۔ کیا فواد نے ہمایوں کو اس کے خلاف بہکایا تھا؟ اور فرشتے کو اس نے ایسی کیا بات کہی کہ وہ روئی؟ وہ تو بہت مضبوط لڑکی تھی، یوں کبھی نہیں روتی تھی۔ اس نے تو اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے۔ ”وہ خدا یا اس نے سرودنوں ہاتھوں میں گرا لیا۔“

وہ کیا کرے؟ کس سے پوچھے؟ فرشتے تو کبھی نہ بتاتی۔ ہمایوں سے امید بھی نہیں تھی اور تیمور تو اسے دیکھنے کا روادار نہ تھا، پھر کیا کرے؟ صبر اور نماز کا سہارا۔ اس کے دل سے آواز اُٹھی تھی۔

بلقیس کو کوئی جاننے والی مل گئی تو وہ اس سے باتیں بگھارنے ذرا فاصلہ جاکھڑی ہوئی تھی۔

محمل نے قرآن اٹھا لیا وہ قرآن لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی اے آہستہ سے کھولا۔ کل جدھر سے تلاوت چھوڑی تھی ان آیات پہ نشان لگا تھا۔ وہ بہت غور سے دھیان سے آگے سے پڑھنے لگی۔

”اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان چیزوں کے



# Decora Hankies

... absorbent  
..... elegant  
..... & luxury

Decora  
Hankies

KITCHEN  
TOWELS  
Luxury Size



Soaks up excess oil



Adds elegance



Customer Service

**H&P**  
Health & Hygiene Products

hankieshnp@yahoo.com  
freedomhnp@yahoo.com

”کیوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ اس کی آواز بندشیشوں سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔  
باہر فضا صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دور سے جھلکتی اونچی عمارتیں ان کے اوپر آسمان جہاں سے پرندے اڑتے ہوئے گزرتے تھے یہ عمارتیں یہ آسمان زمین یہ اڑتے پرندے یہ زمین کو روندتے ہوئے چلتے متکبر لوگ وہ سب زندہ تھے۔ ان کی سانسیں اپنے ”انکار“ کے باوجود نہیں رکتی تھیں۔ کیوں؟

”کیونکہ ان کی سانس ان کو ملی مہلت کی علامت ہے محل بی بی! کسی کے گناہ کتنے ہی شدید ہوں اگر سانس باقی ہے تو امید ہے شاید کہ وہ لوٹ آئیں۔ وہ رب تو ان نافرمانوں سے مایوس نہیں ہوا، پھر تم کیوں ہوئیں؟“ کوئی اس کے اندر بولا تھا۔  
وہ جیسے سناٹے میں آئی۔

کتی جلدی وہ نہ ماننے والوں سے مایوس ہو گئی؟ ”ان“ پہ کڑھنے لگی؟ پھر کیوں وہ کسی کی ہٹ دھرمی دیکھ کر یہ فرض کر بیٹھی کہ وہ کبھی بدل نہیں سکتیں کیوں اس نے مایوس ہو کر ہستی چھوڑ دی۔  
اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ بے اختیار اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔  
”نہیں کوئی اللہ تیرے سوا پاک ہے تو بے شک میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔“

ندامت کے آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک رہے تھے اسے ہستی نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ اگر کچھ لوگ قرآن نہیں سننا چاہتے تو کوئی تو ہو گا جو اسے سننا چاہے گا۔ خود وہ کیا تھی؟ قرآن کو اس روز چھت پہ گھولتے ہی بدک اٹھنے والی آج کدھر تھی! صرف اس سیاہ فام لڑکی کی ذرا سی کوشش ذرا سے تجسس کو بھرنے والے عمل سے وہ کسی نہ کسی طرح آج ادھر پہنچ گئی تھی کہ اللہ اس سے بات کرتا تھا، پھر اپنی پارسیاں پہ غور اور دوسرے کی تحقیر کیسی؟  
اس کے آنسو ابھی بہہ ہی رہے تھے کہ ڈرائیور

سارے لاک بند کیے اور چہرے پہ حجاب کا ایک پلو گرا کر آنکھیں پھر سے موند لیں، ادھیڑ عمر ڈرائیور چھ سات برس سے ان کے ہاں ملازمت کر رہا تھا اور خاصا شریف النفس انسان تھا سو وہ مطمئن تھی۔

وہ گرمیوں کی روپ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گاڑی جس زندہ ہو گئی۔ ٹھن اور جس اتنا شدید تھا کہ اس نے شیشہ کھول دیا۔ ذرا سی ہوا اندر آئی مگر گاڑی کے ساکن ہونے کے باعث ماحول پہلے سے زیادہ گرم ہو گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں پسینہ پسینہ ہو گئی۔ بے اختیار سیٹ پہ تہہ کر کے رکھا دوٹے اٹھایا اور اس سے ہوا تھلنے لگی۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ اسے لگا وہ بھی میں جل رہی ہے۔

کافی دیر گزر گئی مگر ڈرائیور کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ بے اختیار وہ سورہ طلاق کی تیسری آیت آخر سے پڑھنے لگی۔ ”جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ بنا ہی دیتا ہے۔“

ڈیڑھ گھنٹے سے اوپر ہونے کو آیا تھا وہ گرمی سے بندھال پسینے میں شرابور کتنی ہی دیر سے دعا کر رہی تھی مگر جانے کیوں آج کوئی راستہ نہیں کھل رہا تھا۔ پھر جب سورج سر پہ پہنچ گیا اور باہر سے آتی دھوپ و گرمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اس نے گھبرا کر شیشے بند کر دیے۔

اور پھر سے وہی ہوا، ٹھن زندہ اور جس زندہ بند گاڑی جیسے بند ڈبہ ہو یا بند قبر۔ یا سمندر کی تہ میں تیرتی کسی مچھلی کا پیٹ!

”مچھلی کا پیٹ؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ میرے دل میں کیسے خیال آیا کہ یہ مچھلی کا پیٹ ہے؟“ وہ ابھی اور پھر سے اسے وہ کلب کی عورتیں یاد آئیں اور ان کا وہ گھمنڈی رویہ! اس کے خیال کی رو بستلنے لگی۔ پتہ نہیں وہ کیوں اس رب کی بات نہیں سننا چاہتی تھیں جس کے ہاتھ میں ان کی سانسیں ہیں اگر وہ چاہے تو ان منکرین کی سانسیں روک دے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔



بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں (مائدہ 10)

مجھے بھر کو اس کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ مگر پھر فوراً خود کو سرزنش کی۔

”یہ کوئی نال نکلنے کی کتاب تو نہیں ہے، اسی لیے اس نے مجھے ایسے سوال کرنے سے منع کیا ہے، میں بھی خواہ مخواہ وہ سر جھٹک کر آہستہ سے آگے تلاوت کرنے لگی۔

اگلی آیات دوسری چیزوں سے متعلق تھیں۔ اس کی سوچوں پہ بالکل خاموش لب۔ سے کسی اور طرف توجہ مبذول کروا تیں۔ اس کے اچھے دماغ کو سکون آنے لگا۔ جو بھی ہوا، کبھی نہ بھی کھل ہی جائے گا اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ زیر لب ترنم سے تلاوت کرنے لگی۔

\*\*\*

رات کے دو بج چکے تھے اور ہمایوں ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ مضطرب سی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ بار بار دیوار پر آویزاں گھڑی کو دیکھتی اور پھر دروازے کو۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ مگر دروازہ ہنوز ساکت و جامد تھا۔ باہر بھی خاموشی تھی۔

اس کے دل میں دوسو سے آنے لگے۔ نہ جانے وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں، کیا پتا اس کی گاڑی خراب ہو گئی ہو، کیا پتا کسی مشکل میں پھنس گیا ہو۔ اس نے بے اختیار اس کے لیے دعا کی تھی۔

دفعاً ”گاڑی کا بارن سنائی دیا اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز وہ مڑ کر دروازہ کو پیاسی نظروں سے دیکھنے لگی۔

قدموں کی آواز اور پھر۔ بھاری چرچاہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا، کیپ اور اسٹک ہاتھ میں لیے وہ تھکا تھکا سا بیٹن فارم میں چلا آ رہا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مڑ کر دروازہ بند کیا اور پھر چند قدم آگے آیا۔

دلستا اسے بیشاد دیکھ کر ہمایوں کے قدم کھٹے۔ چہرے پہ حیرت بھری ناگواری اُبھر آئی۔

”تم ادھر کیوں بیٹھی ہو؟“

”السلام علیکم، آپ کا ویٹ کر رہی تھی۔ آپ نے بہت دیر لگا دی۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔

”میں دیر سے آؤں یا جلدی آؤں خدا کے لیے میرے انتظار میں ادھر مت بیٹھا کرو۔“

اس نے بہت تحمل سے اس کا بیزار لہجہ سنا، پھر دھیرے سے بولی۔ ”میں پریشان ہو گئی تھی کہ خیریت۔“

”مگر نہیں کیا تھا میں، سو کام ہوتے ہیں، اگر آئندہ تم مجھے ادھر بیٹھی ملیں تو میں گھر ہی نہیں آیا کروں گا۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو، محل میں جھڑک کر کہتا تیزی سے اوپر بیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

اس نے بڑے صبر و ضبط سے آنسو لی لیے یہاں تک کہ وہ اپنے دروازے کے پیچھے گم ہو گیا۔ تب اس نے گود میں دھڑے ہاتھ اٹھائے اور اپنی وہیل چیئر کو کمرے کی طرف موڑنے لگی۔

کبھی تو اسے احساس ہو گا کہ یہ وہی محل ہے جو کبھی اس کی من چاہی بیوی تھی اور جب وہ یہ محسوس کرے گا تو پلٹ آئے گا۔ اسے یقین تھا اور یہ ہی یقین اس نے دل میں اتنے درد کو دلا کر دیا تھا۔

\*\*\*

وہ تارکول کی سڑک پہ آج پھر بلقیس کے ساتھ اپنی وہیل چیئر جا رہی تھی۔ باہر کا موسم اس کی طبیعت پہ بہت اچھا اثر ڈالتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کی معذوری میں رتی برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔

بلقیس ادھر ادھر کی باتیں کرتی اس کی وہیل چیئر دھکیل رہی تھی۔ وہ آج بھی اسے نہیں سن رہی تھی، بس خاموش مگر پرسکون نگاہوں سے دوران کو دیکھ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ٹھہراؤ اس کی شخصیت کا حصہ بنا جا رہا تھا۔

”بلقیس۔۔۔ تمہیں میرے تایا کے گھر کا پتا ہے؟“ ایک دم ہی کسی خیال کے تحت وہ جوئی اور پھر پوچھ لیا۔

”نہی بی بی! میں تو ادھر کبھی نہیں گئی۔“

”اچھا۔۔۔ مگر مجھے راستہ یاد ہے، تم مجھے ادھر لے جاؤ۔“

گی؟“

”پیدل؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں زیادہ دور نہیں ہے، جتنا فاصلہ یہاں سے مرکز تک کا ہے اتنا ہی ہے، میں پیدل بھی آجایا کرتی تھی۔“

اسے بے اختیار وہ شام یاد آئی جب ویکم سے اپنے رشتے کا سن کر وہ روتی ہوئی پیدل ہی مدرے کے سامنے سڑک پہ آ گئی تھی، اور اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ وہ بیچ راہ میں چھوڑ دینے والوں میں سے نہیں ہے اور پھر۔۔۔

”چلیں پھر ٹھیک ہے، آپ راستہ بتائیں۔“ بلقیس کی آواز پہ وہ ہادیوں کے جھوم سے نکلی اور راستہ بتانے لگی۔ چھوٹی سڑک سے ایک راستہ پل سے ہوتا ہوا ان کے سیکڑ میں جا اترتا تھا، جس سے وہ نہیں منٹ میں ادھر پہنچ سکتی تھیں۔

آج وہ بیس منٹ ایک پوری صدی لگ رہی تھے۔ وہ اس راستے پہ جاتے ہی دور کہیں کھو گئی تھی۔ نہ جانے وہ سب کیسے ہوں گے؟ اتنے ہی عیش و آرام سے رہ رہے ہوں گے جتنے پہلے تھے؟ کیا ان میں سے کسی نے اس کو یاد بھی کیا ہو گا؟ کبھی وہ اسپتال بھی آئے ہوں گے یا نہیں؟ اور نہ جانے فواد کے جا کر ہمایوں سے کیا کہا تھا جس پہ فرشتے روتی رہی؟ بہت یاد کرنے پہ بھی ایسی کوئی بات ذہن میں نہیں آئی جو وہ ہمایوں سے یوں کہہ سکتا تھا یا شاید اس کی سوچنے کی صلاحیت اب ست ہوتی جا رہی تھی۔

”یہ آپ کا گھر ہے جی؟ بڑا سوہنا ہے۔“ بلقیس کہہ رہی تھی اور وہ چونک کر اس اونچے عالیشان محل نما گھر کو دیکھنے لگی اس کا پینٹ، کھڑکیوں کے شیشے اور بیرونی گیٹ بدل گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گیا تھا۔

یہ وہ گھر تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کے اکیس سال گزارے تھے اور پھر اسی سے وہ ایک رات نکالی گئی تھی۔ بظاہر ہر شخص کی آڑ میں اسے اس گھر سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔

”بیل بجاؤ بلقیس!“ بلقیس آگے بڑھی اور گھنٹی بجائی۔ چند ہی لمحوں

بعد قدموں کی چاپ سنائی دی، جیسے کوئی دوڑتا ہوا گیٹ کھولتے آ رہا ہو۔ اس کے دل کی دھڑکن ٹھہری گئی۔ وہ اتنے سالوں بعد کے دیکھنے جا رہی تھی؟ فواد؟ حسن؟ آنا جات؟

دروازہ آہستہ سے کھلا اور کسی نے سر یا ہر نکال کر دیکھا۔

”جی کس سے ملنا ہے؟“ وہ جلیے اور لہجے سے ملازم لگتا تھا۔

بلقیس نے جواباً ”محل کو دیکھا تو وہ ہمت مجتمع کر کے بولی۔

”آغا کریم گھر پہ ہیں؟“

ملازم کے چہرے پہ ذرا سی الجھن ابھری۔

”کون آغا کریم؟“

”آغا۔۔۔ آغا کریم جو اس گھر کے مالک ہیں، جن کا یہ گھر ہے۔ اور یہ ہاؤس نمبر ٹو تھرتی ہے نا؟“

”آہو جی یہ ٹو تھرتی ہے، مگر یہ تو چوہدری نذیر صاحب کی کو تھرتی ہے۔ ادھر تو کوئی آغا کریم نہیں رہتے۔“

”جی بی بی! کس ہم غلط گھر میں تو نہیں آ گئے؟“ بلقیس نے ہونے سے کہا تو اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ نہیں یہ ہی گھر ہے، آغا کریم سات سال پہلے ادھر ہی رہتے تھے۔“

”سات سال تو بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے میڈم جی، خدا جانے وہ اب کدھر گئے ہوں۔ اچھا آپ ٹھہرو، میں بیگم صاحبہ سے پوچھ کر آتا ہوں۔“ وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ایک نوجوان کے ہمراہ ہوئی۔

”جی فرمائیے؟“ وہ بیس اکیس برس کا مہذب اور شائستہ سا نوجوان تھا۔

”وہ۔۔۔ ادھر آغا کریم اور ان کی فیملی رہتی تھی۔ وہ لوگ کدھر گئے؟“

”مہم! ہم دو سال سے ادھر رہ رہے ہیں، دو سال پہلے ہم نے ایک شیخ عامر صاحب سے یہ گھر خریدا تھا۔ ہو سکتا ہے ان کو آغا کریم نے یہ بیچا ہو، مگر میں ان کے



سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں پانی کی بوتلیں تھیں۔  
”اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ نکال ہی دیتا ہے۔“

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اسے لگا اس کی توبہ شاید قبول ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا ایمان اور تقویٰ بھی سانپ سیڑھی کے ٹھیل کی طرح ہوتا ہے ایک صحیح قدم کسی معراج پر پہنچا دیتا ہے تو دوسرا غلط قدم گہری کھالی میں اس نے بے ساختہ سوچا تھا۔

گاڑی گھر کے سامنے رکی اور ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ چوکیدار گیٹ کھول ہی رہا تھا جب اس کی نگاہ ساتھ والے بنگلے پر پڑی۔

”تم جاؤ میں آتی ہوں۔“ وہ سبک رفتاری سے باہر نکلی۔

بریگیڈیئر صاحب کا چوکیدار وہیں گیٹ پہ کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ”بیک کنگھالا۔“

”سنو“ یہ اپنے صاحب کو دے دیتا۔ ”اور چند ہیفٹس نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔“ ان سے کہنا یہ امانت ہے چاہے تو بڑھ لیں کوئی دباؤ نہیں مگر میں واپس ضرور لینے آؤں گی۔ پکڑ لو نا۔“ متذبذب کھڑے چوکیدار کو ہیفٹس زبردستی تھمائے اور واپس گھر کی جانب ہوئی۔

کوئی تو ہو گا جو اسے سنا جاوے گا۔ آج نہیں۔ کل نہیں مگر کبھی تو وہ ان ہیفٹس کو کھولیں گے۔

\*\*\*

کارڈور میں لگا سافٹ بورڈ آج کچھ زیادہ ہی چمک رہا تھا یا شاید وہ اس کیلی گرائی کے کناروں پہ لگی افشاں کی چمک تھی جو سافٹ بورڈ کے وسط میں آویزاں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دیوار کے قریب آئی۔ کیلی گرائی بہت خوبصورت تھی۔ اس پہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے بیٹے ابراہیم کی وفات کے

موقع پر کئے گئے الفاظ رقم تھے۔ وہ گردن اٹھائے ان الفاظ کو پڑھنے لگی۔

”عبدالرحمن بن عوف نے کہا“ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی روتے ہیں؟“ آپ نے فرمایا ”اے ابن عوف! یہ رحمت اور شفقت ہے۔“ اور آپ پھر رو پڑے اور فرمایا۔

”بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے، لیکن ہم زبان سے وہی بات نکالیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔ اے ابراہیم! بے شک ہم تیری جدائی بہت غم زدہ ہیں۔“

وہ تسخوری سی اسی طرح گردن اونچی اٹھائے کھڑی وہ الفاظ بار بار پڑھتی گئی۔ کچھ تھا ان میں جو اسے بار بار کھینچتا تھا۔ وہ وہاں سے جا ہی نہ پا رہی تھی جانے کے لیے قدم اٹھاتی مگر وہ الفاظ اسے روک دیتے اور وہ واقعی پھر سے رک جاتی۔

جب تفسیر کی کلاس کا وقت ہونے لگا تو وہ بمشکل خود کو وہاں سے کھینچ لائی۔ قرآن کھولتے ہوئے نظر درمیان کے کسی صفحے پر پڑ گئی۔

”ہر نفس موت کا آئینہ چمکنے والا ہے۔“ وہ صفحے پیچھے پلٹنے لگی۔ انگلی سے ورق پلٹتے ہوئے

ایک اور جگہ یونہی نگاہ پھسل گئی۔

”آج تم ایک موت نہ مانگو بلکہ آج تم کئی موتیں مانگو۔“

وہ سر جھٹک کر اپنے سبق پہ آئی۔ آج کی پہلی آیت ہی یہ تھی۔

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم میں سے کسی ایک پہ موت حاضر ہو جائے۔“

”اوہو مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بے بسی سے مسکرا کر رہ گئی۔ ”آج تو ساری موت کی آیتیں پڑھ رہی ہوں کہیں میں مرنے تو نہیں والی؟“

سوچو اور سبق پہ توجہ دو۔“

وہ سر جھٹک کر نوٹس لینے لگی۔ موت کی وصیت کے متعلق آیات پڑھی جا رہی تھیں۔

اسے یاد آیا ابھی اس نے ایک حدیث بھی کچھ ایسی ہی پڑھی تھی۔

”آپنا تک لکھتے لکھتے اس کا قلم پھسل گیا۔ وہ رک گئی اور پھر آہستہ سے سر اٹھایا۔“

”کیا کوئی مرنے والا ہے؟“ اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ وہ جو قرآن میں پڑھتی تھی وہ اس کے ساتھ پیش آجاتا تھا یا آنے والا ہوتا تھا۔ کبھی ماضی، کبھی حال اور کبھی مستقبل۔ کوئی لفظ بے مقصد بے وجہ اس کی آنکھوں سے نہیں گزرتا تھا۔ پھر آج وہ کیوں بار بار ایک ہی طرح کی آیات پڑھ رہی تھی۔ کیا کوئی مرنے والا ہے؟ کیا کوئی اسے چھوڑ کر جانے والا ہے؟ کیا اسے قرآن وہی طور پہ تیار کر رہا ہے اسے صبر کرنے کو کہ رہا ہے مگر کیوں؟ کیا ہونے والا ہے؟

وہ بے چینی سے قرآن کے صفحے آگے پلٹنے لگی۔

”اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

ایک سطر پڑھ کر اس نے ڈھیر سارے ورق پلٹے۔

”صبر کرنے والے اپنا صلہ۔“

پورا پڑھے بغیر اس نے آخر سے قرآن کھولا۔

”اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہو۔“

اور پھر وہ صفحے تیز تیز پلٹتی ایک نظر سے سب گزارتی جا رہی تھی۔

”اور کوئی نہیں جانتا وہ کون سی زمین پہ مرے گا۔“

محمل کا دم گھٹنے لگا تھا۔ بے اختیار گھبرا کر اس نے قرآن بند کیا۔ اسے پسینہ آ رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ کیا وہ برداشت کر پائے گی؟ شاید نہیں اس میں اتنا صبر نہیں ہے۔ وہ کچھ نہ برداشت کر پائے گی۔ کبھی بھی نہیں۔ اس نے وحشت سے اوہرا اوہر دیکھا۔

میڈم مصباح کا لیکچر جاری تھا۔ لڑکیاں سر جھکائے نوٹس لے رہی تھیں۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے ذرا سی گردن اوپر کو اٹھائی۔ اوپر چھت تھی۔ چھت کے پار آسمان تھا۔ وہاں کوئی اس کی طرف ضرور

متوجہ تھا مگر وحشت اتنی تھی کہ وہ دعا بھی نہ مانگ سکی۔ تب ہی آیا امل اسے دروازے میں نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی۔ وہ میڈم مصباح کے پاس گئیں اور چٹ ان کی طرف بڑھائی۔ میڈم نے لیکچر روک دیا اور چٹ تھامی۔

محمل بنا پلک جھپکے ان کو دیکھ رہی تھی۔

میڈم مصباح نے چٹ پڑھ کر سر اٹھایا، ایک نگاہ پوری کلاس پہ ڈالی پھر چروہائیک کے قریب کیا۔

”محمل ابراہیم پلینز ادھر آجائیں۔“

اور اسے لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔ وہ جان گئی تھی۔ کوئی مرنے والا نہیں تھا۔ اب کسی کو نہیں مرنا تھا۔ اس کا نام پکارا جا رہا تھا اور اس کی ایک ہی وجہ تھی۔

جسے مرنا تھا وہ مر چکا تھا۔ کہیں کوئی اس کا پیارا مر چکا تھا۔

وہ نیم جاں قدموں سے اٹھی اور میڈم کی طرف بڑھی۔

”آنکھ آنسو بہاتی ہے۔“

دل غمگین ہے۔

مگر ہم زبان سے وہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔

اے ابراہیم۔۔۔ بے شک ہم تیری جدائی بہت غم زدہ ہیں۔“

صدیوں پہلے کسی کے کہے گئے الفاظ کی بازگشت اسے سارے ہال میں سنائی دے رہی تھی۔ بانی ساری آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ اس کے کان بند ہو گئے تھے۔ زبان بند ہو گئی تھی۔

بس وہ ایک آواز اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

آنکھ آنسو بہاتی ہے۔

دل غمگین ہے۔

دل غمگین ہے۔

دل غمگین ہے۔

وہ بمشکل میڈم مصباح کے سامنے کھڑی ہوئی۔

جی میڈم؟“



بارے میں قطعی لاعلم ہوں۔

”آتما جان نے یہ گھر بیچ دیا؟ مگر کیوں؟“ وہ شکند سی رہ گئی۔

”معلوم نہیں میم ایک میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟“

اس کا سرفنی میں دائیں سے بائیں ہلا۔ لڑکا معذرت کر کے واپس چلا گیا اور وہ پریشان سی بیٹھی رہ گئی۔

”بی بی! ہمسائیوں سے پوچھتے ہیں۔“ اور اس کے منع کرنے سے قبل ہی بلقیس ساتھ والے گھر کی کھٹی بجاکچی تھی۔ اس گھر میں کون رہتا تھا؟ خاصا جانا پہچانا سا گھر تھا مگر یاد نہیں آ رہا تھا۔

بمشکل ایک منٹ بعد ہی گیٹ کھل گیا۔ محل نے گردن اٹھا کر دیکھا۔

اُدھر کھلے گیٹ کے اس پار بریگیڈیئر فرقان کھڑے تھے۔

شلوار قمیص میں ملبوس، چہرے پر نفاست سے تراشیدہ داڑھی اور بھرپور مسکراہٹ لیے وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آنے لگا۔ ”السلام علیکم لیل گزل! میں کافی دیر سے آپ کو ٹیڑس سے دیکھ رہا تھا۔ آئیے اندر آجائیں۔“ انہوں نے گیٹ پر اکھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ گئے۔ بلقیس اس کی وہیل چیئر ڈھکیلتی اندر روش پہلے آئی۔

”اُدھر آجائیے۔“ وہ لان میں گھاس پر رکھی لان چیئرز کو جوڑنے لگے، یوں کہ وہیل چیئر کی جگہ بن جائے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے اور بہت شائستگی سے پوچھنے لگے۔ ان کا مخصوص لب و لہجہ اسی طرح بھاری تھا، البتہ سختی کی جگہ نرمی نے لے لی تھی۔

”ٹھیک ہوں الحمد للہ۔“ وہ ذرا سا مسکرائی اور سر جھکا لیا، پھر کچھ سوچ سوچ کر اسی جھکے سر کے ساتھ کہنے لگی۔ ”میرا کچھ سال پہلے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا“

تقسیم

”میں جانتا ہوں“ میں آپ کو دیکھنے اسپتال آتا تھا۔

اس نے ہولے سے سر اٹھایا۔ سنہری آنکھوں میں حیرت اتر آئی تھی۔

”اچھا؟“ اور پھر اسے یاد آگیا۔ ”ہاں مجھے نرس نے بتایا تھا۔ تو وہ آپ تھے؟“

”جی ہاں۔“ وہ دھیمے سے مسکرائے۔ ”آپ کی امانت نے میری زندگی بدل دی بیٹا۔“

وہ بنا ملک جھپکے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں نے دو سال وہ پمفلٹ نہیں کھولے۔ پھر زندگی میں ایک موڑ ایسا آیا کہ ہر جگہ اندر حیرت کھٹنے لگا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ان کو کھول لیا۔ میرا خیال تھا، ان میں کسی تنظیم کا لہر بچ ہو گا یا کسی سیاسی پارٹی کا منشور، مگر ان میں تو صرف قرآن کی آیات تھیں اور ان کا سادہ ترجمہ۔ میں پڑھتا گیا اور پھر۔ پھر سب بدل گیا، سب ٹھیک ہو گیا۔“

مختصر الفاظ میں انہوں نے ساری بات سمیٹ دی۔ وہ چپ چاپ انہیں سنتی گئی۔

”آپ کچھ عرصہ پہلے گھر شفٹ ہو گئی تھیں، مجھے پتا چلا تھا۔ اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“

”ایم ٹائن۔“ پھر لمحے بھر کے توقف کے بعد بولی۔

”آتما جان وغیرہ کدھر گئے؟ انہوں نے گھر کیوں بیچ دیا؟“

”جن دنوں وہ گئے تھے میں ملک سے باہر تھا، بس ملازم سے ہی تھوڑا بہت سنا تھا کہ شاید تینوں بھائیوں نے جائیداد کا بٹوارہ کیا ہے اور گھر بیچ کر رقم تقسیم کر کے الگ الگ جگہوں پہ شفٹ ہو گئے ہیں۔ آپ کے ایکسیڈنٹ کا بھی میرے ملازم نے ہی بتایا تھا۔“

”کب کی بات ہے یہ؟ کب بیچا انہوں نے گھر؟“

”آپ کے ایکسیڈنٹ کے تقریباً سال ڈیڑھ بعد۔“

”اوہ!“ اس کے لب مسکڑے اور پھر اس نے گہری سانس لی۔ ”کوئی اندازہ ہے آپ کو کہ وہ کہاں گئے؟“

اب میں ان سے کدھر ملوں؟

”انہوں، قطعی نہیں۔“ انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں سرفنی میں ہلایا۔ ”ہمارے کبھی اتنے تعلقات تھے ہی نہیں، ہاں آتما اسد کے بارے میں میں نے ایک دوست سے سنا تھا۔ وہ کلب میں آتما اسد کے ساتھ ہوتا تھا۔“

ان کے الفاظ پر وہ چونکی، دل زور سے دھڑکا۔

”کیا؟ کیا سنا تھا؟“

”یہ ہی کہ ان کو کینسر ہو گیا تھا، اور پھر ان کی ڈیٹھ ہو گئی۔ آپ کو نہیں پتا چلا؟“

وہ سانس روکے، ہکا بکا سی بیٹھی رہ گئی۔

”آئی ایم ویری سوری محمل۔“ انہیں افسوس ہوا۔

”کب؟ کب ہوا یہ؟“ چند لمحے بعد اس کے لب پھر پھڑپھڑائے۔ آنکھیں پھری گئی تھیں۔

”غالبا“ پانچ سال قبل، ان کے گھر بیچنے کے چھ سات ماہ بعد۔“

”اور۔ اور ان کے بچے؟ معاذ اور معیز تو بہت چھوٹے تھے۔“

”معاذوم نہیں۔ یتیم بچے تو پھر مجبوراً رشتہ داروں کے تسلط میں ہی رہتے ہیں۔ اللہ ان پر رحم کرے۔“

اور وہ لفظ ”یتیم بچے“ محمل کے دل میں کھب گیا۔

بہت پہلے پڑھی گئی ایک آیت ذہن میں گونجی۔ ”ان لوگوں کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور یتیم اولاد چھوڑ جاتے۔“ (ساء 9)

”یتیم بچے؟ اسد چچا کے بچے یتیم ہو گئے؟ آرزو معاذ معیز۔“ وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

اور پھر کب وہ بریگیڈیئر فرقان کو خدا حافظ کہہ کر بلقیس کے ہمراہ باہر آئی، اسے کچھ پتا نہ چلا۔ دل و دماغ بس ایک ہی نقطے پہ منجمد ہو گئے تھے۔ اسد چچا کے بچے یتیم ہو گئے۔

بے اختیار اسے اس لاؤنج کا وہ منظر یاد آیا۔ صوفے پہ گری محمل اور اس کو تھپتھپ اور جوتوں سے مارتے اسد چچا اور غفران چچا۔

غفران چچا۔ نہ جانے وہ کہاں گئے؟ اور آتما

# کرن

ماہنامہ

جولائی 2011 کے شمارے کی ایک جنگ

”آواز کی دنیا سے“ نوز کا سٹر FM-105 کی ”سمیٹھا سیفی“ کی باتیں۔

اداکارہ ”نیلیم منیر“ سے شاہین رشید کی ملاقات۔

اداکارہ ”صدف عمیر“ دو کے پھاڑے کے ساتھ۔

”مجھ سے ملیے“ کے سلسلے میں ”سنگتہ بھٹی“ کے بارے میں دلچسپ باتیں۔

”پیدا کا گھر پیارہ لگے“ قارئین کا پند یہ سلسلہ۔

”قارئین کی عدالت میں“ اداکار ”میکال ذوالفقار“ سے سوالات۔

”بول کہ لب آزاد ہیں تیرے“ قارئین کے لیے دلچسپ سلسلہ۔

”دردِ دل“ نیلم عزیز کا سلسلہ وار ناول۔

”دستِ کورہ گھر“ فوزیہ یاسمین کا سلسلہ وار ناول۔

”باتِ زندگی کی“ نازیہ کنول نازی کا مکمل ناول۔

”اور سے پیدا“ نایاب جیلانی کا مکمل ناول۔

”یہ داغ“ نیلم عزیز کا مکمل ناول۔

”اسیر موسمِ ہجران“ ضواریہ ساحر کے ناول کا دوسرا حصہ۔

”گوشہ عافیت“ خلفہ بھٹی کا ناول اختتام کی طرف۔

”بہاراں سے تم سے“ نازیہ جمال کا دلکش ناول۔

”الماس یاسمین حریم ملک، لطیف طاہر اور شاہد ملک کے فسانے اور مستقل دلچسپ سلسلے۔“

ان شمارے کے ساتھ کرن کتاب

”اجار، چٹنیاں اور مریے“

مکتبہ انوار کتب خانہ، لاہور کے ہر شمارے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔



”آپ کا ڈرائیور آپ کو لینے آیا ہے“ امیر جنسی ہے ”آپ کو گھر جانا۔“

مگر وہ پوری بات سننے بغیر ہی سیڑھیوں کی طرف بھاگی، ننگے پاؤں زمین پھلاکتی وہ تیزی سے اوپر آئی تھی۔ جوتوں کا ریک ایک طرف رکھا تھا، مگر محمل کو اس وقت جوتوں کا ہوش نہ تھا۔ وہ سنگ مرمر کے فرش پر ننگے پاؤں دوڑتی جا رہی تھی۔

غفران چچا کی اکاڑ سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور دروازہ کھولے منتظر کھڑا تھا اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

”بی بی آپ۔۔۔“

”پلیز خاموش رہو۔“ وہ بمشکل ضبط کرتی اندر بیٹھی۔ ”اور جلدی چلو۔“

اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا گویا ابھی سینہ توڑ کر باہر آکرے گا۔

آغا ہاؤس کا مین گیٹ پورا کھلا تھا، باہر گاڑیوں کی قطار لگی تھی۔ ڈرائیور نے لوگوں کا جیم غفران کھٹا تھا۔ گاڑی ابھی گیٹ کے باہر سڑک پہنچی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر بھاگی۔ ننگے پاؤں تارکول کی سڑک پہ جلتے لگے، مگر اس وقت جلن کی پرواہ کسے تھی۔

اس نے رش میں گھرے آغا جان کو دیکھا، غفران چچا کو دیکھا، حسن کو دیکھا، وہ سب اس کی طرف بڑھے تھے، مگر وہ اندر کی طرف لپک رہی تھی۔ لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتی وہ ان آوازوں تک پہنچنا چاہتی تھی جو لان سے آرہی تھیں۔ عورتوں کے بین روئے، آہ و بکا کی آوازیں۔

لوگ ہٹ کر اس سفید یونیفارم اور گلابی اسکارف والی لڑکی کو راستہ دینے لگے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی لان تک آئی اور پھر گھاس کے وہانے پہ بے اختیار رک گئی۔

لان میں عورتوں کا ایک جھوم اکٹھا تھا۔ درمیان میں چارپائی رکھی تھی، اس پہ کوئی سفید چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ چارپائی کے چاروں طرف عورتیں رو رہی تھیں۔ ان کے چہرے گنڈ سے ہو رہے تھے۔ ایک دفعہ چچی تھیں۔ اور ہاں ناعہ چچی بھی تھیں اور وہ سینے پہ دو

ہتھ مار کر روتی رضیہ پھوپھو تھیں، اور وہ اونچی آواز میں بین کرتی متاب تالی تھیں۔ سب تو ادھر موجود تھے۔

پھر کون تھا اس چارپائی پہ؟ کون۔۔۔ کون تھا وہ؟ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، وہاں سارا خاندان اکٹھا تھا، بس ایک چہرہ نہ تھا۔

”اماں! اس کے لب پھر پھڑپھڑائے۔“

اس نے انہیں پکارنے کے لیے لب کھولے، مگر آواز نہ گویا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ وحشت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی، شاید اس کی ماں کسی کونے میں بیٹھی ہو، مگر وہ کہیں نہ تھی۔ اس کی ماں کہیں نہ تھی۔

”محمل۔۔۔ محمل۔“ وہ عورتیں اسے پکار رہی تھیں۔ اٹھ اٹھ کر اسے گلے سے لگا رہی تھیں، کسی نے راستہ بنا دیا، تو کوئی میت کے پاس سے ہٹ گیا، کوئی اسے ہاتھ سے پکڑ کر چارپائی کے قریب لے آیا، کسی نے شانوں پہ زور دے کر اسے بٹھادیا۔ کسی نے میت کے چہرے سے سفید چادر ہٹا دی۔ کون کیا کر رہا تھا، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ساری آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ اور گردی عورتوں کے لب مل رہے تھے، مگر وہ سن نہ پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں، رو رہی ہیں یا ہنس رہی ہیں، وہ تو بس یک ٹک بیٹا پلک جھپکے اس زرد چہرے کو دیکھ رہی تھی جو چارپائی پہ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ منتھوں میں روئی ڈالی گئی تھی اور چہرے کے گرد سفید پٹی تھی۔ وہ چہرہ واقعی اماں سے بہت ملتا تھا۔ بالکل جیسے اماں کا چہرہ ہو، اور شاید۔ شاید وہ اماں کا چہرہ ہی تھا۔

اسے بس ایک بل لگا تھا یقین آئے میں، اور پھر اس نے چاہا کہ وہ بھی دھاڑیں مار کر رونے لگے، نوحہ کرے، بین کرے، زور زور سے چلائے، مگر وہ رحمتہ العالمین کے کہے گئے الفاظ۔۔۔

”مگر ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔“

اور اس کے لب کھلے رہ گئے، آواز حلق میں ہی دم توڑ گئی۔ زبان ہلنے سے انکاری ہو گئی۔

اس کا شدت سے دل چاہا کہ اپنا سر پیٹے، سینے پر دو ہتھ مار کر بین کرے۔ وہ پٹہ پھاڑ ڈالے اور اتنا جی جیججج کر روئے کہ آسمان مل جائے، اور پھر اس نے ہاتھ اٹھائے بھی مگر۔

”نوحہ کرنے والی اگر توبہ کیے بغیر مر گئی تو اس کے لیے تارکول کے کپڑے اور آگ کے شعلے کی گیس ہوگی۔“

”جو گریبان چاک کرے اور رخساروں پر طمانچہ مارے اور بین کرے ہم میں سے نہیں۔“

یہ ہدایت تو اب تک کے لیے تھی۔ اس کے ہاتھ اٹھنے سے انکاری ہو گئے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن لب خاموش تھے۔

”اے رلاؤ! اس سے کہو اونچا روئے، ورنہ پاگل ہو جائے گی۔“

”اس سے کہو دل ہٹا کر لے۔“

بہت سی عورتیں اس کے قریب زور زور سے کہہ رہی تھیں۔

”میری بی بی!“ تالی متاب نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ اسی طرح ساکت سی بیٹھی ماں کی میت کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو گر کر گردن پہ لڑھک رہے تھے۔ اس کا پورا چہرہ بھیگ گیا تھا، مگر زبان۔ زبان نہیں ہلتی تھی۔

”مسرت تو ٹھیک ٹھاک تھی، پھر کیسے۔“

”بس صبح کننے لگی سینے میں درد ہے۔ ہم فوراً اسپتال لے کر گئے، مگر۔“

ادھوری ادھوری سی آوازیں اس کے ارد گرد سے آرہی تھیں، مگر اسے سنائی نہ دے رہی تھیں، اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہا تھا۔ اسے لگا اسے چکر آ رہے ہیں، عجیب سی منتھن تھی، اس کا سانس بند ہونے لگا تھا۔

وہ ایک دم اٹھی اور عورتوں کو ہٹاتی اندر بھاگ گئی۔

کسی نے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ ایک دفعہ۔

دو دفعہ، پھر تیسری دفعہ، اس نے گھٹنوں پہ رکھا سر ہوئے سے اٹھایا۔ دروازہ بج رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھی، بیڈ سے اترتی، سیلیپر پاؤں میں ڈالے اور کنڈی کھولی، باہر فضا چچی کھڑی تھیں۔

”محمل بیٹا! تمہارے آغا جان تمہیں بلا رہے ہیں۔“

”آتی ہوں۔“ اس نے ہولے سے کہا تو فضا چچی پلٹ گئیں۔ وہ کچھ دیر یوں ہی ادھر کھڑی رہی، پھر باہر آ گئی۔

سیڑھیوں کے قریب لگے آئینے کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ پل بھر گور کی، اس کا عکس بھی رک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہ سفید ململ کا روپٹہ سر پہ لیے وہ کمزور پڑھو سی محمل ہی تھی؟ ہاں شاید وہ ہی تھی، سفید روپٹے کے بالے میں اس کا چہرہ کھپلایا ہوا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے تھے، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

آغا جان کے کمرے میں سب چچا اور چچیاں موجود تھیں، وسیم بھی ایک طرف کھڑا تھا۔

”او محمل!“ اسے آتے دیکھ کر آغا جان نے سامنے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ آج اماں کو گزرے چوتھا دن تھا اور گھر والوں کا رویہ پہلے کی نسبت اب خاصا نرم تھا۔

وہ چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گئی۔

”اس صبح جب مسرت کی ڈفٹھ ہوئی، اس نے درد شروع ہوتے ہی یہ کچھ چیزیں وصیت کی تھیں، تمہارے لیے۔“ (اسے لگ رہا تھا وہ اب مزید نہیں جی پائے گی) ”ہم نے سوچا کہ تمہیں دے دی جائیں۔“ انہوں نے ایک طرف رکھا ڈیہ اٹھایا۔ محمل نے سر اٹھا کر ڈبے کو دیکھا۔ یہ ڈبہ اماں کے زیورات کا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ تالا لگا کر الماری کے نچلے خانے میں رکھتی تھیں۔

”یہ ایک ڈیہ تھا اس کی یہ چابی ہے، تم خود دیکھ لو اور ساتھ یہ کچھ رقم تھی، اس کی جمع پونجی اس نے مجھ سے



جان۔۔۔ سب کدھر چلے گئے؟ وہ ان لوگوں کو کدھر ڈھونڈے؟

مگر وہ ان کو کیوں ڈھونڈنا چاہتی تھی؟ اس نے خود سے پوچھا کیا وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ان کو ان کے کیے کی سزا ملی یا نہیں کہ آخر یہ قانون فطرت ہے یا یہ ان خون کے رشتوں کی محبت میں ان کو یاد کر رہی تھی؟ شاید خون کی محبت غالب آگئی تھی یا شاید اپنے سب سے قریبی رشتوں شوہر اور بیٹے کے ٹھکرائے جانے کے بعد اسے کسی رشتے کی ضرورت تھی ہاں شاید یہ ہی بات تھی۔

وہ ان ہی سوچوں میں الجھتی گھر واپس آئی تھی۔

\*\*\*

سارے میں فجر اتری تھی جب وہ وہیل چیئر کو خود گھسیٹتی، کھینچتی لان میں آئی۔ شبنم کے قطرے گھاس پہ بکھرے تھے۔ دور کہیں پرندوں کی حمد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مختلف بولیاں، مگر ایک ہی بات انسانوں کی سمجھ میں نہ آئے وہ اور بات ہے۔ تب ہی وہ آہستہ آہستہ وہیل چیئر چلائی دیوار کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ دیوار کے اس پار مدرے کی عمارت تھی۔ صبح کے وقت مدرے کے صحن میں بچوں کی ناظرہ کلاس ہوتی تھی۔ وہاں بچے بلند آواز میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ان کی تجوید کی ہلکی ہلکی آواز ان کے لان میں بھی سنائی دیتی تھی۔

وہ آواز آج بھی آرہی تھی۔ وہ وہیں، دیوار کے ساتھ وہیل چیئر روکے کان لگا کر سننے لگی۔

وہ سب مل کر بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ ترجمہ ”اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور کہو حطمتہ ہم تمہارے گناہ بخش دے گا اور عنقریب ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے۔“ آج اس نے بہت عرصے بعد وہ آیت سنی تھی۔ بے اختیار وہ گود میں رکھے قرآن کے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ بنی اسرائیل کے ہیکل میں داخل ہونے کا قصہ تھا۔ سورۃ البقرہ کی 58 آیت جب انہوں نے

حطمتہ کے بجائے حنطتہ کہا تھا۔ محفل کو کبھی یہ قصہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب بھی وہ الجھ سی گئی اور وہ صلی

اس میں اس نے کوئی خاص نوٹس نہیں لکھے تھے۔ شاید پرانے رجسٹر میں ہوں جو الگ سے تھے۔ اس نے اپنی وہیل چیئر کا رخ موڑا اور اندر لے گئی۔ اسٹڈی میں ایک جگہ اس نے اپنے پرانے نوٹس رکھے تھے۔ وہ ان ہی کو ڈھونڈنے اسٹڈی میں آئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا وہ اندر آگئی۔

ہمایوں اس کی طرف پشت کیے ریک میں سے کوئی کتاب نکال رہا تھا۔ آہستہ آہستہ ایک نظر اسے دیکھا اور پھر واپس کام میں لگ گیا۔ اجنبیت، سرد مہری، بے حسی، مگر زیادہ دل جلانے بغیر وہ کمرے کے مطلوبہ حصے کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے نوٹس وہیں رکھے تھے۔ گرد کی ایک تہ ان پہ جمی تھی، جیسے ان کمرے برسوں میں بس واجبی سی صفائی کی جاتی رہی ہو۔ ظاہر ہے فرشتے کیا کیا دیکھے اسے کسی دن اسٹڈی کی صفائی کروانا چاہیے۔ وہ سوچتی ہوئی مطلوبہ رجسٹر ڈھونڈنے لگی۔

بغیر کسی وقت کے اسے وہ رجسٹر سامنے۔ بی مل گیا۔ اس پہ ہلکی ہلکی سی گرد کی تہ جمی تھی۔ محفل نے وہ ترجما کر کے چرے کے سامنے کیا اور پھونک ماری گرد اڑ کر دور بکھر گئی۔

”میں تمہیں چھوڑنا چاہتا ہوں۔“ ہمایوں بغیر کسی تمہید کے کھڑے کھڑے کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کرتے بولا تھا۔

لمحے بھر کو محفل کو نگاہ دھول مٹی رجسٹر سے اڑ کر ہر طرف چھاننے لگی ہے۔ اس نے بمشکل رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے نیاز سا کتاب کے ورق پلٹ رہا تھا۔ ”میرا مطلب مکمل علیحدگی سے ہے۔ میں اب یہ رشتہ مزید نہیں نبھانا چاہتا۔ سو مجھے اپنے پیروں کی زنجیر کھولنے دو۔ سنی ہم دونوں کا بیٹا ہے اور سات سال کا ہو چکا ہے۔ اس کی کسٹڈی اسے خود ڈیسیائیڈ کرنے دینا۔“

دھل شاید اس کی آنکھوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ وہ سرخ پڑنے لگی تھیں۔ وہ لب کچلتی اس کی بات سن رہی تھی۔

”اگر سنی تمہارے ساتھ رہنا چاہے تو میں اسے بھر نہیں کروں گا کہ وہ میرے ساتھ رہے اور اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہے تو تم اسے مجبور مت کرنا، جو بھی فیصلہ کرو، مجھے بتا دینا لیکن میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“ اس نے کتاب ریک میں واپس رکھی اور بتا اس کو دیکھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

وہ شدید صدمے کے زیر اثر پتھر پر بیٹھ بیٹھی رہ گئی۔ کیا ہوں اس طرح اسے اپنی زندگی سے دور کر سکتا ہے؟

”اگر کرتا ہے تو کرتے دو میں مرنے میں جاؤں گی اس کے بغیر۔“ ایک دم اس نے سر جھٹکا۔ آگے آنسو بہاتی ہے۔ اور دل غمگین ہے۔

ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔

بے اختیار ہی وہ مدھم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے دل کو جیسے قرار سا آگیا۔ اس نے رجسٹر کھولا نوٹس میں اس واقعے کے متعلق بس اتنا لکھا ہوا تھا کہ ہیکل میں داخلے سے قبل جب بنی اسرائیل کو کہا گیا کہ سواریوں پہ جھٹکے ہوئے عاجزی سے حطمتہ یعنی ”بخشش“ کہتے ہوئے داخل ہو، تو وہ مسخراڑاتے ہوئے زبانیں مروڑ کر حنطتہ حنطتہ (Hintatun) کہتے ہوئے دروازے سے داخل ہوئے آگے لکھا تھا۔

”حنطتہ کا مطلب ہوتا ہے گن۔“ اس سے آگے صفحہ ختم تھا۔

اس نے ذہن سے تمام سوچوں کو جھٹک کر ان الفاظ پر غور کیا اور پھر نئے سرے سے الجھ گئی۔ وہ واقعہ اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ بنی اسرائیل جتنی

جینیٹس اور عقل مند قوم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے گن کس چیز کو کہا؟ جب ان کو سیدھے طریقے سے بتایا گیا تھا کہ وہ بخشش مانگیں تو انہوں نے ”گن گن“ کیوں کہا؟ ایک طرف وہ اتنے ذہین تھے کہ حطمتہ سے ملتا جلتا لفظ ڈھونڈ لائے اور دوسری طرف اس لفظ کو کہنے کا مطلب ہی نہیں بتا تھا۔ آخر کیوں انہوں نے صحیح لفظ نہ بولا؟ حنطتہ کیوں کہا؟

وہ سمجھ نہ پائی اور پھر قرآن بند کر کے رکھ دیا۔ دل اتنا خالی تھا کہ تفسیر کھول کر تفصیل پڑھنے کو بھی نہیں چاہا۔ کانوں میں ابھی تک ہمایوں کے الفاظ گونج رہے تھے۔

ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکلا اور رخسار پہ پھسلا گیا۔

”تو جس حال میں بھی رکھے، میرے مالک، میں تجھ سے راضی۔“ اور نہایت بے دردی سے اس نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑ ڈالا تھا۔

\*\*\*

تینوں کے چھوٹے چھوٹے لقمے لے رہا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ اس کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی وہیل چیئر گھسیٹتی ڈائننگ ہال میں داخل

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

# کوئی ایسا اٹل دل ہو

## فیصلہ ختم

قیمت --- /- 250. پے

منکوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار، کراچی۔



کہا تھا کہ میں تمہارے اکاؤنٹ میں جمع کراؤں مگر میں نے سوچا کہ میں یہ تمہارے حوالے ہی کروں تم بہتر فیصلہ کر سکتی ہو۔

انہوں نے ایک پھولا ہوا لفافہ ڈبے کے اوپر رکھا۔ محل نے آہستہ سے لفافہ اٹھایا اور کھول کر دیکھا۔ اندر ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے شاید اماں نے اس کے جینر کے لیے رکھے تھے۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس نے لفافہ ایک طرف رکھا اور چالی سے کاسی ڈبے کا تالا کھولا۔

اندر کچھ زیورات تھیں۔ خالص سونے کے جڑاؤ زیورات اس نے ڈبہ بند کر دیا۔ معلوم نہیں اماں نے کب سے سنبھال رکھے تھے۔

”وسیم سمیت تمام لوگ اس وصیت کے وقت موجود تھے۔ تم سب سے پوچھ سکتی ہو میں نے تمہارا حق پورا ادا کر دیا ہے یا نہیں۔“

اس نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں، سامنے صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے تمام نفوس کے چہرے مطمئن تھے مطمئن اور بے نیاز۔

”چیزیں تو آپ نے ادا کر دی ہیں آغا بھائی مگر مسرت کی وصیت؟“ دفعتاً فضا چچی نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

”اوہ فضا! ابھی اس کی ماں کو گزرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“ تائی متاب نے نگاہوں سے تنبیہ کی۔

”مگر بھائی! مسرت نے کہا تھا کہ جلد از جلد۔“

”رہنے دو فضا! ہم اس کا فیصلہ محل پر چھوڑ چکے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔“

”مگر ایٹ لیسٹ اسے بتا دوں۔“

”ابھی اس کا غم تو بڑھا ہوا ہے۔“

ان کی دہلی دلی سرگوشیاں اسے بے چین کر گئیں۔

”تائی اماں! کیا بات ہے؟ اماں نے کچھ اور بھی کہا تھا؟“

سب ایک دم خاموش سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”محل! میں تمہیں کچھ دن تک بتاؤں گی، ابھی

اس قصے کو چھوڑ دو۔“

”پلیز تائی اماں! مجھے بتائیں۔“

”مگر تمہارا غم ابھی۔“

”میں ٹھیک ہوں، مجھے بتائیں۔“ اس نے بے چینی سے بات کاٹی۔

تائی متاب نے ایک نظر سب کو دیکھا پھر قدرے ہچکچا کر گویا ہوئیں۔

”بات یہ ہے کہ مسرت نے مرنے سے پہلے وسیم کو بلو کر ان سب کے سامنے تمہارے آغا جان سے کہا تھا کہ اگر وہ بچ نہ سکے تو جتنی جلدی ہو ہم محل کو وسیم کی دہن بنا کر سہارا دیں اس کو بے آسرا نہ چھوڑیں اور تمہارے آغا جان نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔“

وہ اپنی جگہ سن سی ہو گئی۔ ”زمین جیسے قدموں تلے سے سرکنے لگی تھی اور آسمان سر سے ہٹنے لگا تھا۔“

”اماں نے یہ سب کہا؟“

”ہاں یہ سب لوگ جو یہاں ہیں اس بات کے گواہ ہیں، تم کسی سے بھی پوچھ لو۔“

وہ ایک دم بالکل چپ سی ہو گئی۔ عجیب سی بات تھی اسے یقین نہ آ رہا تھا۔

”لیکن محل! ہم نے یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے، تم چاہو تو یہ شادی کرو، چاہو تو نہ کرو، ہم نے تمہیں اس لیے آگاہ کر دیا کہ یہ تمہاری ماں کی آخری خواہش تھی۔ یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس کی بات رکھتی ہو یا نہیں۔ ہم میں سے کوئی تم پر زور نہیں ڈالے گا۔“

وہ سر جھکائے کاسی ڈبے کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔

مگر یہ ڈبہ اور لفافہ ثبوت تھا کہ یہ وصیت واقعی اس کی ماں نے کی تھی۔

”مگر تمہیں منظور ہے تو ہم اگلے جمعے کو نکاح رکھ لیتے ہیں کہ مسرت کی خواہش تھی یہ کام جلد از جلد کیا جائے، اگر نہیں تو کوئی بات نہیں، تم جو چاہو گی وہی ہوگا۔“ تائی متاب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

اس نے ہونے سے سراٹھایا۔ سنہری آنکھیں پھر

سے بھیگ چکی تھیں۔ کمرے میں موجود تمام نفوس دم ساوہ اسے دیکھ رہے تھے۔

”میں اپنی ماں کی بات کا مان رکھوں گی۔ آپ جب کہیں گی میں شادی کے لیے تیار ہوں۔“

پھر وہ رکی نہیں ڈبہ اور لفافہ اٹھا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ کچن میں کرسی پر بیٹھی تھی ہاتھ میں صبح و شام کی دعاؤں اور اذکار کی کتاب تھی اور وہ منہمک سی پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی۔

”ہم نے صبح کی فطرت اسلامیہ اور کلمہ اخلاص پڑھا اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر اور اپنے باب ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر جو یکسو مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔“

”محل! کسی نے زور سے کچن کا دروازہ کھولا۔ اس نے چونک کر سراٹھایا۔ سامیہ عجلت میں اندر داخل ہوئی تھی۔

”تم سے کوئی ملنے آیا ہے، ڈرائنگ روم میں ہے، جاؤ مل لو۔“

”کون ہے؟“

”وہی پولیس والا! وہ کہہ کر پلٹ گئی۔

”ہمایوں آیا ہے؟“ وہ کتنی ہی دیر کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی پھر آہستہ سے اسے بند کیا، سلیپ پر رکھا، لباس کی شکنیں درست کیں اور سیاہ دوپٹہ ٹھیک سے سر پہ لے کر باہر آئی۔

ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی جیسے دو لوگ گفتگو میں مشغول ہوں۔ یہ ہمایوں سے کون باتیں کر رہا ہے؟ وہ الجھتی ہوئی اندر آئی، ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ ہال کے درمیان سفید جالی دار پردہ تھا۔ وہ پردے کے پیچھے ذرا دیر کوری۔

سامنے بڑے صوفے پر ہمایوں بیٹھا تھا۔ اس کے

بالکل مقابل سنگل صوفے پر آرزو بیٹھی تھی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، آدھی پنڈلی تک ٹراؤزر پہنے وہ اپنے مخصوص بے نیاز حلیے میں تھی، کٹے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتی وہ ہنس ہنس کر ہمایوں سے کچھ کہہ رہی تھی۔

جانے کیوں اسے یہ اچھا نہ لگا۔ اس نے ہاتھ سے پردہ سمیٹا اور اندر قدم رکھا۔

وہ جیسے اسے دیکھ کر کھٹکتے کھٹکتے رکھنے پر اختیار کھڑا ہو گیا۔ بلیو شرٹ اور گرے پینٹ میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح بہت شان دار لگ رہا تھا۔ آغا جان اسے پسند نہیں کرتے تھے، مگر پھر بھی اسے اندر آنے دے دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اب وہ ان کی بہو بننے والی تھی اور اس کو وہ ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

”السلام علیکم۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ آرزو کے چہرے پر یہ ذرا سی ناگواری ابھری، جسے ہمایوں نے نہیں دیکھا تھا، وہ پوری طرح محل کی طرف متوجہ تھا۔

”مجھے سوا براہیم کی ذہنت کا پتا بہت دیر سے چلا، میں کراچی گیا ہوا تھا، آج ہی آیا ہوں، فرشتے نے جیسے ہی بتایا میں آگیا، آئی ایم ویری سوری محل! واپس صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ بہت تاسف سے کہہ رہا تھا۔

محل نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر آرزو کو دیکھا۔

”آرزو باجی! آپ جاسکتی ہیں، اب میں آگئی ہوں۔“

”ہاں شیور۔“ آرزو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مگر جاتے ہوئے ان کو شادی کا کارڈ دے دینا۔“ استہزائیہ مسکرا کر وہ گویا جتا گئی تھی۔ محل کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔

”کس کی شادی؟“ وہ چونکا تھا۔

”محل کی شادی، وسیم کے ساتھ، آپ کو نہیں پتا اے ایس بی صاحب؟ اسی فرائیڈے ان کا نکاح ہے، آپ ضرور آئیے گا، میں آپ کا کارڈ نکلاؤ دیتی ہوں، ٹھہریے! وہ خوش دلی سے کہتی باہر نکل گئی۔



کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔  
”یہ کیا کہہ رہی تھی؟“ وہ بولا تو اس کی آواز میں  
حیرت تھی بے پناہ حیرت۔  
”ٹھیک کہہ رہی تھی۔“ وہ سر جھکائے ناخن کھرچتی  
رہی۔

”مگر کیوں محمل؟“  
”آپ غالباً تعزیت کے لیے آئے تھے۔“  
”پہلے میری بات کا جواب دو، تم ایسا کیسے کر سکتی  
ہو؟“

”میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“ اس  
نے تملاکر سر اٹھایا۔ ”یہ میری ماں کی آخری خواہش  
تھی، میرے وقت انہوں نے یہ ہی وصیت کی تھی۔“  
”تمہیں کیسے پتا؟ تم تو ان کی دہشتہ کے وقت مدد  
میں تھیں۔“

”ہاں، مگر انہوں نے آغا جان سے کہا تھا سب لوگ  
وہاں موجود تھے سب گواہ ہیں۔“  
”تم!“ وہ مٹھیاں بھیج کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں  
چل رہا تھا، وہ کیا کر ڈالے۔ ”تم انتہائی بے وقوف اور  
احقر ہو۔“

”میں اپنی ماں کی بات کا مان رکھنا چاہتی ہوں، اس  
میں کیا حماقت ہے؟“ وہ چڑ گئی۔  
”نوادان لڑکی! تمہیں یہ لوگ بے وقوف بنا رہے  
ہیں، استحصال کر رہے ہیں۔“

”کرنے دیں، آپ کو کیا ہے؟“ وہ پیرخ کر کھڑی  
ہوئی۔ ”آپ میرے کون ہیں جو مجھ سے پوچھ گچھ  
کر رہے ہیں۔“

”میں جو بھی ہوں مگر تمہارا دشمن نہیں ہوں۔“ وہ  
بھی ساتھ ہی کھڑا ہوا، اس کی آواز میں بے بسی تھی۔  
کبھی یہ ہی بات اس نے بہت اکھڑ لہجے میں بھی کہی  
تھی۔ جب وہ مدد کے باہر اسے لینے آیا تھا، اس رات  
کی صبح جو اس کی زندگی اجاڑ گئی تھی۔

”اگر آپ کے دل میں میری ماں کا ذرا سا بھی احترام  
ہے تو مجھے وہ کرنے دیں جو میری ماں چاہتی تھی۔ ماں،  
باپ کبھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ اسی میں کوئی

بہتری ہوگی آپ جاسکتے ہیں۔“ وہ ایک طرف ہٹ کر  
کھڑی ہو گئی۔  
اسی بل پردے ہٹا کر آرزو نمودار ہوئی۔  
”آپ کا کارڈ آئیے گا ضرور۔“ اس نے مسکرا کر  
کارڈ ہمایوں کی طرف بڑھایا۔ ہمایوں نے ایک قبر آلود  
نظر کارڈ پر ڈالی اور دوسری محمل پہ پھر لمبے ڈگ بھرتا باہر  
نکل گیا۔  
”تو پراہلم۔“ آرزو شانے اچکا کر کارڈ لیے واپس مڑ  
گئی۔

”ماں!“ وہ کراہ کر صوفے پر گر سی گئی۔ یہ ماں  
اسے کس منجھدار میں چھوڑ کر چلی گئی تھیں؟ کیوں کیا  
انہوں نے یہ فیصلہ؟ کیوں ماں؟ وہ دونوں ہاتھوں میں  
سر گرائے سوچتی رہ گئی۔

سارے گھر میں دبا دبا سا شادی کا شور اٹھ چکا تھا،  
گوکہ ابھی صرف نکاح تھا، مگر متلب تائی بھر پور  
تیاریاں کر رہی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی  
کہ فواد جلد ہی واپس آ رہا تھا۔ اس خبر سے محمل نے تو  
کوئی اثر نہ ہوا، البتہ تائی ماں اپنی اندرونی خوشی  
چھپائے سب کچھ محمل پہ ڈال گئی تھیں۔

”سوچ رہے ہیں تھوڑا سا کھانا کھانی والا فنکشن رکھ  
لیں، تاکہ محمل کا دل بہل جائے، ورنہ سچ پوچھو تو  
مسرت کے جانے کے بعد سے وہ بہت بچھڑی گئی ہے۔  
اب ہمارا دل تو نہیں چاہتا کہ شور ہنگامہ ہو، مگر بس محمل  
اچھا محسوس کرے اس لیے۔“

وہ کسی نہ کسی کو ہر وقت فون پہ وضاحتیں دے رہی  
ہوتی تھیں۔

محمل چپ چاپ کچن میں کام نہایتی رہتی، جیسے وہ  
خاموش ماتم کر رہی تھی، نمازیں، تسبیحات دعا میں،  
وہ سب کر رہی تھی، ہاں مدد وہ ابھی نہیں جاری تھی۔  
مسجد جا کر سکون ملتا تھا اور فی الحال وہ سکون نہیں چاہتی  
تھی۔ وہ صرف اور صرف ماتم چاہتی تھی۔ مسرت کا یا  
شاید اپنا وہ نہیں جانتی تھی۔

فون کی گھنٹی بجی تو وہ جو رومال سے میز صاف کر رہی  
تھی، آہستہ سے رومال چھوڑ کر اٹھی۔  
اسٹینڈ پر رکھا فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ وہ چھوٹے  
چھوٹے قدم اٹھاتی قریب آئی اور ریسیور اٹھایا۔  
”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام، محمل؟“ نسوانی آواز ریسیور میں  
گوئی، وہ لمحے بھر میں ہی پہچان گئی۔  
”فرشتے؟ کیسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ ہمایوں نے مجھے بتایا ہے کہ  
تم۔“ فرشتے قدرے پریشانی سے کہہ رہی تھیں کہ  
اس نے تیزی سے بات کالی۔

”ہمایوں ہر بات آپ کو کیوں جا کر بتاتے ہیں؟ ان  
سے کہیں ایسا مت کیا کریں۔“  
”مگر محمل۔ تم اس طرح کیسے؟“

”آپ لوگ مجھے احقر کیوں سمجھتے ہیں؟ کیوں  
میرے لیے پریشان ہو رہے ہیں؟ میری ماں میرے  
لئے کچھ غلط نہیں سوچ سکتی، پتیز مجھے میری زندگی کے  
فیصلے خود کرنے دیں۔“

”محمل! اب میں تمہیں کیا کہوں! اچھا ٹھیک ہے جو  
کرنا، سوچ سمجھ کے کرنا، اوکے، چلو اب ہمایوں سے  
بات کرو۔“

”ارے نہیں۔“ وہ روکتی رہ گئی، مگر فرشتے نے فون  
اسے پکڑا دیا تھا۔

”اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے اور تمہارے وہ فیڑی  
ٹیل سسرال والے اجازت دیں تو کیا میں اور فرشتے  
تمہاری شادی کے فنکشن میں آسکتے ہیں؟“

”اونہوں ہمایوں!“ پیچھے سے فرشتے کی تینبہی  
آواز ابھری۔

”کیوں محمل! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ وہ  
طنزیہ بولا تھا۔

”ہاں شیور کیوں نہیں۔ جمعہ کو رات آٹھ بجے  
فنکشن ہے۔ ضرور آئیے گا اللہ حافظ۔“

اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ غصہ اتنا ابل رہا  
تھا کہ فرشتے سے بھی بات کرنے کو جی نہیں چاہا تھا۔

فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی، نگہ سرجھٹک کر میز  
کی طرف بڑھ گئی جہاں جھاڑ پونچھ کارومال اس کا انتظار  
کر رہا تھا۔

\*\*\*

یوٹیشن نے کام داروپنہ اس کے سر پہ رکھا، اور پھر  
اسے ایک ہاتھ سے پکڑے، وہ جھٹک کر ڈورنگ نیبل  
سے بنیں اٹھانے لگی۔ محمل بت بنی اسٹول پہ بیٹھی  
سامنے آئینے میں خود کو دیکھ رہی تھی، یوٹیشن اس کے  
پیچھے کھڑی اس کا دوشہ سیٹ کر رہی تھی۔

وہ کام دار شلوار قمیص گہرے سرخ رنگ کی تھی جس پہ  
سلور سلٹی ستارے کا کام تھا۔ دوشے کے بارڈر پہ بھی  
چوڑی پی کی صورت میں سلور کام کیا گیا تھا۔ ساتھ میں  
نازک سا وائٹ گولڈ اور رونی کا نیکل سی تھا اور ایک  
خوب صورت قیمتی سائیکہ جس میں بڑا سا سرخ رونی  
جڑا تھا، اس کے ماتھے پہ سجا تھا۔ جانے تائی نے کب یہ  
سب بنوایا تھا، وہ بھی چپ چاپ ہر چیز پہنٹی گئی۔

گھر میں ہونے والے ہنگاموں سے کہیں نہیں لگتا  
تھا کہ مسرت کو مرے ابھی بیس دن بھی نہیں ہوئے۔  
نگہ وہ شگہ کس سے کرتی؟ مسرت کی زندگی میں بھی ان  
کی اتنی اہمیت کہاں تھی کہ مرنے کے بعد کوئی انہیں  
یاد رکھتا؟ اور سنا تھا، آج تو فواد بھی آگیا تھا، پھر کاہے کا  
ماتم؟

وہ اپنے  
کمرے کے بجائے تائی کے کمرے میں تھی، تاکہ وہ  
ٹھیک سے تیار ہو جائے۔ اسے تیار کرنے کے لیے تائی  
نے وہ ماہر یوٹیشن لڑکی بلوائی تھی جو کافی دیر سے اس پہ  
لگی ہوئی تھی۔

دفعتا، باہر لاؤنج سے چند آوازیں گونجیں۔ وہ ذرا  
سی چوکی، کیا فواد آگیا تھا؟ مگر نہیں، یہ آواز تو۔

”سنو، یہ دروازہ تھوڑا سا کھول دو۔“ بے چینی سے  
اس نے یوٹیشن سے کہا، تو وہ سر ہلاتی آگے بڑھی اور  
لاؤنج میں ٹھہرنے والا دروازہ آدھا کھول دیا۔

سامنے لاؤنج کا منظر آدھا نظر آ رہا تھا اور اس کا شک



درست تھا۔

”تم۔ تم اُدھر کیوں آئی ہو؟“ تائی متاب کی تلملاتی بلند آواز اندر تک سنائی دے رہی تھی۔

”فکر مت کریں میں رنگ میں بھنگ ڈالنے نہیں آئی، محمل کی شادی ہے، میرا آنا فرض بننا تھا۔“ وہ اطمینان سے کہتی سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے وہ محمل کو صاف نظر آرہی تھی۔

سیاہ عیالیا کے اوپر سیاہ حجاب کے تنگ ہالے کو چہرے کے گرد لپیٹے وہ اب بے نیازی سے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

محمل نے لمحے بھر کو محسوس کرنا چاہا کہ اسے فرشتے کے آنے سے خوشی ہوئی ہے، مگر اسے اپنے محسوسات بہت جلد لگے تھے برف کی طرح ٹھنڈے۔ اندر باہر خاموشی ہی خاموشی تھی۔ فرشتے آئے یا فواد اب اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

”مگر ہم تمہارا اس گھر سے کوئی رشتہ تسلیم نہیں کرتے۔“

”نہ کریں، مجھے پروا نہیں ہے۔“ وہ اب ہاتھ میں پکڑے موبائل کے سکرین پر اپنی طرف یوں متوجہ تھی جیسے سامنے غصے سے بل کھاتی تائی متاب کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ فرشتے کے پاس موبائل نہیں تھا وہ شاید ہمایوں کا موبائل لے کر آئی تھی۔

”دیکھو لڑکی! تمہارا محمل سے کوئی تعلق نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم چلی جاؤ اس سے پہلے کہ میں گارڈ کو بلواؤں۔“

”پھر آپ گارڈ کو بلوالیں، کیونکہ میں تو ایسے جانے والی نہیں ہوں، سوری۔“

”تم کیسے نہیں جاؤ گی، تمہارا تعلق۔“

”مسز کریم! میں موبائل پہ بڑی ہوں، آپ دیکھ رہی ہیں، مجھے ڈسٹرب مت کریں، اور پلیز محمل کو بلا دیں۔“

وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی موبائل پہ چہرہ جھکائے ہوئے مصروف تھی، محمل کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ چھو گئی۔ فرشتے بد تمیز یا بد لحاظ نہ تھی، بلکہ وہ

اپنے انڈی ٹھنڈے اور باوقار انداز میں تائی کو بہت آرام سے جواب دے رہی تھی۔ البتہ محمل بد تمیزی کر جاتی تھی، اسے لگتا تھا وہ کبھی بھی فرشتے کی طرح پراعتماد اور باوقار نہیں بن سکے گی۔

”محمل تم سے نہیں ملے گی تم جاسکتی ہو۔“

آغا جان کی آواز پہ موبائل پر مصروف فرشتے نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ کلف لگے شلوار قمیص میں بلبوس کرپہ ہاتھ باندھے وہ غیض و غضب کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

”السلام علیکم کریم چچا!“ وہ موبائل رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چہرے پہ انڈی اعتماد اور سکون تھا۔

”فرشتے! تم یہاں سے جاسکتی ہو۔“

”آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟“ وہ ذرا سا مسکرائی۔

”آپ کو لگتا ہے کریم چچا کہ آپ مجھے نکال سکتے ہیں؟“

”میں نے کہا، یہاں سے جاؤ۔“ وہ ایک دم غصے سے دھاڑے تھے۔

”میں بھی اتنا ہی اونچا جیج سکتی ہوں، مگر میں ایسا نہیں کر سکتی گی، میں یہاں یہ کرنے نہیں آئی، میں صرف محمل سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ سینے پہ ہاتھ باندھے راعتمادی ان کے سامنے کھڑی تھی۔

لاؤنج میں سب اکٹھے ہونے لگے تھے۔ لڑکیاں ایک طرف کھڑی لاعلم سی اشاروں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں، اسد چچا، غفران چچا، فتنہ چچی اور ناعملہ چچی بھی وہیں آگئی تھیں، حسن بھی شور سن کر سیڑھیوں سے اتر آیا تھا۔ لاؤنج کے بیچوں بیچ آغا جان کے سامنے کھڑی وہ دراز قد سیاہ عیالیا والی لڑکی کون تھی؟ بہت سی آنکھوں میں سوال تھا۔

”تمہارا محمل سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تم سے نہیں ملے گی، سنا تم نے؟“

”آپ یہ ای بات محمل کو بلوا کر پوچھ لیں نا کریم چچا! کہ وہ مجھ سے ملے گی یا نہیں۔“

”ہم تمہیں نہیں جاننے کہ تم کون ہو، کہاں سے اٹھ کر آئی ہو۔ تم فوراً نکل جاؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“

”آغا جان! یہ کون ہیں؟“ حسن الجھا ہوا آگے بڑھا۔

”تم بیچ میں مت بولو۔“ انہوں نے پلٹ کر اتنی بری طرح سے جھڑکا کہ حسن خائف سا ہو گیا۔

”ہٹو۔“ بیوٹیشن کا ہاتھ ہٹا کر وہ انھی اور کلیدار دپٹہ سنبھالتی ننگے پاؤں باہر کو لپکی۔

”آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں؟“ لاؤنج کے سرے پہ وہ رک کر بولی تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ فرشتہ ذرا سا مسکرائی۔

”کریم چچا کہہ رہے تھے کہ تم مجھ سے نہیں ملو گی؟“

”محمل! تم اندر جاؤ۔“ تائی متاب پریشانی سے آگے بڑھیں۔

”آغا جان! تائی اماں! فرشتے کو میں نے خود شادی میں انوائٹ کیا ہے، آپ گھر آئے مہمان کو کیسے نکال سکتے ہیں؟“

”تم نے؟“ تائی متاب بھونچکی رہ گئیں۔ ”تم جانتی ہو اسے؟“

”ہاں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔“

”اور یہ کیسے نہیں جانتی ہوں گی، ان کے اس عاشق کی عزیزہ ہیں نا یہ۔“

کوئی تمسخرانہ انداز میں کہتا سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ محمل نے چونک کر گردن اٹھائی۔ وہ فواد تھا۔ ہشاش بشاش، چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ لیے، وہ ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”یہ کون ہیں؟“ فرشتے نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھ کر محمل کو مخاطب کیا۔

”یہ اس ملک میں قانون کی بے بسی کا منہ بولتا ثبوت ہیں، جن کو قانون زیادہ دیر تک حراست میں نہیں رکھ سکتا۔“

ایک جتنا ہی نظر فواد پہ ڈال کر اس نے چہرہ موڑ لیا تھا۔ ”آپ اندر آجائیں فرشتے! بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔“ تائی تیزی سے آگے بڑھیں۔

”محمل! یہ لڑکی فراڈ ہے، یہ صرف ابراہیم کی جائیداد کے پیچھے ہے۔“

”وہ تو آپ بھی ہیں متاب آئی! اور شاید اسی لیے آپ محمل کو ہونٹا رہی ہیں؟“

اس نے فرشتے کو کسی سے اتنی دور شتی سے بات کرتے آج پہلی بار دیکھا تھا، مگر اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔

”یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے، تم بیچ میں مت بولو۔“

”میں بیچ میں بولوں گی، محمل کے لیے میں ضرور بولوں گی۔“ وہ پلٹی اور محمل کو دونوں کندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کیا۔

”محمل! مجھے بتاؤ، ان لوگوں نے تمہارے ساتھ زبردستی کی ہے؟ یہ تمہیں کیوں مجبور کر رہے ہیں اس شادی پہ۔“

”مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے، میں اس پہ خوش ہوں۔“

فرشتے ایک دم چپ سی رہ گئی۔ اس کے شانوں پہ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

”حسن لیا تم نے؟ اب جاؤ۔“ آغا جان نے استہزائیہ سر جھٹکا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا، مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہ تھی۔

”محمل، تم نے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے کر لیا؟“ وہ دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”جب کسی کو اپنا مخلص دوست کہا جاتا ہے اور اپنے دوست کی محبت اور خلوص کے دعوے کئے جاتے ہیں تو اتنے بڑے فیصلوں سے قبل اسے مطلع بھی کیا جاتا ہے۔“

”میں آپ کو بتانے ہی۔“

”میں اپنی بات نہیں کر رہی۔“

”پھر؟ کون؟“ وہ چونکی۔ ”کیا ہمایوں؟“ اس کا نام اس نے بہت آہستہ سے لیا تھا۔

”میں۔“ وہ مزید اس کے قریب آئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے دھیرے سے بولی۔ ”میں اس مصحف کی بات کر رہی ہوں جس کے اتارنے والے سے تم نے سمعنا و اطعنا (ہم نے سنا اور ہم نے



اطاعت کی) کا وعدہ کیا تھا۔ کیا تم نے اسے بتایا؟  
”فرشتے!“ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔  
”اللہ کو سب پتا ہے، میں کیا بتاؤں؟“

”کیا تمہیں دن میں پانچ بار اسے اپنی اطاعت کا بتانا نہیں پڑتا؟ پھر اپنے فیصلوں میں تم اسے کیسے بھول سکتی ہو؟“

محمل ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرشتے کیا کہہ رہی ہے کیا سمجھنا چاہ رہی ہے۔

”مگر میں نے نماز، تسبیح، کچھ نہیں چھوڑا، میں ساری نمازیں پڑھتی ہوں۔“ وہ دونوں بہت مدہم سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔

”لیکن کیا تم نے اس کی سنی؟ اس نے کچھ تو کہا ہو گا تمہارے فیصلے پر۔“ فرشتے نے ابھی تک اسے کندھوں سے تھام رکھا تھا اور وہ یک ٹک اسے تکیے جاری تھی۔

”محمل! تم اس کی بات سنیں تو سہی، اس سے پوچھیں تو سہی! تم قرآن کھولو اور سورہ مائدہ کا ترجمہ دیکھو۔“ اس کی آواز میں تاسف کھل گیا۔ محمل نے ایک جھپکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے، اسے لگا اس سے غلطی ہو گئی ہے۔

”میں ابھی آتی ہوں، آپ جائیے گا نہیں۔“ وہ کام دار دوڑے کا پلو انگلیوں سے تھامے ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی کمرے کی طرف گئی۔

”محترمہ! آپ جاسکتی ہیں۔“ فواد نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ میرے باپ کا گھر ہے، اس میں ٹھہرنے کے لیے مجھے آپ کی اجازت نہیں چاہیے۔“ وہ رکھائی سے کہتی صوفے پہ بیٹھی اور پھر سے موبائل اٹھالیا۔

فواد اور آغا جان نے ایک دوسرے کو دیکھا، نگاہوں میں اشاروں کا تبادلہ کیا اور پھر آغا جان بھی گہری سانس لیتے ہوئے صوفے پہ بیٹھ گئے۔ تقریب کے شروع ہونے میں دو ڈھائی گھنٹے رہتے تھے۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔

محمل دوڑتے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ دروازے کی چٹنی چڑھا کر وہ شیفت کی طرف لپکی۔

سب سے اوپر والے خانے میں اس کا سفید جلد والا مصحف رکھا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اوپر رکھا، مصحف اٹھایا اور آہستہ سے اسے دونوں ہاتھوں میں تھامے اپنے چہرے کے سامنے لائی، اسے سب یاد رہا تھا، صرف یہ بھول گیا تھا کیوں؟

وہ اسے مضبوطی سے پکڑے بیڈ پہ آ بیٹھی اور کور کھولا۔

وہ سورہ مائدہ کی 106 آیت تھی۔  
”اے ایمان والو! جب تم کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو۔“

چند الفاظ پڑھ کر ہی اس کا دل بری طرح سے دھڑکا۔ اس نے زور سے پلکیں جھپکیں، کیا وہ سب کچھ واقعی ادھر لکھا تھا؟ وصیت۔ موت کا وقت، وصیت۔

”مسرت نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔۔۔“  
”تمہارا رشتہ و سیم۔۔۔“ بہت سی آوازیں ذہن میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے پڑھنے لگی۔

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمہاری جماعت میں دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر لوگوں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں پھر اگر (ان کی بتائی ہوئی وصیت میں) کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ قسم کھا کر کہیں کہ ہم کسی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔“

وہ ساکت سی ان الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ قرآن کو تھامے دونوں ہاتھ بے جان سے ہو گئے تھے کیا وہ سب واقعی یہاں لکھا تھا؟ مگر کیسے؟ وصیت۔ دو افراد کی قسم کھا کر گواہی۔ رشتہ دار یہ سب تو۔۔۔ یہ سب تو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

وہ پلک تک نہ جھپک پارہی تھی۔ اس کا دل جیسے رعب سے بھر گیا تھا۔ رعب سے اور خوف سے۔ ایک ایک اسے لگا اس کے ہاتھ کپکپا رہے ہیں، اسے ٹھنڈے سینے آرہے ہیں، وہ بہت بھاری کتاب تھی، بہت بھاری، بہت وزنی، وہ جس کا بوجھ پہاڑ بھی نہ اٹھا سکتے ہوں، وہ کیسے اٹھا سکتی تھی؟ اسے لگا اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔ وہ اب مزید یہ بوجھ نہیں اٹھا پائے گی۔ وہ عام کتاب نہیں تھی، اللہ کی کتاب تھی۔ اسے اللہ نے اس کے لیے، خاص اس کے لیے اتارا تھا۔ ہر لفظ ایک پیغام تھا۔ ہر سطر ایک اشارہ تھی۔

اس نے اتنی زندگی ضائع کر دی۔ اس نے یہ پیغام کبھی دیکھا ہی نہیں۔

”محمل! تم نے اتنی عمر بے کار گزار دی۔ یہ کتاب غلاف میں لپیٹ کر بہت اوپر سجانے کے لیے تو نہ تھی یہ تو پڑھنے کے لیے تھی۔“

ہر دفعہ کی طرح آج پھر اس کتاب نے اسے بہت حیران کیا تھا۔ سوچنا سمجھنا تو دور کی بات تو متحیر سی ان الفاظ کو تکیے جاری تھی یہ سب کیا تھا؟ کیسے اس کتاب کو سب بتا ہوتا تھا؟

”کیونکہ یہ اللہ کی کتاب ہے، نادان لڑکی! یہ اللہ کی بات ہے، اس کا پیغام ہے، خاص تمہارے لیے، تم لوگ نہ سننا چاہو تو یہ الگ بات ہے۔“ کسی نے اس کے دل سے کہا تھا۔

”وہ کون تھا؟ وہ نہ جانتی تھی۔“

دروازے کھلنے کی آواز پہ سب نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ آہستہ سے چلی آ رہی تھی۔ کام دار دوپٹے کا کنارہ ٹھوڑی کے قریب سے اس نے دو انگلیوں میں لے رکھا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت

قدرے سفید پڑی ہوئی تھی یا شاید یہ کچھ اور تھا جو انہیں چونکا گیا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”آغا جان!“ اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ اس کے اجنبی لہجے پہ چونک سے گئے۔  
”ہاں بولو۔“

”نیری ماں کی وصیت کے وقت موجود لوگوں میں سے کون سے دو لوگ عصر کی نماز کے بعد اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر گواہی دیں گے کہ انہوں نے یہ وصیت کی تھی یا نہیں؟“

بل بھر کولاؤنچ میں سکوت سا چھا گیا، فرشتے نے مسکراہٹ و باکر سر نیچے کر لیا۔

آغا جان حیران سے کھڑے ہوئے۔  
”کیا مطلب؟“

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے  
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم

قیمت 250 روپے مریح عزیز

نگھے پاؤں

قیمت 250 روپے نگہت سیما

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی



”آپ کو پتا ہے سورہ مائدہ میں کھانا نماز کے بعد آپ میں سے دو لوگوں کو اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر گواہی دینی پڑے گی۔“

”کیا بکواس ہے؟“ وہ حسب توقع بھڑک اٹھے۔  
”تمہیں ہماری بات کا اعتبار نہیں ہے؟“

”تم!“ وہ غصہ ضبط کرتے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔  
تب ہی نگاہ فرشتے پہ پڑی تو اس نے فوراً ”شانے اچکا“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا کرم چچا!“  
”تم سے تو میں بعد میں۔“

”آپ لوگ گواہی دیں گے یا نہیں؟“ وہ ان کی بات کاٹ کر زور سے بولی تھی پھر چہرے کا رخ صوفوں پہ بیٹھے نفوس کی طرف موڑا۔ ”کون کون تھا اس وقت آپ میں سے اوھر؟ کون دے گا گواہی؟ کون اٹھائے گا قسم کو لیے جواب دیجیے۔“

سب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔  
اسے اس کے سارے جواب مل گئے تھے۔ کاش وہ پہلے اس آیت کو پڑھ لیتی تو اتنا غلط فیصلہ نہ کرتی۔ صحیح گناہ ہے اللہ تعالیٰ ہماری بہت سی مہمیتیں ہمارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہیں۔

”تو آپ لوگوں نے مجھ سے جھوٹ بولا، بہت بہتر۔ مجھے اب کوئی شادی نہیں کرنی۔“ اس نے ماتھے پہ جھولتا ٹیکا نوچ کر سامنے پھینکا۔ نازک سائیکہ ایک آواز کے ساتھ میز کے شیشے پہ گرا۔

”اب میرا فیصلہ بھی سن لو۔“ آغا جان نے ایک گہری سانس لی۔ ”مگر پہلے تم لڑکی!“ انہوں نے حقارت سے فرشتے کو اشارہ کیا۔ ”تم مجھے یہاں سے چلاتی نظر آؤ۔“

”میرے باپ کا گھر ہے میں تو کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے فواد۔“ انہوں نے فواد کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھا اور صوفے پہ بیٹھی فرشتے کو ایک دم

بازو سے کھینچا۔

”چھوڑو مجھے۔“ وہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھی بے اختیار چلا کر خود کو چھڑانے لگی مگر وہ اسے بازو سے کھینچ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے جانے لگا۔ اسی پل آغا جان محمل کی طرف بڑھے۔

”تو تم یہ شادی نہیں کرو گی؟“

”ہاں ہرگز نہیں کروں گی۔ میری بہن کو چھوڑو۔“ وہ غصے سے فواد پہ جھپٹنا ہی چاہتی تھی جو فرشتے کو زبردستی باہر لے کر جا رہا تھا مگر اس سے پہلے ہی آغا جان نے اس کو بالوں سے پکڑ کر واپس کھینچا۔

”تو تم شادی نہیں کرو گی؟“ انہوں نے اس کے چہرے پر پھینکا مارا۔ وہ چل کر گر گئی۔

”تمہیں لگتا ہے ہم لاگوں کی طرح تمہاری منتیں کریں گے؟ تمہارے آگے ہاتھ جوڑیں گے؟ نہیں بی بی شادی تو تمہیں کرنی پڑے گی ابھی اور اسی وقت اسد انکاح خواں کو ابھی بلواؤ۔ میں بھی دیکھتا ہوں یہ کیسے شادی نہیں کرتی۔“

”میں نہیں کروں گی سنا آپ نے۔“ وہ روتے ہوئے بولی وہ مسلسل اسے پھپھروں اور مکوں سے مار رہے تھے۔

”میری بہن کو چھوڑو۔“ خود کو چھڑاتی فرشتے محمل کو پٹنے دیکھ کر لمحے بھر کو تو سکتہ میں رہ گئی تھی اور پھر دوسرے ہی پل اس نے زور سے فواد کو دھکا دینا چاہا مگر وہ مرد تھا وہ اس کو دھکیل نہ سکتی تھی وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے دروازے سے باہر نکال رہا تھا۔

”فواد! اسے چھوڑو۔“ یکدم حسن نے پوری قوت سے فواد کو پیچھے دھکیلا تھا۔ فواد اس حملے کے لیے تیار نہ تھا ایک دم بوکھلا کر وہ پیچھے کو ہٹا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور فرشتے بازو چھڑاتی محمل کی طرف بھاگی جسے آغا جان ابھی تک مار رہے تھے۔ فواد نے غصے سے حسن کو دیکھا مگر اس سے پہلے کہ اسے کچھ سخت کہتا

”میری بہن کو چھوڑو“ نہیں۔ وہ چیختی ہوئی آغا

جان کا ہاتھ روکنے لگی مگر انہوں نے ساتھ ہی ایک زور دار طمانچہ اس کے چہرے پہ مارا۔ فرشتے تیار کر ایک طرف کو گری۔ منہ میز کے کونے سے لگا۔ ہونٹ کا کنارہ پھٹ گیا۔ لمحے بھر کو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تھا آگے ہی منٹ وہ خود کو سنبھال کر تیزی سے اٹھی۔

محمل اپنے بازو چہرے پہ رکھے روتی ہوئی اپنا کمزور سا دفاع کر رہی تھی۔ اب کی بار فرشتے نے آغا جان کا ہاتھ نہیں روکا بلکہ محمل کو پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ محمل گھڑی بنی چند قدم پیچھے کھینچتی گئی۔ اس کا دوشہ سر سے اتر کر پیچھے ڈھلک گیا تھا بالوں کی لٹیں جوڑے سے نکل کر چہرے پہ بکھر گئیں۔

اس سے پہلے کہ آغا جان اپنے اور محمل کے درمیان چند قدم کا فاصلہ عبور کر پاتے فرشتے ان کے پیچ آکھڑی ہوئی۔

”ہاتھ مت لگائیے میری بہن کو۔“ اپنے پیچھے گھڑی بنی محمل کے سامنے اپنے دونوں بازو پھیلائے وہ چیخ پڑی تھی۔ ”آپ لوگ اس حد تک گر جائیں گے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیا بگاڑا ہے اس نے آپ کا؟“

”سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ تم آج میرے ہاتھوں ختم ہو جاؤ گی!“ وہ غصے سے ایک قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ فواد نے ان کا بازو تھام لیا۔

”آرام سے آغا جان! آپ کالی پی شوٹ کر جائے گا۔“ ان کو سہارا دے کر وہ نرمی سے بولا تھا۔ محمل ابھی تک گھٹنوں پہ سر رکھے رو رہی تھی جبکہ فرشتے اس کے آگے اپنے بازو پھیلائے راستہ روکے کھڑی تھی۔ فواد چاہتا تو اس کو پھر پکڑ لیتا مگر جانے کیوں وہ آغا جان کو سہارا دیے وہیں کھڑا رہا۔ اس کی طرف نہیں بڑھا۔

”میں اب محمل کو ادھر نہیں رہنے دوں گی۔ اٹھو محمل! اپنا سامان پیک کرو اب تم میرے ساتھ رہو گی۔ چلو۔“ اس نے محمل کو اٹھانا چاہا مگر وہ ایسے ہی گری

روتی جا رہی تھی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے“ آپ اسے اپنے ساتھ لے گئیں تو ہم خاندان والوں کو کہیں گے کہ محمل کی نام نہاد بہن اسے لے گئی اور بس؟ محمل کو بازو سے پکڑ کر اٹھائے اسی کھانا ایک ٹبلے کو ہم نے اس نے قدرے اچھ کر سر اٹھایا اور فواد کو دیکھا۔ چہرے پہ چھایا غصہ آہستہ سے الجھن میں ڈھلا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ محمل تو لڑکی ہے نا جو ایک رات پہلے بھی گھر سے باہر رہ چکی ہے؟ تو اس کے لیے اگر خاندان والوں کو یہ بتایا جائے کہ یہ نکاح سے پہلے کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے تو وہ ذرا“ یقین کر لیں گے نا؟“ اس کے چہرے پہ شاطرانہ مسکراہٹ تھی۔

”نہیں۔“ محمل نے تڑپ کر آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اور اٹھایا۔

”تمہارے نہیں کہنے سے یہ بدنامی مل تو نہیں جائے گی ڈیر کزن! تم اپنی بہن کے ساتھ گئیں تو ہم تمہیں پورے خاندان میں بدنام کر دیں گے۔ اور پھر یہ تمہیں کتنا عرصہ سنبھالے گی؟ اس کے بعد تم کہاں جاؤ گی؟“

محمل پھٹی پھٹی نگاہوں سے فواد کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ خود فرشتے بھی سن رہے گی۔

”اگر تم نے اس گھر سے قدم بھی نکالا تو تم بدنام ہو جاؤ گی۔ پورا خاندان تمہو کے گاتم پر کہ ماں کے مرتے ہی کھلی چھوٹ۔“

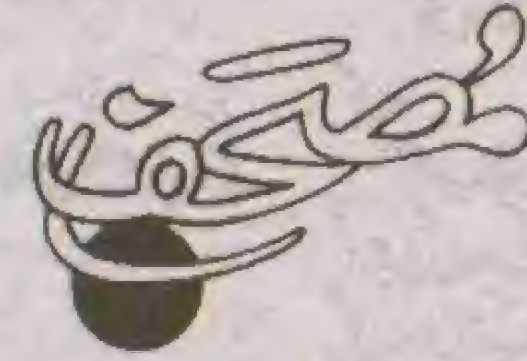
”نہیں، نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ خوف زدہ سی کھٹی کھٹی آواز میں بمشکل بول پائی۔

”یعنی تم و سیم سے شادی کرنے پہ تیار ہو۔ ویری گڈ کزن!“

وہ اسی عیاری سے مسکرایا۔ ”اسد چچا یقیناً نکاح خواں کو لاتے ہی ہوں گے۔ و سیم کدھر ہے؟ کوئی اسے بھی بلائے۔“

بانی زینہ شناسی میں





محمل ابراہیم، آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تیا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً "تائی متاب" کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور متاب تائی، فواد، حنان و نسیم، سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضہ چچی کے تین بچے حسن، ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمد بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو، معیز اور معاویہ ہیں جبکہ رضیہ، پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں مائی متاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو، فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی متاب کے خاندان کی اس دکھتی رگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو، سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حد ہے۔

کلج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک راسر سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی، حال، مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل، آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکا لرشپ مل

Scan & PDF  
FIAZ AHMED  
Friends Korner.com



جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایرونا نیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ مائی متاب فوراً انکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آنر شپ دے دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محل اس پر سرار لڑکی سے ساہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی مائی متاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ مائی متاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملائی ہیں۔ محل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت ست بھی سناتی ہے۔ اس رد عمل پر وہ لڑکی بچھڑی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میسرٹ میں ڈنر کا جھانسدے کر فواد، محل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈراما رچا کر محل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اسے ایس بی کے سامنے محل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محل چکر آکر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، محل کی آغا فواد سے بات کر دیتا ہے تو وہ اسے رات اسی کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ محل اس دھوکہ دہی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کو بھی گھر کے برابر میں سدرہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ محل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آغا کریم اور تمام بچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکے سے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے بھٹاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کر دیتی ہے۔ مائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آغا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ مصلحتاً محل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس معاملے میں محل کو بھی قصور وار سمجھتی ہیں۔ محل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدد سے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف محل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھر والوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محل کو بری طرح زد و کوب کرتے ہیں۔ وہ دو روکر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ حسن گھر والوں کے اس سلوک پر ششدر ہے۔ مسرت، محل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محل انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے مصلحتاً جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تیا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسدے دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا۔ وہ ان کا ساتھ دینے کی نذر ہر گز نہیں دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

## پانچویں قسط

”ہرگز نہیں۔“ فرشتے نے غصہ میں تڑپ کر اسے دیکھا۔ ”میں محل کی شادی تمہارے بھائی سے نہیں ہونے دوں گی۔ تم لوگ یہ سب صرف اس کی جائیداد اٹھانے کے لیے کر رہے ہو۔ میں جانتی ہوں تم شادی کے بعد اس سے جائیداد اپنے نام لکھواؤ گے، اس طلاق دلا کر گھر سے نکال دو گے۔“

”ہاں بالکل، ہم یہی کریں گے۔“ وہ بہت سکون سے بولا۔ گو کہ یہ بات فرشتے نے خود کسی بھی گمراہ فواد سے اعتراف کی توقع نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ ششدر رہ گئی۔

”تو تم واقعی۔“

”ہاں۔ ہم اسی لیے تو محل کی شادی وسیم سے کرانا چاہتے ہیں۔“

”فواد! آغا جان نے تنبیہ ہی۔ نظروں سے لے لو گناہاں۔“

”مجھے بات کرنے دیں آغا جان! ہاں تو محل ام اسی لیے تمہاری شادی وسیم سے کر رہے ہیں۔ نہیں منظور ہے نا؟ کیونکہ فرشتے کے ساتھ تو تم جا نہیں سکتیں۔ اب تمہیں شادی تو کرنا ہی ہوگی۔“

”نہیں، نہیں۔“ وہ بے اختیار وحشت سے چلائی۔ ”میں نہیں کروں گی یہ شادی۔“

”محل! تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ تمہیں شادی کرنا پڑے گی۔“ وہ بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا آہستہ آہستہ اسے چاروں طرف سے گھیر رہا تھا۔

”کاش میں تمہیں بددعا دے سکتی آغا فواد! تمہیں مالمین قرآن میں سے ہوں، ایسا نہیں کروں گا کیا تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟“ فرشتے نے تنفر سے اسے دیکھا۔

”میں نے کچھ غلط تھوڑی کہا ہے۔“

”تم غلط کر رہے ہو ایک یتیم لڑکی کے ساتھ۔“

”یہ تو ہم کافی سالوں سے کر رہے ہیں۔ یقین کیجئے ہم پر بھی کوئی طوفان نوح نہیں آیا۔“

”تمہیں اس طوفان کی خبر تب ہوئی جب وہ تمہارے سر پہنچ چکا ہوگا۔ اللہ سے ڈرو۔ تمہیں اس یتیم پر ظلم کر کے کیا ملے گا؟“

”تو آپ اس ظلم کو اپنے حق میں کیوں نہیں بدل لیتیں؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

وہ جواب دیے بنا اس پر ایک نظر اٹا محل کی طرف متوجہ ہوا جو زمین پر پیٹھی سر اٹھائے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔

”ٹھیک صورت میں میں تمہاری شادی وسیم سے روک دوں گا اور چاہو تو تم اپنی بہن کے ساتھ چلی جاؤ۔ ہم خاندان والوں کو کچھ سمجھیں بنائیں گے۔ پھر فرشتے جمل چاہے تمہاری شادی کروادے، ہم کیا پورا خاندان ٹریک ہوگا۔ کیا تم وہ صورت اختیار کرنا چاہو گی؟“

محل کے چہرے پر بے یقینی اتر لی۔ وہ بنا پلک جھپکے فواد کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”سدرہ! میری بیڈ سائیڈ ٹیمپل پر جو کاغذ پڑا ہے، وہ لے کر آؤ اور ساتھ بن بھی۔“ اس نے مہرین اور ندا کے ساتھ دیوار سے لگی خاموش کھڑی سدرہ کو اشارہ کیا جو اس کی بات سن کر سر ہلاتے ہوئے تیزی سے میڑھیوں کی طرف لپکی۔

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ خطرے کا الارم دور کہیں بجا فرشتے کو سنائی دے رہا تھا۔

”کیا کہ محل کی شادی رک سکتی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جا سکتی ہے اگر۔“ اس نے میڑھیوں سے اترتی



سدرہ کو دیکھا جو بھاگتی ہوئی آئی اور اسے کانڈ قلم پکڑا دیا۔

”مگر تم دونوں یہ پیرز سائن کرو۔“

”یہ کیا ہے؟“ فرشتے کا لہجہ حقا تھا۔

”مجھے معلوم تھا کہ آپ نکاح کے وقت ڈرامہ کرنے ضرور آئیں گی اسی لیے ہم نے پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے ہمیں علم نہیں تھا کہ آپ محل سے مل کر اسے کیا پٹیاں بڑھاتی ہیں ہمیں سب پتا تھا محترمہ! یہ بھی کہ محل کب آپ کے کزن سے ملتی رہی ہے مگر اس وقت کے لیے ہم نے آنکھ بند رکھی۔“

”آپ کی کیا شرط ہے وہ بات کریں۔“ وہ سرد لہجے میں بولی۔

”یہ فرشتے ابراہیم اور محل ابراہیم کا اعلان دستبرداری ہے۔ اس گھر فیکٹری اور آغا ابراہیم کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے یہ دونوں ہمیں دستبرداری کا اعلان کرتی ہیں اور ہر چیز ہمارے حوالے کرتی ہیں۔ یہ کبھی بھی ہم سے کسی بھی موروثی ملکیت سے حصہ مانگنے نہیں آئیں گی اور آپ جانتی ہیں کہ بدلے میں ہم و سیم کی شادی محل سے نہیں کریں گے۔ آف کورس! یہ آخری بات اس کانڈ میں نہیں لکھی گئی۔“

فرشتے کے چہرے پر پہلے الجھن ابھری پھر حیرت اور پھر واضح بے یقینی۔

”تم۔۔۔ تم ہمیں ہمارے حق سے ہمارے گھر سے بے دخل کرنا چاہتے ہو؟“

”بالکل صحیح۔“

”تم ایسا کیسے کر سکتے ہو آغا فواد! تم۔۔۔ اس کی بے یقینی اور تحیر غصہ میں بدل گیا۔

”تم ہمیں ہمارے گھر سے بے دخل کیسے کر سکتے ہو؟ یہ ہمارا گھر ہے ہمارے باپ کا گھر ہے اس پر ہمارا حق ہے۔ ہمیں ضرورت ہے پیسوں کی محل کی بڑھائی ہے اور پھر اس کی شادی کے لیے۔۔۔ ہمیں ان سب کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”یہ ہمارا درد سر۔ نہیں ہے۔ تم یہ سائن کرو تو محل کی جان و سیم سے چھوٹ جائے گی۔“

”مگر ہم تمہیں اپنا حق کیوں دیں؟“

”کیونکہ ان سب پر میرے شوہر اور بیٹوں کا حق ہے۔“

تائی مہتاب چمک کر کہتی آگے بڑھیں۔ ”ابراہیم کی وفات کے وقت یہ بزنس دیوالیہ ہو چکا تھا۔ میرا شوہر دن رات محنت نہ کرتا تو یہ بزنس کبھی اسٹیبلشمنٹ نہ ہو سکتا تھا۔“

”مگر اتنے ہی محنت تھے آپ کے شوہر اور بیٹے تو میرے لبا کی ڈتھ کے وقت بے روزگار کیوں پھر رہے تھے؟ اور تم؟“ وہ فواد کی طرف پلٹی۔ ”اور وارث تو اللہ نے بنائے ہیں ہم کیسے اپنا حق نہ لیں۔“

”فرشتے بی بی! یہ برابری تو آپ کو چھوڑنا ہی پڑے گی۔ ابھی کچھ دیر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ شادی والا گھر ہے ذرا سی بات کا ہنگام بن جائے گا اور بدنامی کس کی ہوگی؟ صرف محل کی! اول تو اس کو و سیم سے شادی کرنی ہی پڑے گی لیکن اگر آپ یونہی اڑی رہیں تو ٹھیک ہے ہم خاندان میں کہہ دیں گے کہ محل کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کس کا خاندان چھوٹے گا؟ کس کا میکا بدنامی کے باعث چھوٹے گا؟ آپ خود فیصلہ کر سکتی ہیں۔“

وہ کہتے کہتے ذرا دیر کو رکا۔ وہ تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آغا فواد! تمہیں اللہ سے ڈر نہیں لگتا؟“

وہ ہولے سے مسکرایا۔ ”ہم کوئی غلط بات تھوڑی کر رہے ہیں؟ اپنا حق ہی مانگ رہے ہیں۔ خیر و سرا آپشن یہ ہے کہ آپ اور محل اس پہ دستخط کریں اور اپنے حصے سے دستبردار ہو جائیں۔ ہم باعزت طریقے سے شادی کینسل کر دیں گے آپ محل کو اپنے ساتھ لے جائیے گا“ آپ جس سے چاہیں جب چاہیں اس کا نکاح کرادیں ہم بھرپور شرکت کریں گے، بلکہ پورا خاندان شرکت کرے گا۔ یہ گھر محل کا میکا رہے گا وہ جب چاہے ادھر آسکتی ہے مگر اس کی ملکیت میں

آپ دونوں میں سے کسی کا کوئی حصہ نہیں ہو گا لیجیے! اس نے کانڈ قلم اس کے سامنے کیے۔ ”کر دیجیے سائن۔“

”مگر فواد۔۔۔“ آغا جان نے کچھ کہنا چاہا لیکن تائی مہتاب نے ان کا بازو تھام لیا۔

”اسے بات کرنے دیں وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

”ہو نہ۔“ فرشتے نے سر جھٹکا۔ ”آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کی اس بلیک میلنگ میں آجاؤں گی؟ بلکہ آپ کو تو۔۔۔“

اس کی بات ابھی ادھوری تھی کہ اسے اپنے دائیں ہاتھ پر دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ محل اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو رہی تھی۔

اس کا کام دار دوپٹہ سر سے ڈھلک گیا تھا، بکھری بھوری لٹیں گالوں کو چھو رہی تھیں۔ آنسوؤں نے کاجل دھو ڈالا تھا۔ وہ بہ وقت فرشتے کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اس کے انداز میں کچھ تھا کہ اس کا ہاتھ ٹھکا اور اس سے پہلے کہ فرشتے اس کو روک پائی اس نے جھپٹ کر فواد کے ہاتھ سے کانڈ قلم چھینا۔

”مگر ہر کرنے میں سائن؟ بتاؤ مجھے!“ وہ بدنامی کیفیت میں چلائی تھی۔ فواد ذرا سا مسکرایا اور اپنی انگلی کانڈ پر ایک جگہ رکھی۔

”تمہیں، محل! فرشتے کو جھٹکا لگا تھا۔“ ہمارے پاس کئی راستے ہیں ہمیں ان کی بلیک میلنگ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر مجھے ہے فرشتے! میں اب تنگ آچکی ہوں۔“

”نہیں چاہیے مجھے کوئی جائیداد کوئی مال دولت۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ لے لیں سب لے لیں۔“ وہ دھڑا دھڑ سائن کرتی جا رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے برابر گر رہے تھے۔

فرشتے ساکت سی اسے دیکھ گئی۔ اس نے تمام دستخط کر کے کانڈ اور قلم فواد کی طرف اچھال دیا۔

”لے لو سب کچھ۔ تم لوگوں کو اللہ سے ڈر نہیں لگتا۔ میں اب تم سے اپنا کوئی حق نہیں مانگوں گی۔“

پھوڑتی ہوں میں اپنے سارے حقوق۔“ وہ کہتے کہتے

نڈھال سی صوفے پر گر گئی اور گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ واقعی تھک چکی تھی ٹوٹ چکی تھی۔

فواد نے کانڈ سیدھا کر کے دیکھا، پھر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ارد گرد خاموش اور بے یقین بیٹھے حاضرین پہ ایک نگاہ ڈرائی پھر فرشتے کی طرف پلٹا۔

”محل نے دستخط کر دیے ہیں۔ اب آپ بھی کر دیں۔“

اس نے کانڈ قلم اس کی طرف بڑھایا مگر فرشتے نے اسے نہیں تھاما۔ وہ ابھی تک سکتے کے عالم میں محل کو دیکھ رہی تھی۔

”دستخط کرو بی بی اور اسے لے جاؤ۔“ تائی مہتاب نے آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلایا تو وہ چوکی پھر ناگواری سے ان کا ہاتھ ہٹایا اور فواد کے بڑھے ہاتھ کو دیکھا۔

”نہیں۔ تم محل کو نفسیاتی طور پر گھیر کر بے وقوف بنا سکتے ہو۔ یہ چھوٹی ہے، کم عقل ہے مگر فرشتے ایسی نہیں ہے۔ میں تمہاری بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گی۔ میں ہرگز سائن نہیں کروں گی اور میں کیوں کروں سائن؟ مجھے ضرورت ہے اپنے حصے کی مجھے لپا پکڑی بھی کرنا ہے۔ مجھے باہر جانا ہے میں۔۔۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فواد نے کانڈ قلم میز پر پھینکا اور صوفے پر بیٹھی محل کو گردن سے دو بوج کر اٹھایا اور اپنے سامنے ڈھال کی طرح رکھتے ہوئے جانے کہاں سے پستول نکال کر اس کی گردن پر رکھا۔

”اب بھی نہیں کرو گی تم سائن؟“ وہ غرایا۔

فرشتے سنائے میں آگئی۔

فواد نے بازو کے حلقے میں اس کی گردن دو بوج رکھی تھی۔ وہ شاک کے باعث کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ سخت گرفت کے باعث اس کی آنکھیں اٹل کر باہر آنے لگیں۔ بے اختیار وہ کھانسی۔

”اپنی بہن سے کہو کہ شرافت سے سائن کر دے ورنہ میں واقعی گولی چلا دوں گا اور تم جانتی ہو کہ میں قانون کی بے بسی کا منہ بولتا شیوت ہوں۔“ یہی کہا تھا نا تم نے میرے بارے میں؟“ اس کے کان کے قریب



منہ لے جا کر اس نے بظاہر سرگوشی میں کہا مگر سب کے کانوں تک اس کی سرگوشی پہنچ گئی۔

سب کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ حسن نے آگے بڑھنا چاہا مگر فضلہ نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”کیا کر رہے ہو؟ اگر اس نے گولی چلا دی تو وہ مر جائے گی۔ کیا تم یہی چاہتے ہو؟“ انہوں نے بیٹے کو گھر کا توہ بے بسی سے کھڑا کر دیا۔

”بولو فرشتے لی بی! تم سائن کرو گی یا نہیں؟“

اس نے پستول کی ٹھنڈی ٹال حمل کی گردن پر چھوئی۔ وہ سسک کر رہ گئی۔

”بولو فرشتے!“ وہ زور سے چیخا۔

”نہیں!“ وہ جیسے ہوش میں آئی۔ ”میں سائن نہیں کروں گی۔“ اس کا لہجہ اٹل تھا۔

”میں تین تک گنوں گا فرشتے! اگر میں نے گولی چلا دی تو تمہاری بہن کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

”فرشتے پلیز۔۔۔!“ حمل بلک پڑی۔ ”پلیز میری خاطر فرشتے! آج آپ اپنا حق چھوڑ دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں اگر ضرورت پڑی تو میں بھی آپ کے لیے اپنا حق چھوڑ دوں گی۔ آئی براؤنس۔“

”نہیں! میں سائن نہیں کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تین تک گنوں گا۔“

فرشتے نے دیکھا اس کی انگلی ٹرائیگر پر مضبوط ہوئی اور وہ واقعی گولی چلانے والا تھا۔

”ایک۔۔۔“

لحہ بھر کو اس کا دل کانپا۔ اگر وہ گولی چلا دے تو حمل مر جائے گی پھر بھلے وہ ہمایوں کو بلا لے، کورٹ پکھری میں گواہیاں دیتی پھرے، کچھ بھی کر لے، اس کی بہن واپس نہیں آسکے گی۔

”دس۔۔۔“

بھلے فواد کو پھانسی ہو جائے اور وہ ساری جائیداد کی مالک بن بیٹھے اس کی بہن واپس نہیں آئے گی۔

”تین۔۔۔!“

”رکو۔۔۔! میں سائن کر دوں گی۔“ وہ ٹھکست خورہ لہجے میں بولی ”لیکن آپ کو حمل کی شادی اسی

وقت وہاں کرانا ہوگی جہاں میں کموں کی اور اس میں نہ صرف آپ سب بلکہ آپ کا پورا خاندان شریک ہو گا۔ حمل اسی گھر سے رخصت ہوگی۔“

”منظور ہے۔“ فواد جھٹ بولا تھا۔ حمل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی ”فرشتے کیا کرنا چاہ رہی ہے وہ نہیں سمجھ پائی تھی پھر اس نے حسن کو دیکھا جو اسی طرح بے بس سا کھڑا تھا فضلہ نے سختی سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔ بے بس اور کمزور مرد۔ وہ جواتنے دعوے کرتا تھا سب بے کار گئے تھے۔

”ٹھیک ہے پھر نکاح خواں کو بلائے میں ہمایوں کو بلاتی ہوں۔“ اس نے جھک کر میز پر رکھا موبائل اٹھایا۔

”ہمایوں؟ ہمایوں داؤد؟“ فواد کو گویا کرنٹ لگا تھا۔

”جی وہی۔“ فرشتے تلخی سے مسکرا کر سیدھی ہوئی۔ ”بولے اب آپ کو یہ معاہدہ قبول ہے؟“

”ہمایوں داؤد؟ وہ اے ایس پی؟“

”وہ پولیس والا؟“

”نہیں ہرگز نہیں۔“ بہت سی حیران، غصیلی آوازیں ابھری تھیں جن میں سب سے بلند آغا جان کی تھی۔

”وہ شخص اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا جس نے میرے بیٹے کو جیل بھجوا دیا تھا، ہمیں دستخط نہیں کرنا تو نہ کرو مگر میں حمل کی شادی کبھی اس سے نہیں کروں گا۔“

”میں آپ سے بات نہیں کر رہی کریم چچا! میں یہ معاہدہ آغا فواد کے ساتھ کر رہی ہوں، ان ہی کو بولنے دیجئے نا۔“

”مگر۔۔۔“

”نہیں آغا جان! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ بلائے اس کو۔ ہمیں قبول ہے۔“ وہ سنبھل چکا تھا چہرے کی مسکراہٹ واپس آگئی تھی۔

”مگر فواد یہ کل کو مسکرائی تو؟“ آغا جان نے پریشانی سے اس کا شانہ پکڑ کر اپنی جانب کیا۔

”یہ نہیں مسکریں گی یہ تو ماشاء اللہ سے منسل۔۔۔ مان

ہیں۔ یہ وعدے سے نہیں پھریں گی۔“ مسلمان کو توڑ کر کہتے ہوئے اس نے ابستہ رائیہ مسکراہٹ فرشتے کی جانب اچھالی۔ وہ لب بکھینچے تنفر سے اسے دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ بلائے اپنے کزن کو۔ فنکشن تو آج ہونا ہی ہے۔ اسد اب تک نکاح خواں کا بندہ است کر چکا ہو گا۔“ غفران چچا مصروف سے لہجے میں کہتے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کی جیسے جان چھوٹ گئی تھی۔ فضلہ سے بھی اپنا اطمینان و خوشی چھپائی مشکل ہو رہی تھی۔ ان دونوں کو گویا اپنا بیٹا واپس مل گیا تھا، پھر بھی وہ حسن کا بازو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھیں مگر اب شاید وہ رستی تڑا کر بھاگنے کے تہل نہ رہا تھا۔ اس کا تو آسرا ہی ختم ہو گیا تھا۔

”آؤ اندر چلو۔“ فرشتے نے ٹھکے ٹھکے انداز میں حمل کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لیے اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سب گردن موڑ کر انہیں جاتا دیکھنے لگے تھے۔ پورے گھر میں عجیب سی خاموشی دوڑ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

”سب کسی خواب کی سی کیفیت میں ہوا تھا۔ شاید وہ ایک حسین خواب ہی تھا جس کی تعبیر کی اسے بہت بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ بہت سارے خواب توڑنے پڑے تھے مگر اسے اس وقت وہی صحیح لگا تھا۔ یہ نہ کرتی تو وہ لوگ اسے خاندان بھر میں بدنام کر دیتے۔ اس کے مرحوم ماں باپ کا نام اچھلا جاتا یا پھر سب سے بڑی وجہ وہ تھی جو فواد کو بھی معلوم تھی اور جس کو اس نے استعمال کیا تھا۔ حمل کی دُکھتی رگ کہ اس کا خاندان اس کو عزت سے بیاہ دے اسے دولت سے زیادہ اپنا مقام اور عزت چاہے تھی اور فواد نے اسی دُکھتی رگ کو ایسے دبایا تھا کہ اس کا دل تڑپ اٹھا تھا۔ وہ فیصلہ جذباتی تھا مگر اسے صحیح لگا تھا۔

پھر جو بھی ہوا، جیسے نیند کی حالت میں ہوا۔ فرشتے اس کا چہرہ کلہنزر سے صاف کر کے بیوٹیشن کے ساتھ اس کا دوپٹہ سیٹ کر رہی تھی پھر وہ تانکی مہتاب کے

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیرائل

## SOHNI HAIR OIL

- ☆ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ☆ سٹے بال آکاتا ہے۔
- ☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ☆ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ☆ یکساں مفید۔
- ☆ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیرائل 12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدنا چاہتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں والے مٹی آڈر بھی کر رہے ہیں ہارسل سے گواہیں درج ذیل سے منگوانے والے مٹی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے
  - 3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے
- نوٹ: ان میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آرڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53-لاہور، مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل آفل ان چیکوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-لاہور، مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ، ران ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021



زیور اتار کر اس کی ہاں کے زیور پہناری تھی پھر وہ اس کامیک اپ کر رہی تھی پھر وہ اس کے سینڈل کے اسٹریپ بند کر رہی تھی پھر وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی اور پھر وہ بہت کچھ کر رہی تھی مگر اسے آواز نہیں آرہی تھی۔ ساری آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ سارے منظر دھندلا گئے تھے، بس وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی بہت بنی بیٹھی تھی۔

وہ خواب حسین تھا مگر اس کا دل خالی تھا۔ سارے جذبات گویا مرے گئے تھے۔ خواہش کے جگنو کھو گئے تھے۔

یا شاید ہمیں خوشی سے محبت نہیں ہوتی، خوشی کی ”خواہش“ سے محبت ہوتی ہے۔ ہماری سب محبتیں ”خواہشات“ سے ہوتی ہیں، کبھی کسی کو پانے کی تمنا، کبھی کوئی خاص چیز حاصل کرنے کی آرزو۔ شاید محبت صرف خواہش سے ہوتی ہے، چیزوں یا لوگوں سے نہیں۔

اس نے اپنی خواہش کو اپنے پہلو میں بیٹھتے دیکھا، مگر اس کا اپنا سر جھکا تھا، سوزیادہ دیکھ نہ پائی اور اسی جھکے سر کے ساتھ نکاح نامے پہ دستخط کرتی گئی، کرتی گئی، کرتی گئی۔

جب اس کا ہاتھ تھام کر فرشتے اسے اٹھا رہی تھی تو اس نے لمحے بھر کو اسے دیکھا، جو سامنے لب بھیجے کھڑا تھا۔ براؤن شلوار کرتے میں ملبوس، سنجیدہ اور وجہ۔ اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اسے اس کی سنجیدگی سے خوف آیا تھا۔ کیا وہ اس پہ مسلط کی گئی تھی؟ ان چاہی، بے وقعت بیوی؟

اس نے بے عزتی اور توہین محسوس کرنا چاہی مگر دل اتنا خالی تھا کہ کوئی احساس بیدار نہ ہوا۔

ارد گرد لوگ بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر اس کی سماعتیں بند ہو گئی تھیں۔ وہ سر جھکائے ہمایوں کی گاڑی کی بیک سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ اسے لگا اب زندگی کٹھن ہوگی، بہت کٹھن۔

\*\*\*

وہ اس جمائی سائز بیڈ کے وسط میں سر گھٹنوں پہ

رکھے، گم صم سی بیٹھی تھی۔ فرشتے کچھ دیر ہوئی اسے وہاں بٹھا کر جانے کہاں چلی گئی تھی اور ہمایوں کو تو اس نے گاڑی سے نکل کر دیکھا ہی نہ تھا۔ وہ تیزی سے اندر چلا گیا تھا اور پھر دوبارہ سامنے نہیں آیا تھا۔

اس کے دل میں عجیب عجیب سے خیال آرہے تھے۔ وہ بار بار ”اعوذ باللہ“ پڑھتی مگر سوسے اور وہم ستانے لگے تھے، شاید وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، شاید وہ اس پہ مسلط کی گئی تھی شاید وہ خفا تھا، شاید وہ اسے پسند ہی نہیں کرتا تھا، اب شاید اس کے پاس نہیں آئے گا، بلکہ شاید وہ بات تک نہ کرے، شاید وہ اسے چھوڑ دے، شاید وہ۔ شاید۔

بہت سے شاید تھے جن کے آگے سوالیہ نشان لگے تھے۔ بار بار وہ شاید اس کے ذہن کے پردے پہ ابھرتے اور اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ وہاں یوں ہونے لگی تھی جب دروازہ کھلا۔

بے اختیار سب کچھ بھلا کر وہ سر اٹھائے دیکھنے لگی۔

وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ جانے وہ اب کیا کرے؟ وہ دروازہ بند کر کے اس کی طرف پلٹا، پھر اسے یوں بیٹھے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

”السلام علیکم، کیسی ہو؟“۔ آگے بڑھ کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل دروازہ کھولی وہ خاموشی سے کچھ کہے بنا اسے دیکھے گئی۔ وہ اب دراز میں چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔

”تم تھک گئی ہوگی“ اتنے بڑے زلمے سے گزری ہو۔ پریشان مت ہونا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اب نچلے دراز میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ لہجہ متوازن تھا اور الفاظ۔۔۔ الفاظ یہ تو اس نے غور ہی نہیں کیا، وہ بس اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو دراز میں ادھر ادھر حرکت کرتے یک دم رکے تھے اور پھر اس نے ان میں ایک میگزین پکڑے دیکھا۔

(کیا اس میں گولیاں بھی ہیں؟ کیا یہ مجھے مار دے گا) وہ عجیب سی باتیں سوچ رہی تھی۔

وہ میگزین نکال کر سیدھا ہوا۔

”آئی ایم سوری محمل! ہمیں سب بہت جلدی میں

کرنا پڑا اور میں جانتا ہوں۔ تم اس سب کے لیے تیار نہیں تھیں۔“

وہ کہہ رہا تھا اور وہ سانس روکے اس کے ہاتھ میں پکڑا میگزین دیکھ رہی تھی۔

”میں ابھی آن ڈیوٹی ہوں اور مجھے ریڈ کے لیے کہیں جانا ہے۔ رات فرشتے تمہارے ساتھ رک جائے گی، میں پرسوں شام تک واپس آ جاؤں گا، تم پریشان نہ ہونا۔“

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ عجیب شادی، عجیب سی دلہن، اور عجیب سا دروہا اسے اس کی باتیں بہت عجیب لگی تھیں۔

”تم سن رہی ہو؟“ وہ اس کے سامنے بیڈ پہ بیٹھا بغور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا سی چوٹی۔

”ہوں جی، ہئی۔“ بے ساختہ نگاہیں جھکا لیں۔ پھر پتا نہیں وہ کیا کیا کہتا رہا، محفل نظریں نیچی کیے

کھتی رہی۔ الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرا کر گویا واپس پلٹ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کب خاموش ہوا، کب اٹھ کر چلا گیا، اسے تب ہوش آیا جب پورچ سے گاڑی نکلنے کی آواز آئی۔

اس نے ویران نظروں سے کمرے کو دیکھا۔ یہی وہ کمرہ تھا جس میں کبھی ہمایوں نے اسے بند کیا تھا، تب وہ سیاہ سا ڈھمی میں ملبوس تھی۔

آج اس نے سرخ شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ عروسی جوڑا، عروسی زیورات، وہ دلہن تھی اور پتا نہیں کیسی دلہن تھی۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اس کمرے میں یوں کبھی ہمایوں کی دلہن بن کر آئے گی۔ ہاں فواد کے خواب اس نے دیکھے تھے، مگر وہ اس کے دل کا ایک چھپا ہوا راز تھا، جس کی خبر شاید خود فواد کو بھی نہ تھی۔

”اور حسن؟“ اندر سے کسی نے سرگوشی کی۔

حسن کے لیے اس کے دل میں کبھی کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا اور اچھائی ہوا۔ شام کو جب فواد نے اس کے نام کے ساتھ ہمایوں کا نام لیا تو کیسے وہ بالکل چپ ہو گیا تھا۔ وہ جو ہر موقع پہ محفل کے حق کے لیے بولتا تھا، اڑتا

تھا، اتنے اہم موقع پہ یوں کیوں پیچھے ہو گیا تھا؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی اور فرشتے اس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی اس کے لیے۔ وہ کبھی بھی اس کا احسان نہیں اتار سکتی، وہ جانتی تھی، اس نے اپنا حق چھوڑ دیا، کاش فرشتے بھی کبھی اسے موقع دے اور وہ اس کے لیے اپنا حق چھوڑ سکے۔

اس نے تھک کر سر بیڈ کراؤن سے نکال دیا اور آنکھیں موند لیں۔ اس کا دل اداس تھا، روح بو جھل تھی۔ اب اسے راحت چاہیے تھی، سکون چاہیے تھا۔ اپنے خاندان والوں کی قید سے نکلنے کے احساس کو محسوس کرنے کی حس چاہیے تھی۔ اسے غم سے نجات چاہیے تھی۔ اس نے ہولے سے لبوں کو حرکت دی اور آنکھیں موندے دھیمی آواز میں دعا مانگنے لگی۔

”یا اللہ، میں آپ کی بندی ہوں اور آپ کے بندے کی بیٹی ہوں اور آپ کی بندی کی بیٹی ہوں۔ میری پیشانی آپ کے قابو میں ہے، میرے حق میں آپ کا حکم جاری ہے، آپ کا فیصلہ میرے بارے میں انصاف پہ مبنی ہے۔ میں آپ سے سوال کرتی ہوں آپ کے ہر اس نام کے واسطے سے جو آپ نے اپنے لیے پسند کیا یا اپنی کتاب میں اتارا یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا اپنے علم غیب میں آپ نے اس کو اختیار کر رکھا ہے، اس بات کو کہ آپ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار اور میری آنکھوں کا نور بنا دیں اور میرے فکر اور غم کو لے جانے کا ذریعہ بنا دیں۔“

وہ دعا کے الفاظ بار بار دہراتی گئی، یہاں تک کہ دل میں سکون اتر آیا، اس کی آنکھیں بو جھل ہو گئیں اور وہ نیند میں ڈوب گئی۔

\*\*\*

وہ دونوں فرشتے اس کے ساتھ رہی۔ ان دونوں میں انہوں نے بہت سی باتیں کیں، سوائے اس شام کے ڈرامے کے۔ وہ ایسا موضوع تھا کہ دونوں ہی کسی خاموش معاہدے کے تحت اس سے احتراز برت رہی



تھیں۔

فرشتے نے اسے بہت کچھ بتایا۔ ابا کے بارے میں اپنی ماں کے بارے میں ہمایوں کی امی کے بارے میں اپنی زندگی گھر اور پرانی یادوں کے بارے میں۔ وہ دونوں چائے کے مکے تھے گھنٹوں لان میں بیٹھی باتیں کرتی رہتیں چائے ٹھنڈی ہو جاتی شام ڈھل جاتی مگر ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔

”بتا ہے محمل! ادھر لان میں۔۔۔“ وہ دونوں برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھیں چائے کے مکے ہاتھ میں تھے جب فرشتے نے بازو لبا کر کے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔ ”وہاں ایک جھولا تھا بالکل کونے میں۔“

محمل گردن موڑ کر اس دیکھنے لگی جہاں اب صرف گھاس اور کیاریاں تھیں۔

”ہم بچپن میں اس جھولے پہ بہت کھیلتے تھے اور اس کے اس طرف طوطوں کا پنجرہ تھا۔ ایک طوطا میرا تھا اور ایک ہمایوں کا۔ اگر میرا طوطا اس کی ڈالی گئی چوری کھا لیتا تو ہمایوں بہت لڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اتنا غصے والا تھا مگر غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر لونگ اور کیڑے رنگ بھی کوئی نہیں ہے۔“

محمل مدھم مسکراہٹ لیے سر جھکائے سن رہی تھی۔

”جب میں بارہ سال کی ہوئی تو ابائے مجھ سے پوچھا کہ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں یا اماں کے ساتھ؟ میں وقتی طور پہ ابا کے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گئی مگر اس دن ہمایوں مجھ سے بہت لڑا۔ اس نے اتنا ہنگامہ مچایا کہ میں نے فیصلہ بدل دیا۔“ چائے کا مک اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ کہیں دور کھوئی ہوئی تھی۔

”پھر جب ہم بڑے ہوئے اور میں نے قرآن پڑھا تو ہمایوں سے ذرا دور رہنے لگی۔ وہ خود بھی سمجھ دار تھا مجھے زیادہ آزمائش میں نہیں ڈالتا تھا۔ پھر میری اماں کی ڈلتھ ہوئی تو۔۔۔“

دفعتا گاڑی کا ہارن بجا۔ وہ دونوں چونک کر اس

طرف دیکھنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے گیٹ کھلا اور دن سے سیاہ گاڑی اندر داخل ہوئی۔

”چلو تمہارا میاں آگیا، تم اپنا گھر سنبھالو“ میں اپنا سامان پیک کر لوں۔“ وہ ہنس کر کہتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

محمل متذبذب سی بیٹھی رہ گئی۔ وہ گاڑی سے نکل کر اس طرف آ رہا تھا۔ یونیفارم میں ملبوس کیپ ہاتھ میں لیے تھا کتا کتا سا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”تو تم میرے انتظار میں بیٹھی ہو؟“ وہ مسکرا کر کہتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا تو وہ گڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ گلابی شلوار قمیص پہ بھورے بالوں کی اونچی پونی ٹیل بنائے وہ اداس شام کا حصہ لگ رہی تھی۔

”وہ میں۔۔۔“

”کہہ دو کہ تم میرا انتظار نہیں کر رہی تھیں۔“

”نہیں۔۔۔ چائے لاؤں؟“

”اونہوں کی کالی ہے۔“ اس نے محمل کے ہاتھ سے مک لیا۔ ایک گھونٹ بھرا اور مک لیے دروازے کی طرف بڑھ گیا پھر جاتے جاتے پلٹا۔ ”فرشتے ہے؟“

”جی وہ اندر ہیں۔“

”اوکے میں شانور لے کر کھانا کھاؤں گا تم ٹیبل لگا دو۔“ وہ کہہ کر دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

وہ چند لمحے خاموش کھڑی کھلے دروازے کو دیکھتی رہی وہ دروازہ بند کر کے نہیں گیا تھا کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ اندر آجائے؟ پہلے بھی تو وہ بغیر اجازت اس کی زندگی میں داخل کر دی گئی تھی۔ اب بھی چلی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

اس نے تختی سے سر جھٹکا اور کھلے دروازے سے اندر چلی آئی۔

لاؤنج کے سرے پہ سیڑھیوں کے قریب فرشتے اور ہمایوں کھڑے تھے۔ وہ اپنے بیک کا پینڈل تھامے سیاہ جلاب چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے انگلی سے ٹھوڑی کے نیچے اڑس رہی تھی۔

”نہیں بس اب میں چلتی ہوں کل مجھے کلاس

لینی ہے۔“

”تم از کم کچھ دن تو تمہیں ادھر رہنا چاہیے۔“

وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز بے حد مدھم تھی محمل کو اپنا آپ ادھر بے کار لگا تو وہ سر جھکائے کچن میں چلی آئی۔

بلقیس جا چکی تھی۔ کچن صاف تھرا پڑا تھا۔ اس نے چولہا جلایا اور کھانا گرم کرنے لگی۔ شاید وہ بھی اس گھر میں بلقیس کی طرح تھی۔ ایک لڑکائی۔

”محمل!“ فرشتے نے کھلے دروازے سے جھانکا۔ محمل نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ وہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

”آپ مت جائیں فرشتے! پلے!“ وہ بے اختیار رو ہنسی سی ہو کر اس کے قریب آئی۔

”اوہو! میرا کزن بہت اچھا انسان ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو پانگل!“

اس نے ہونے سے اس کا گلہ چھینا۔ محمل چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر ایک اس کی بھوری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ جھٹک کر چوٹے کو تیز کرنے لگی۔

”محمل! کیا ہوا ہے؟ تم مجھے پریشان لگ رہی ہو؟“

وہ ذرا فکر مند سی اس کے پیچھے آئی۔ محمل کی اس کی طرف پیٹھ تھی فرشتے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”کسی کی شادی ایسے بھی ہوئی ہے جیسے میری ہوئی؟“

بہت دیر بعد وہ بولی تو آواز میں صدیوں کی یاس تھی۔ فرشتے۔۔۔ کچھ نہ بولی تو پلٹی۔

فرشتے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا اس نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔

”کیا؟“ وہ گڑبڑا گئی۔

”محمل! تم! حیرت کی جگہ غلے لے لی۔“

”کیا ہوا؟“

”تم بہت۔۔۔ بہت ناشکری ہو محمل! بہت زیادہ!“

وہ جیسے غصہ ضبط کرتے ہوئے تیزی سے مڑ گئی۔

”فرشتے! رکیں“ محمل پو پھلا کر اس کے پیچھے لپکی۔ وہ تیزی سے باہر نکل رہی تھی اس نے اسے بازو سے تھامتا تو رک گئی چند لمحے۔ کڑی رہی پھر گہری سانس

لے کر اس کی طرف گھومی۔

”تمہیں ہمایوں مل گیا محمل! اب بھی ناخوش ہو؟“ وہ بہت دھکی سی ہو کر بولی تھی۔ محمل نے بے چینی سے لب کچلا۔ فرشتے اسے غلط سمجھ رہی تھی۔

”نہیں میں صرف اس خوشی کو محسوس کرنا۔۔۔“

”جسٹ اسٹاپ اٹ!“ وہ بت تھا تھی۔ محمل چپ سی ہو گئی۔ چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی

حائل رہی پھر فرشتے نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں شانوں پہ اپنے ہاتھ رکھے اور اسے اپنے بالکل سامنے کیا۔

”تم واقعی ناخوش ہو؟“

”نہیں۔ مگر اس سب سے برابر کٹ کر رہ گیا ہے۔“

”لوگوں کی روح تک کٹ جاتی ہے محمل! سب قربان ہو جاتا ہے وہ پھر بھی راضی ہوتے ہیں اور تم۔۔۔“

تم اب بھی شکر نہیں کرتیں؟ اس کی سنہری آنکھوں میں سرخ سی نمی ابھری تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک محمل کے کندھوں پہ تھے۔

”نہیں میں بہت شکر کرتی ہوں مگر۔ مگر بس سب کچھ بہت عجیب لگ رہا ہے۔۔۔“

”بس کرو محمل!“ اس نے ناف سے سر جھٹک کر اپنے ہاتھ ہٹائے اور تیزی سے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسے یونہی شک سا گزرا کہ وہ رو رہی تھی۔

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس نے شاید فرشتے کو ناراض کر دیا تھا، لیکن وہ جھٹکتی تھی وہ واقعی نا

ناشکری کر رہی تھی۔ صرف زبان سے الحمد للہ کہنا کافی نہیں ہوتا، اصل اظہار تو رویے سے ہوتا ہے۔

”کدھر گم ہو؟“

آواز پہ وہ چونکی۔ ہمایوں سامنے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ جھجک سی گئی۔

”فرشتے چلی گئی؟“ وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر فریج کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر پانی کی بوتل نکالی۔

”جی۔“

”فرشتے بہت اچھی ہے نا؟“ اس نے



ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے لگائی۔  
 ”بیٹھ کر پیس پلینز۔“ وہ خود کو کنے سے روک نہ سکی۔ وہ بوتل منہ سے ہٹا کر ہنس دیا۔  
 ”فرشتے نے تمہیں بھی اچھی لڑکی بنا دیا ہے۔“  
 ”تو کیا پہلے میں بری تھی؟“ وہ براہمان گئی۔  
 ”ارے نہیں، تم تو ہمیشہ سے اچھی تھیں۔“ مسکرا کر کہتے اس نے پھر بوتل لبوں سے لگائی۔ محمل نے دیکھا وہ بیٹھا نہیں تھا اب بھی کھڑا ہو کر لی رہا تھا۔ خود کو بدلنا بھی آسان نہیں ہوتا مگر دوسرے کو بدلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔  
 ”اچھا یہ بتاؤ تمہارا دل کیوں کٹ کر رہ گیا؟“  
 ”اف لودہ بری طرح چوٹی۔ وہ تو شاد اور لینے گیا تھا کب اگر سب سن گیا اسے تو بتا ہی نہ چلا تھا۔“  
 ”وہ دراصل۔۔۔“ اس کا دل زور سے دھڑکا۔  
 ”گھر سے کسی نے کال نہیں کی تو میں۔“  
 ”وہ کیوں کریں گے کال؟ ان کی اس شادی میں مرضی شامل نہیں تھی۔ فرشتے نے بہت مشکل سے انہیں راضی کیا تھا وہ اس بات پہ ابھی تک غصہ ہیں، آئی تھنک۔“  
 وہ یکدم ٹھنک گئی۔  
 ”فرشتے نے۔۔۔“ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔  
 ”اس نے کتنی مشکل سے ان کو راضی کیا۔۔۔ تم جانتی ہو!“ وہ پھر بوتل سے گھونٹ بھر رہا تھا۔  
 وہ دم بخود سی اسے دیکھ گئی۔ کیا وہ کچھ نہیں جانتا؟ اسے نہیں معلوم کہ کیسے ان دونوں نے فواد کے دیے کلنڈر پہ دستخط کیے تھے؟ فرشتے نے اسے کچھ نہیں بتایا؟ مگر کیوں؟  
 ”تم فکر مت کرو ہم نے یہ شادی ان سے زبردستی کروائی ہے، ان کو کچھ عرصہ ناراض رہنے دو۔ ڈونٹ وری۔“  
 تو وہ واقعی کچھ نہیں جانتا۔ وہ بتائے یا نہیں؟ اس نے لمحے بھر کو سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا۔ اگر فرشتے نے کچھ نہیں بتایا تو وہ کیوں بتائے؟ چھوڑو جانے دو۔  
 ”صرف ان کے ساتھ زبردستی ہوئی ہے یا آپ کے

ساتھ بھی؟“  
 ”تو تم اس لیے ریشان تھیں؟“ اس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”تمہیں لگتا ہے کوئی ہمایوں داؤد کو مجبور کر سکتا ہے؟“  
 ”مجبوراً“ قائل تو کر سکتا ہے!“  
 ”نہیں کر سکتا۔ قطعاً نہیں۔“  
 ”پھر آپ نے۔۔۔ آپ نے کیوں شادی کی مجھ سے؟“  
 ”اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہ کہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا تھا وغیرہ وغیرہ تو میں ایسا نہیں کہوں گا، کیونکہ واقعی مجھے تم سے کوئی طوفانی محبت نہیں تھی۔ ہاں۔۔۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں نے اپنی مرضی سے تم سے شادی کی ہے اور میں اس فیصلے پہ بہت خوش ہوں۔“  
 اس کا انداز اتنا نرم تھا کہ وہ آہستہ سے مسکرا دی۔  
 ”دل پہ لدا بوجھ ہلکا ہوا کیا۔“  
 ”یعنی آپ خوش ہیں؟“  
 ”آف کورس محمل! ہر بندہ اپنی شادی پہ خوش ہوتا ہے۔ بنیادی طور پہ میں بہت پریٹیکل انسان ہوں۔ بس بات نہیں کرتا اور مجھے بے کار کی مبالغہ آرائی نہیں پسند۔ میں کوئی دعویٰ کر دلا گا نہ وعدہ۔ یہ تم وقت کے ساتھ دیکھ لو گی کہ تم اس گھر میں خوش رہو گی۔“  
 وہ جیسے کھل کر مسکرا دی۔ اطمینان اور سکون اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا تھا۔  
 ”تم اس پہ کچھ نہیں کہو گی؟“  
 ”میں کیا کہوں؟“  
 ”میں بتاؤں؟“  
 ”جی بتائیے۔“ وہ بہت دھیان سے متوجہ ہوئی۔  
 ”سالن جل رہا ہے۔“  
 ”اوہ۔“ وہ بوکھلا کر پلٹی۔ دیکھی میں سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔ مدھم سی جلنے کی بو بھی سارے میں پھیل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کیا۔  
 ”ویلم ٹوپر یٹیکل لائف!“ وہ مسکرا کر کتابا ہرنگل گیا۔ وہ گہری سانس لے کر دیکھی کی طرف متوجہ

ہوئی۔  
 سالن جل گیا تھا مگر اس کے اندر ہر سو بہار چھا گئی تھی۔ وہ مسکرا ہٹ دبائے دیکھی اٹھا کر سنگ کی طرف بڑھ گئی۔  
 ☆ ☆ ☆  
 ”محمل۔۔۔ محمل!“ وہ نیچے لاؤنج میں کھڑا سر اٹھائے مسلسل اسے آوازیں دے رہا تھا۔ ”جلدی کرو“ دیر ہو رہی ہے۔“  
 ”آ رہی ہوں بس ایک منٹ۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے لپ گلوں اٹھایا اور سامنے آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے لپ اسٹک پہ لگایا، لپ اسٹک چمک اٹھی تھی۔  
 ”محمل!“ وہ پھر چلا دیا تھا۔  
 ”بس آگئی۔“ اس نے ایک عجلت بھری نگاہ سنگھار میز کے آئینے میں جھلکتے اپنے وجود پہ ڈالی۔ ٹی پنگ بیارسی ساڑھی میں ملبوس، لمبے سیدھے بال کمر پہ گرائے کانوں میں چمکتے ڈائمنڈ کے ایئر رنگز گردن سے چمکانازک ہیروں کا سیٹ جو ہمایوں نے اسے تیمور کی پیدائش پہ دیا تھا اور کھائی میں وائٹ گولڈ کے موتی جڑے ٹنگن ساتھ مناسب سامیک اپ۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ بیڈ پہ لیٹے تیمور کو اٹھایا اور باہر نکل آئی۔  
 ”تم اتنی دیر کر رہی ہو کیا ارادہ بدل گیا ہے؟“  
 آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ زیر لب مسکرایا۔ وہ جو تیمور کو اٹھائے سبج سپرھیاں اتر رہی تھی مسکرا اٹھی۔  
 ”ہرگز نہیں۔ آخر کو اپنے میکے جا رہی ہوں ارادہ کیوں بدلوں گی؟“ وہ سپرھیاں اتر آئی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس بالوں کو جیل سے پیچھے کیے وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔  
 ”اچھے لگ رہے ہیں۔“  
 ”تم بھی!“  
 ”بس اتنی سی تعریف؟“ اس کا چہرہ اتر گیا۔  
 ”شادی کے ایک سال بعد اب میں اور کیا کہوں؟“  
 وہ دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے تھے۔

ایک سال گزر گیا ہمایوں ایسا ہی نہیں چلا۔ وہ فرسٹ ڈور کھولتے ہوئے کہیں کھوسی گئی تھی۔  
 ”ہاں، وقت بہت جلدی گزر جاتا ہے۔“ وہ گاڑی سڑک پہ ڈال کر بہت دیر بعد بولا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے۔  
 ”ہوں۔“ محمل نے سیٹ کی پشت سے سر نکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔  
 ایک سال گزر بھی گیا یوں جیسے پتا ہی نہ چلا ہو۔ پورے ایک برس پہلے وہ بیاہ کر اس گھر سے ادھر آئی تھی، آج ایک برس بعد ہمایوں نے شادی کی سالگرہ پر اسے اسی گھر لے جانے کا تحفہ دیا تھا۔  
 پورا سال نہ انہوں نے اس کی خبر گیری کی نہ ہی محمل نے کوئی فون کیا۔ شروع میں اسے غصہ تھا، پھر آہستہ آہستہ وہ غم میں ڈھل گیا اور اب۔۔۔ اب اسے اپنے فرائض یاد آئے۔ صلہ رحمی کے احکامات یاد آئے تو اس نے تہہ نہ کر لیا کہ اپنے رشتہ داروں سے پھر سے تعلق جوڑے گی۔ پہلے بھی یہ خیال کئی بار آیا، مگر ہمایوں جانے نہ راضی نہ ہوتا تھا، لیکن گزرتے وقت کے ساتھ فواد کا کیس اندر ہی اندر دھتکا گیا اور پھر ہمایوں نے ہی ایک دن اسے بتایا کہ فواد ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید آسٹریلیا۔ وہ بھی کسی حد تک سکون میں آگئی نہ جانے کیوں۔  
 ہفتہ پہلے ہمایوں کو کسی جگہ آغا کریم ملے، اس نے محمل کو بتایا کہ وہ بہت خوش دلی سے ملے اور اسے گھر آنے کی دعوت بھی دی۔ منافقت، دنیا داری اور پھر اب وہ کس چیز کا بغض چروں پہ سجائے رکھتے؟ فواد تو باہر چلا گیا اور جائیداد انہیں مل گئی، پھر ہمایوں داؤد جیسے بندے کو داماد کنے میں کیا مضائقہ تھا؟ بلکہ فخر ہی تھا۔  
 ایک تبدیلی اور بھی آئی تھی۔ فرشتے اسکاٹ لینڈ چلی گئی تھی۔ اسے قرآن سائنسز میں پی ایچ ڈی کرنا تھی، خوب سارا علم حاصل کرنا تھا، پھر اس کا تھیسسز اور بہت کچھ۔ وہ چلی گئی تو مدد میں اس کی جگہ کسی اور نے لے لی۔  
 اور رہی محمل تو وہ آج بھی تیمور کو لے کر فجر کی نماز



کے ساتھ ہی مدرسہ جاتی تھی۔ اس کے علم الکتاب کا بھی آدھا سال رہتا تھا۔ گاڑی رکی تو وہ چونک کر حال میں آئی۔ وہ آغا ہاؤس کے پورچ میں موجود تھی۔ وہ تیمور کو اٹھائے باہر نکلی اور گم صم سی ارد گرد نگاہ دوڑائی۔

لان کے کونے میں مصنوعی آبشار بن چکی تھی گھر کا پینٹ بدل چکا تھا، پورچ کے ٹائلز بھی نئے اور قیمتی تھے۔

لاؤنج کے دروازے پہ متاب تائی اور آغا جان کھڑے تھے۔ محل اور ہمایوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جیسے گہری سانس لے کر ان کی طرف بڑھے۔ شال اس نے ایک کندھے پہ ڈال لی تھی۔ بھورے سیدھے بال دونوں کانوں کے پیچھے اڑے تھے۔ پورچ کی مدھم لائٹ میں بھی اس کے ڈائمنڈ سیٹ کے جگر جگر کرتے ہیرے جملے تھے۔

”محمل! یہ تم ہو؟ کیسی ہو؟“ تائی متاب پرتپاک استقبال کے ساتھ آگے لپکی تھیں۔

”محمل! میری بیٹی۔۔۔“ آغا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اس کی آنکھوں کے گوشے بھینکنے لگے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا۔

دونوں چچیاں اور دوسری لڑکیاں بھی وہیں آگئیں۔ وہ ان کے ساتھ ان کے سوالوں کے جواب دیتی اندر آئی تھیں۔

ایک تو ہمایوں کی شان دار بر سنالٹی، اوپر سے محمل کا بدلا، سجا سنورا، دولت اور آسائشوں کی فراوانی ظاہر کرتا سراپا۔ فضلہ نے توازی بیٹھے انداز میں تعریف کی، البتہ ناعمہ کے ماتھے کے لبوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی جلن چھانہ پار ہی تھی۔

لاؤنج کا بھی حلیہ بدلا ہوا تھا۔ قیمتی فانوس، پردے، پیش قیمت ڈیکوریشن، پیسز، گوکہ پہلے بھی وہاں ہر چیز قیمتی ہوتی تھی، مگر اب تو جیسے پیسے کی ریل پیل ہو گئی

تھی۔ ایک ایک کو ناچک رہا تھا۔ شاید اب انہیں کھلا اختیار جو مل گیا تھا۔

”سدرہ باجی کدھر ہیں اور آرزو؟“ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے متلاشی نگاہ اودھرا دھرو ڈرائی۔

”سدرہ کی تو دسمبر میں شادی ہو گئی، وہ کینیڈا چلی گئی۔“ تائی متاب نے فخر سے بتایا۔ چہرے پہ اسے نہ بلائے کی کوئی ندامت نہ تھی۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب کر ابھرا۔ وہ غلط تھی، ان کو کوئی شرمندگی نہ تھی بلکہ نعمتوں کی بے پناہ بارش نے انہیں مزید مغرور کر ڈالا تھا۔

”مہرین کا نکاح پچھلے ماہ ہوا ہے، لڑکا ڈاکٹر ہے، انگلینڈ میں ہوتا ہے، اسی سال شادی کریں گے۔“

”اچھا۔ ماشاء اللہ!“ وہ دل سے خوش ہوئی مگر ابھن بھر حال تھی۔ انہوں نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا، پھر بھی ان کی خوشیوں میں اضافہ کیوں ہوتا چلا گیا؟

”ندا کی بھی منگنی ہو گئی۔“ فضلہ چچی کیوں پیچھے رہتیں۔ وہ بھی ڈاکٹر سے، سعودیہ کی رائل فیملی کے ڈاکٹر میں سے ہے۔ سامیہ کی بھی آج کل بات چل رہی ہے۔“

”اور آرزو؟“ یونہی اس کے لبوں سے پھسل پڑا۔ نگاہ سب سے الگ بیٹھی ناعمہ چچی پہ جا پڑی۔ ان کی کوفت میں جیسے اضافہ ہوا تھا۔

”رشتوں کی لائن گئی ہے میری بیٹی کے لیے، ہر دوسرے دن کسی شہزادے کا رشتہ آجاتا ہے۔“ وہ ہاتھ نچا کر بہت چمک کر بولی تھیں۔

”مگر وہ مانے بھی تو۔“ فضلہ چچی نے دھیمی سرگوشی کی، ”آواز یقیناً“ ناعمہ چچی تک نہیں گئی تھی۔ مخاطب محمل ہی تھی، جو سن کر ذرا سی چونکی تو فضلہ چچی معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

”آرزو باجی کدھر ہیں؟ نظر نہیں آرہیں؟“ اس نے دوسری دفعہ پوچھا تو ناعمہ چچی انھیں اور پیر پختی ہوئی وہاں سے نکل گئیں۔

”انہیں کیا ہوا؟“ اس نے حیرت سے تائی متاب

کو دیکھا، جنہوں نے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔

”بیٹی کا دل آگیا کسی پہ، اب مان کے نہیں دے رہی۔“

”اچھا!“ اسے حیرت ہوئی۔ اسی پل سیڑھیوں سے اترتے ہوئے کوئی رک۔ آہٹ پہ محمل نے نگاہ اٹھائی اور پھر بے اختیار شال کا پلو سر پہ ڈال لیا۔

حسن مبسوت سا، دھڑکھڑا تھا۔ کف کاٹن بند کرتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔

”السلام علیکم حسن بھائی!“ وہ خوش دلی سے مسکرائی تو وہ چونکا، پھر سر جھٹک کر آخری زینہ اتر ا۔

”وعلیکم السلام، کیسی ہو محمل، کب آئیں؟“ وہ ان کی طرف چلا آیا تھا۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے یا بیٹی؟“

”بیٹا ہے، تیمور۔“ اس نے جھک کر تیمور کو پیار کیا، پھر سیدھا ہوا۔

”اکیلی آئی ہو؟“

”ارے نہیں، ہمایوں اس کے ساتھ آیا ہے، تمہارے آغا جان کے ساتھ ڈرائیونگ روم میں بیٹھا ہے۔ جاؤ مل لو۔“ تائی متاب کے کہنے پہ وہ سر ہلاتا ڈرائیونگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”حسن بھائی کی کہیں منگنی وغیرہ نہیں کی چچی؟“ وہ سادہ سے لہجے میں فضلہ سے مخاطب ہوئی۔ اسے لگا وہ اس کا جوگ لے ابھی تک بیٹھا ہوگا۔

”ارے نہیں، حسن کی تو شادی بھی ہو گئی۔ میری بھانجی طلعت یاد ہے تمہیں؟ اسی سے۔ آج کل وہ میکے گئی ہوئی ہے۔ سامیہ، سامیہ۔“ انہوں نے بیٹی کو پکارا۔ ”جاؤ حسن کی شادی کا البم لے آؤ۔“

محمل کو واقف تھا، لگا تھا مگر پھر سنبھل گئی۔ وہ لوگ لینے والا بندہ تو نہ تھا، کمزور مرد جو کبھی اس کے لیے مضبوط سہارا نہ بن سکتا، لیکن بھلا اسے اس کا سارا چاہیے بھی کیوں تھا؟ کبھی بھی نہیں۔ اس کی تو حسن کے ساتھ کبھی بھی کوئی جذباتی وابستگی نہ رہی تھی، سو افسوس بھی نہ تھا۔

پھر انہوں نے اسے حسن اور سدرہ کی شادیوں کے البم دکھائے۔ وہ تو سجاوٹ اور دھوم دھام دیکھ کر حق دق رہ گئی۔ وہ انہوں کے عروسی لباس اور زیورات تو ایک طرف محض ایونٹ ڈرائیونگ پہ پیسہ پانی کی طرح لٹایا گیا تھا۔ انہیں محمل نے وہ سب کچھ خود دیا تھا، اب بھلا وہ کیوں اس کا رتی سا استقبال نہ کرتے؟

ڈنر بہت بُر تکلف تھا۔ آغا جان اور ہمایوں کے انداز سے لگ رہا تھا ان کی گہری دوستی رہی ہے۔ کون کہہ سکتا تھا، کبھی آغا جان اس شخص کا نام نہیں سن سکتے تھے؟

بس اس کے ایک دستخط نے ساری دنیا ہی بدل ڈالی تھی، پھر بھی وہ خوش تھی۔ اسے میکے کا مان جو مل گیا تھا، چاہے منافقت کا طمع اوڑھے، جھوٹا ہی سہی، مگر مان تو تھا نا۔

بس چند لمحوں کے لیے وہ تیمور کا بیگ لینے گاڑی تک آئی تھی اور تب اس نے لان میں کرسی پہ بیٹھی آرزو کو دیکھا تو رک گئی۔ وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی، سو تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”بہت خوب مسز ہمایوں! خوب عیش کر رہی ہو۔“ اس کے قریب سینے پہ بازو کیٹے کھڑی وہ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیتے بہت طنز سے بولی تھی۔ اس نے بمشکل خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔

”اللہ کا کرم ہے آرزو باجی! ورنہ میں اس قابل کہاں تھی؟“

”قابل تو تم خیر اب بھی نہیں ہو، یہ تو اپنی اپنی چالاکی کی بات ہوتی ہے۔“

”مجھے چالاکیاں آتی ہوتیں تو اس گھر سے ایسے ہی رخصت ہوتی جیسے سدرہ باجی ہوئیں۔“

”اوہ ڈونٹ پریٹنڈ ٹو بی انویسٹ۔“ (زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو، زیادہ تیزی سے جھڑک کر بولی۔)

”تم جانتی تھیں کہ ہمایوں صرف اور صرف میرا ہے، پھر بھی تم نے اس سے شادی کی۔ تمہیں لگتا ہے میں تمہیں یونہی چھوڑ دوں گی؟“

”یہ ہمایوں آپ کے کب سے ہو گئے آرزو باجی؟“



نام تک تو آپ ان کا جانتی نہیں تھیں۔ وہ بھی مجھ سے ہی پوچھا تھا۔

”اپنی چھوٹی سی عقل یہ زیادہ زور نہ دو محمل ڈیڑھ۔“ اس نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔ ”اور یاد رکھنا“ آرزو ایک دفعہ کسی کو چاہ لے تو اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتی ہے۔“

”کیوں؟ آرزو خدا ہے کیا؟“ اس کے اندر غصہ ابلا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنی ٹھوڑی تلے اس کی انگلی ہٹائی۔

”یہ تو تمہیں وقت بتائے گا کہ کون خدا ہے اور کون نہیں۔“ وہ مسخرانہ انداز میں کہتی مڑی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی اندر چلی گئی۔

”عجیب لڑکی ہے یہ، کسی کے شوہر پہ حق جمار ہی ہے۔ اونہ!“ وہ غم وغصے سے کھولتے ہوئے واپس اندر آ گئی۔

\*\*\*

”یہ تمہاری کزن آرزو۔ اس کے ساتھ کوئی دماغی مسئلہ ہے کیا؟“ واپسی پہ ڈرائیو کرتے ہوئے ہمایوں نے پوچھا تھا۔ وہ بری طرح چوکی۔

”کیوں؟ کچھ کہا اس نے؟“ اس کا دل ایک دم ڈر سا گیا۔

”ہاں عجیب سی باتیں کر رہی تھی۔“

”آپ کو کب ملی؟ لاؤنج میں تو آئی ہی نہیں۔“

”پتا نہیں، عجیب طریقے سے سب مردوں کے درمیان آ کر بیٹھ گئی اور مجھ سے بے درے درے سوالات شروع کر دیے۔ بہت اگورڈ لگ رہا تھا مگر اس کے باپ کو تو فرق ہی نہیں پڑا۔“

”پھر؟“ وہ دم بخودی سن رہی تھی۔

”پھر حسن کو برا لگا اور اس نے اسے جھڑکا کہ اندر جاؤ، بٹ شی وائز لائیک کہ میں تمہاری نوکر ہوں جو اندر جاؤں، عجیب سی سچویشن بن گئی تھی۔ میں تو فون کا ہمانہ کر کے اٹھ گیا واپس آیا تو وہ نہیں تھی۔ کوئی مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟“

”پتا نہیں۔“ وہ لب پکل کر رہ گئی۔

”ایک بات کہوں محمل!“

”ہوں، کہیے۔“

”تم یہ مت سمجھنا کہ میں لالچی ہوں مگر حق حق ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا وہ لوگ کس طرح تمہاری جائیداد پہ عیش کر رہے ہیں۔ تمہیں ان سے اپنا حصہ مانگنا چاہیے۔“

”رہنے دیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، ہمایوں شانے اچکا کر ڈرائیو کرنے لگا۔

وہ ہمایوں کو کیسے بتاتی کہ اس کے لیے وہ اپنا حق بہت پہلے ہی چھوڑ چکی ہے۔ اگر فرشتے نے چھپایا تو اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔

وہ اندر سے ایک دم ہی بہت افسردہ ہو گئی تھی۔ سو بیگ میں رکھا چھوٹا قرآن نکالا جس کے سفید کورپے ”م“ لکھا تھا۔

میں نے یہ ادھر کیوں لکھا ہے؟ وہ ہر دفعہ قرآن کھولنے پہ اپنا لکھا ”م“ پڑھ کر سوچتی اور پھر یاد نہ آنے پہ شانے اچکا کر آگے پڑھنے لگتی۔

اس نے صبح کی تلاوت پہ لگائے گئے بک مارک سے کھولا۔ سب سے اوپر لکھا تھا۔

”اور اس نے عطا کیا تم کو ہر اس چیز سے جو تم نے اس سے مانگی تھی۔ اور اگر تم شمار کرو اللہ کی نعمت کو، اسے تم شمار نہیں کر سکتے۔“ بے اختیار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کیوں مسکرا رہی ہو؟“ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے حیران ہوا تھا۔

”نہیں، کچھ نہیں۔“ اس کے دل کی تسلی ہو گئی تھی سو قرآن بند کر کے رکھنے لگی۔ اسے واقعی ہر وہ چیز مل گئی تھی جو کبھی اس نے مانگی تھی۔

”بتاؤ نا۔“

”اصل میں میرے لیے بڑی پیاری آیت اتاری تھی اللہ تعالیٰ نے وہی پڑھ کر ان پہ بہت پیار آیا تھا۔“ وہ سر جھٹک کر ہنس دیا۔

”نہے کیوں؟“

”کم آن محمل! اٹس آل ان یورمانڈ!“

”کیا؟“ وہ حیران ہوئی اور الجھی بھی۔

”محمل! وہ آیت تمہارے لیے نہیں تھی یہ الہامی کتاب ہے، اؤکے؟“ اتنا casually ٹرٹ مت کیا کرو اسے۔ یہ قرآن پاک ہے۔ اس میں نماز روزے کے احکام ہیں۔ اٹس ناٹ اباؤٹ یو۔“ اس نے موڑ کاٹا۔

کلی شاہراہ رات کے اس پہر سنسان پڑی تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”تم دیکھو محمل! ایک ہی تصویر کو ہر شخص اپنے ذلیلے سے دیکھتا ہے۔ مثلاً“ نقلا اس کی خامی ڈھونڈے گا، شاعر اس کے حسن میں کھوئے گا، سائنس دان کسی اور طرح سے اسے دیکھے گا۔ اٹس آل ان یورمانڈ۔“

”نہیں ہمایوں! قرآن میں وہی کچھ ہوتا ہے جو میں سوچتی ہوں۔“

”اس لیے کہ تم وہی پڑھنا چاہتی ہو۔ تمہیں ہر چیز اپنے سے ریلیٹڈ لگتی ہے کیونکہ تم اسے خود سے ریلیٹ کرنا چاہتی ہو۔ محمل! یہ سب تمہارے ذہن میں ہے یہ الہامی کتاب ہے، اس میں تمہارا ذکر نہیں ہے۔ رائی ٹوانڈر اسٹینڈ۔“

”لعنتا“ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے ڈیش بورڈ پہ رکھا موبائل اٹھایا، چمکتی اسکرین پہ نمبر دیکھا اور پھر نمبرن دبا کر کلن سے لگا لیا۔

”جی رانا صاحب۔۔۔“ وہ محو گفتگو تھا۔

محمل نے گم صم سی نگاہ گو میں سوئے تیور پہ ڈالی اور پھر ہاتھوں میں پکڑے قرآن کو دیکھا جس کو وہ ابھی بیگ میں رکھنے ہی لگی تھی۔ اسے لگا ہمایوں کی بات نے اس کی جان نکال لی تھی، روح کھینچ لی تھی۔ وہ لمحے بھر میں کھوکھلی ہو گئی۔ اس کا دل کھوکھلا ہو گیا، خیال کھوکھلا ہو گیا۔ امید کھوکھلی ہو گئی۔

تو کیا اتنا عرصہ وہ یہ سب تصور کرتی آئی تھی وہ وہی رہتی تھی جو وہ پڑھنا چاہتی تھی، اسے وہی دکھائی دیتا، اس کی خواہش ہوتی؟ وہ ہر چیز کا من چاہا مطلب

نکالتی تھی؟

اس کا دل جیسے پاتال میں گرنا گیا۔ ہمایوں ابھی تک فون پہ مصروف تھا مگر اسے اس کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ سب آوازیں جیسے بند ہو گئی تھیں۔ وہ گم صم سی ہاتھوں میں پکڑے قرآن کو دیکھے گئی، پھر درمیان سے کھول دیا۔ دو صفحے سامنے روشن ہو گئے۔ پہلے صفحے کے وسط میں لکھا تھا۔

”بے شک اس (قرآن) میں ذکر ہے تمہارا۔“ اس سے آگے پڑھانی نہ گیا۔ وہ جیسے پھر سے جی اٹھی تھی۔

ساری اداسی ویرانی ہوا ہو گئی۔ دل پھر سے متور ہو گیا۔ اب اسے کسی کا نظریہ یا رائے خود پہ مسلط نہیں کرنا تھی۔ اسے اس کا جواب نظر آ گیا تھا۔ دلیل مل گئی تھی۔

مسکراہٹ لبوں پہ بکھیرے اس نے احتیاط سے قرآن پاک سنبھال کر واپس بیگ میں رکھا اور زپ بند کی، پھر سر سیٹ کی پشت سے نکا کر آنکھیں میوند لیں۔ اسے ہمایوں سے کوئی بحث نہیں کرنا تھی۔ اسے کچھ نہیں سمجھنا تھا۔ وہ اسے سمجھائی نہیں سکتی تھی کہ اکثر لوگ نہیں جانتے، نہیں مانتے۔

\*\*\*

صبح نئی سی اتری تھی۔ چڑیاں چچھماتے ہوئے اپنی منزلوں کی طرف اڑ رہی تھیں۔ رات بارش کھل گئی برسی بھی، سوسڑک ابھی تک نم تھی۔ سیاہ بادل اب نیلی چادر سے قدرے سرک گئے تھے اور موسم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔

وہ گیٹ پار کر کے باہر نکلی تو درختوں کی باڑ کے ساتھ کاشف سائیکل دوڑاتا آ رہا تھا۔ وہ تیور کی پرامد دھکیلاتی سڑک پہ آگے بڑھنے لگی۔ اس کا رخ کاشف کی طرف تھا۔

”محمل باجی! السلام علیکم۔“ کاشف اسے دیکھ کر جھک اٹھا۔ تیزی سے سائیکل بھگاتا اس تک آیا۔ وہ کافی کے ان بچوں میں سے تھا جنہیں شام کو محمل



# NEW TOUCHME<sup>®</sup> Minto

Calcium+Fluoride Toothpaste

✓ کیلشیم اور فلورائیڈ سے دانت مضبوط

✓ Extra Whitening

دانتوں پر انوکھی چمک اور سفیدی

✓ مکمل Tartar کنٹرول

✓ ماتھ و لاش سے مہکتی سانس

صرف

Rs.15/-

Extra Whitening

چاہتی مگر یونی ایک دھڑکا سادل کو لگ گیا تھا۔ بس ایسے ہی اس کا دل گھبرا سا جاتا۔ وہ نیند میں ڈر جاتی۔ جانے کیا بات تھی۔

”دس روپے ہوئے لی بی۔“  
بوڑھے شخص کی آواز پہ وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر ہاتھ میں پکڑا پاؤچ کھولا۔ اندر پیسے اور چند کانٹہ بل وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے دس کانٹہ نکالنا چاہا تو ایک کانٹہ جو نوٹ کے اوپر اڑس کر رکھا گیا تھا، اڑ کر دور سڑک پہ جاگرا۔

”اوہ ایک منٹ۔“ وہ دس کانٹہ اس کے ہاتھ پہ رکھ کر تیمور کی پیرام وہیں چھوڑے، دوڑتی ہوئی گئی جہاں سڑک کے وسط میں وہ مڑا تر اس کا کانٹہ پڑا تھا۔ اس نے جھٹک کر کانٹہ اٹھایا اور اسے کھول کر بڑھا، پھر تحریر دیکھ کر مسکرا دی۔ اگلے ہی بل سامنے سڑک کے کونے سے آتی گاڑی کی آواز آئی۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ گاڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی، ایک ہی جست میں اڑ کر سڑک پار کرنا چاہتی تھی مگر موقع نہ ملا۔

تیز باران کی آواز تھی اور کوئی چیخ رہا تھا۔ اس کے پاؤں حرکت کرنے سے انکاری تھے۔ اس نے گاڑی کو خود سے ٹکراتے دیکھا، پھر اس نے خود کو پورے قد سے گرتے دیکھا، شور تھا۔ بہت شور اس نے اپنی چیخیں سنیں۔ اپنے سر سے نکل کر سڑک پر گرنا خون دیکھا، بہتا ہوا لال خون، بے حد لال۔

اس کی کلائی وہیں اس کے چہرے کے ساتھ بے دم سی گر گئی، اس نے ہاتھ کھول دیا۔ مڑا تر اس کا کانٹہ نکل کر سڑک پہ لڑھک گیا۔ اس نے ارد گرد لوگوں کو اکٹھے ہوتے دیکھا۔ کہیں دور کوئی بچہ رو رہا تھا۔ بہت اونچا اونچا حلق پھاڑ کر۔ دوسرے۔ بہت دوسرے۔

جو آخری بات اس کے ذہن نے سوچی تھی وہ یہ تھی کہ آج اس نے صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔

اپنے گھر جمع کر کے ناظرہ پڑھاتی تھی۔  
”وعلیکم السلام۔ صبح ہی صبح کدھر جا رہے ہو کاشف۔“  
وہ رک گئی تھی۔

”ہمارے اسکول کی چھٹیاں ہو گئی ہیں نا تو صبح فارغ ہوتا ہوں۔“ اس نے اپنی الٹی پی کیپ سیدھی کی۔  
اب وہ سائیکل روک کر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

”حنان اور راحم وغیرہ کی بھی؟“  
”جی ہاں سب کا آف ہو گیا ہے۔“  
”تو پھر یوں نہیں کریں کہ آئندہ فجر کے بعد کلاس رکھ لیں؟“

”ہاں جی! میں تو آجائوں مگر راحم وغیرہ۔“ اس نے متذہب سے اپنے ہمسائے کا نام لیا۔  
”وہ نہیں آئیں گے؟“

”آپ ان سے خود ہی پوچھ لیجئے گا۔“  
کاشف بائیک دوڑاتا دور نکل گیا۔  
اس کا ارادہ سامنے مدرسہ جانے کا تھا، مگر پھر ٹکڑپ چھلی والا نظر آ گیا۔

بارش کے بعد کا ٹھنڈا سہانا موسم اور بھنے ہوئے دانے۔ وہ رہ نہ سکی اور پیرام دھکیلتی ٹکڑپ کھڑی ریڑھی کی طرف بڑھ گئی۔

سڑک سنسان پڑی تھی۔ چھلی والا بھی خاموشی سے سر جھکائے ریت گرم کر رہا تھا۔ وہ پیرام دھکیلتی آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ اسے یاد آیا اس نے آج صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔ حالانکہ وہ روز پابندی سے صبح و شام کی دعائیں پڑھتی تھی مگر آج جانے کیسے رہ گئیں۔ وہ ہولے ہولے تسبیح پڑھنے لگی۔ تب ہی فاصلہ سمٹ گیا اور وہ ریڑھی کے پاس آن پہنچی تو دھیان ہٹ گیا۔

”ایک چھلی بنا دو“ اور ساتھ میں پانچ روپے کے دانے بھی اور مسالہ بھی ذرا زیادہ ہو۔“ اس کی تسبیح اودھوری رہ گئی، بوڑھا چھلی والا سر ہلا کر چھلی بھوننے لگا۔  
وہ محویت سے اسے بھونتے دیکھنے لگی۔

ذہن کے کسی گوشے میں اس روز آرزو کی کمی گئی باتیں گونجنے لگیں۔ وہ بار بار انہیں ذہن سے جھٹکنا



اس کا ذہن گھپ اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ تاریکی۔ سیاہ کالی مہیب سی تاریکی بنا رنگ کے بنا شور کے خاموش سی تاریکی۔ اندھیرے پہ اندھیرا پروے پہ پردہ۔

اس کا ذہن زبان و مکان کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ پانی پہ بہہ رہا تھا۔ بادلوں پہ تیر رہا تھا۔

زمین اور آسمان کے درمیان نہ اوپر نہ نیچے ہوا کے بیچ کہیں متعلق کہیں درمیان میں کسی تیرتے بادل پہ۔

پھر آہستہ آہستہ تیرتے بادل کو قرار آیا۔ ذرا سا جھکا لگا اور بادل کسی بلبلے کی طرح پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اور ہر طرف روشنی بھرنی گئی تیز پیلی روشنی۔ اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں۔ دھندلا سا ایک منظر سامنے تھا۔ سفید دیواریں، سفید چھت، چھت سے لٹکتا پنکھا، اس کے تین پر تھے، ہولے ہولے وہ ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔ دائرے، دائرے بار بار دائرے۔

وہ کتنی ہی دیر تک ٹپک چھت کو دیکھے گئی۔ وہ کون تھی؟ کدھر تھی؟ کیوں تھی؟ وہ خالی خالی نگاہوں سے چھت کو تکتی رہی۔ پھر کا ایک ادھر ادھر دیکھنا چاہا۔

ارد گرد سفید دیواریں تھیں۔ قریب ہی ایک کاؤچ رکھا تھا۔ تپائی پہ سوئے پھولوں کا گلدستہ سجا تھا۔ اس نے کمبلیوں کے بل اٹھنا چاہا، مگر جسم جیسے بے جان سا ہو گیا تھا یا شاید وہ بے حد تھک چکی تھی۔ اس نے کوشش ترک کر دی اور اپنے بازوؤں کو دیکھا جن میں بے شمار نالیاں سی پیوست تھیں۔ ہرنالی کسی نہ کسی مشین کے سرے پہ جا رہی تھی۔ وہ شاید اسپتال کا کمرہ تھا اور وہ خود شاید۔ بلکہ "تمہارا" حمل ابراہیم تھی۔

خود کو کیسے بھولا جاسکتا ہے بھلا؟ آہستہ آہستہ ساری یادداشتیں ذہن کے ہر گوشے سے ابھرنے لگیں۔ ایک ایک بات، ایک ایک چہرہ اسے یاد آتا گیا۔ تھک کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ آخری بات بھلا کیا ہوئی تھی؟ کس چیز نے اسے ادھر اسپتال پہنچایا؟ شاید کوئی ایکسیڈنٹ؟ اور اسے دھیرے

دھیرے یاد آتا گیا۔ وہ مجھ لینے سڑک کے اس پار گئی تھی۔ اس کے ساتھ کاشف بھی تھا۔ وہ سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہی ہوا تھا کہ وہ ریڑھی والے کے پاس چلی گئی۔ پھر پھر کھ ہوا تھا۔ اسے ٹکر لگی تھی۔ خون۔ بکھرے کانڈرہ ناچا۔

"بچہ؟" اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ ادھر اکیلی تھی۔ مگر وہ یوں تھکتی تھی کہ وہ آواز جو اسے آخری بل تک سنائی دی تھی؟ یہ وہ تیسرے تیسرے رہا تھا۔ ہاں اسے یاد تھا کہ اس

اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، اسی بل دروازہ کھلا۔

سفید یونیفارم میں ملبوس نرس اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بڑے بڑے تیزی سے بڑے بڑے بیڈ کی طرف بڑھی، پھر اسے بائیں طرف دیکھ کر ٹھکی۔

"اوپر شکرے آپ کو ہوش آگیا؟" وہ حیران سی کہتی اس کے قریب آئی۔ تب ہی کھلے دروازے میں

ایک بچہ نظر آیا۔ "چھ سات برس کا، خوب صورت سا بچہ، شاید وہ کاشف کا ہمسایہ، راحم تھا۔ ہاں وہ راحم ہی تھا یا شاید راحم کا چھوٹا بھائی، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔

"آریو آل رائٹ؟" نرس نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو چھوا، پھر حیرت سے پوچھا۔ وہ بنا جواب دیے بچے کا چہرہ دیکھتی رہی، جو عجیب انسہاک سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ شاید وہ لڑکا تھا جس کو وہ شام میں ناظرہ پڑھائی تھی۔

"ہم آپ کی سسٹر کو بلاتا ہے ابھی۔" نرس خوشی سے چمکتی باہر کو بھاگی۔ وہ ابھی تک بچے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، جن میں عجیب سی کوفت تھی اور تنہی پیشانی پہ ذرا سے بل، وہ اس کو عجیب متغیر بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا کاؤچ پہ آ بیٹھا اور کہنیاں گھنٹوں پہ رکھ کر دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ گرا دیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"راحم!" اس نے پکارا تو اسے اپنی آواز بہت ہلکی

ہلکی سی سنائی دی۔ بچہ اسی طرح سے دیکھتا رہا۔ "راحم!" اس نے پھر آواز دی۔ وہ بمشکل بول پاری تھی۔

"میں سنی ہوں۔" پھر لمبے بھر کو رُک کر عجیب سے فکرت سے بولا۔ "آئی ڈونٹ لائیگ یو۔" (تم مجھے اچھی نہیں لگتی)

"سنی؟" وہ دنگ رہ گئی، اس بچے کو وہ روز ناظرہ پڑھاتی تھی، وہ شاید راحم کا چھوٹا بھائی تھا۔ پھر وہ ایسے بات کیوں کر رہا تھا؟

اسی بل دروازہ زور سے کھلا۔ حمل نے چونک کر دیکھا۔

دروازے میں فرشتے کھڑی تھی۔ سیاہ علبایا پہ سیاہ جاب چرے کے گرد لپیٹے ہوئے بے یقینی سے ہستہ پستی حمل کو دیکھ رہی تھی۔

"فرشتے؟" وہ اپنی جگہ جلد رہ گئی۔ فرشتے تو باہر تھے، پاکستان کب آئی؟

"میرے اللہ! حمل! اس نے بے اختیار اپنے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ کتنے ہی بل وہ بے یقینی سی کھڑی رہی، اس کا چہرہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔

"حمل! حمل!" ایک دم آگے بڑھ کر اس نے برقراری سے اس کا چہرہ چھوا۔

"تم مجھے دیکھ سکتی ہو حمل؟ تم مجھے پہچانتی ہو؟ تم بول سکتی ہو؟"

"میں تمہیں کیوں نہیں پہچانوں گی فرشتے؟ تم کب آئیں؟"

"میں؟" فرشتے متعجب۔ نظروں سے اسے ٹک رہی تھی۔ میں تو مجھے تو کافی وقت ہو گیا حمل! تم میں نے تم سے اتنی باتیں کیں، تم نے، تم نے سنا؟"

"کیا؟" وہ الجھ سی گئی۔ "نہیں، میں نے تو کوئی بات نہیں سنی، میں تو... وہ رُک رُک کر، آنک، آنک کر پوئلہاں گئی۔ "میں تو صبح ریڑھی والے کے پاس گئی تھی۔

مجھے گاڑی نے ٹکر مار دی، اور، اور تم نے بتایا بھی نہیں کہ تم آ رہی ہو؟" فرشتے بے یقینی سے پھلی آنکھوں سے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کے پاس کونے کو کچھ بھی نہ ہو۔

"فرشتے! بولو۔" اسے فرشتے کی یہ حیرت و بے یقینی پریشان کر رہی تھی، کہیں کچھ غلط تھا۔ "حمل تم؟" وہ کچھ کتے کتے پھر رُک گئی، جیسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔

"یو اینڈ یو اور ایکٹنگ! ہونہ۔" وہ چھوٹا لڑکا بے زاری کہہ اٹھا تھا۔ فرشتے نے چونک کر اسے دیکھا۔

سیاہ حجاب میں دکتے فرشتے کے چہرے پہ ہلکی سی ناگواری ابھری۔

"سنی پلیز بیٹا! جا دیساں سے مجھے بات کرنے دو۔" "میں کیوں جاؤں؟ میری مرضی، آپ دونوں چلی جاؤں۔"

"فرشتے! یہ کون ہے؟ کیوں ضد کر رہا ہے؟" وہ الجھ کر پوچھ رہی تھی، مگر فرشتے دوسری طرف متوجہ تھی۔ "آئی ڈونٹ وائٹ لوگو۔" وہ بد تمیزی سے چیخا تھا۔

"شٹ اپ تیمور! اینڈ گیٹ آؤٹ، تم دیکھ نہیں رہے میں ماما سے بات کر رہی ہوں۔"

فرشتے کہہ رہی تھی اور اسے لگا کسی نے اس کے اوپر ڈھیروں پتھر لڑھکا دیے ہوں۔

"تم نے۔ تم نے تیمور کہا فرشتے؟" وہ ساکت رہ گئی تھی۔

"ہا! اشی ازناٹ مائی نام!" وہ سر جھٹکتا اٹھ کر باہر گیا اور اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔

"تم نے تیمور کہا؟ نہیں، یہ تیمور نہیں۔ میرا تیمور کہاں ہے؟" اس کا دل بند ہو رہا ہے، کہیں کچھ غلط تھا، کہیں کچھ بہت غلط تھا۔

فرشتے نے آہستہ سے گردن اس کی طرف موڑی۔



اس کی سنہری آنکھوں میں گلابی سی نمی ابھرائی تھی۔  
”محمل! تمہیں کچھ یاد نہیں؟“

”کیا۔ کیا یاد نہیں؟ میرا بچہ کہاں ہے؟“ وہ گھٹی گھٹی سی سسک اٹھی۔ کچھ تھا جو اس کا دل ہولارہا تھا۔  
”محمل۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گال پہ لڑکنے لگے، بے اختیار اس نے محمل کے ہاتھ تھام لکے۔ ”تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔“

”فرشتے میں پوچھ رہی ہوں کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟“  
”تمہارے سر پہ چوٹ آئی تھی، تمہارا اسپاٹل کارڈ بچ ہوا تھا۔“

”فرشتے! میرا بچہ۔“ اس کی آواز ٹوٹ گئی۔ وہ بے قراری سے فرشتے کی بیگی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔  
”محمل۔ محمل! تم بے ہوش ہو گئی تھیں، تم کوما میں چلی گئی تھیں۔“

”مجھے بتا ہے، صبح میرا ایکسیڈنٹ۔“  
”وہ صبح نہیں تھا۔ وہ سات سال پہلے تھا۔“  
وہ سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

”وقت سات سال آگے بڑھ گیا ہے۔ تمہیں کچھ یاد نہیں؟ وہ ساری باتیں جو میں اتنے برس تم سے کہتی رہی؟ وہ دن؟ وہ راتیں جو میں نے ابھر تمہارے ساتھ گزاریں، تمہیں کچھ یاد نہیں؟“

وہ پتھر کا بت بن گئی تھی۔ فرشتے کو لگا وہ اس کی بات نہیں سن رہی۔

”ڈاکٹرز کہتے تھے۔ تم کبھی بھی ہوش میں آ سکتی ہو۔ تم نے بہت دیر کیا تمہارا محمل، بہت زیادہ۔“  
آنسو متواتر اس کے دیکتے چہرے پر گر رہے تھے۔  
وہ گم صم سی اسے دیکھے گئی۔ گویا وہ وہاں تھی ہی نہیں۔

”میں نے تمہارے اٹھ جانے کی بہت دعائیں کیں محمل! میں نے اپنا پی ایچ ڈی بھی چھوڑ دیا، تمہارے ایکسیڈنٹ کے دوسرے مہینے میں آگئی تھی، دو ماہ رہی، پھر واپس گئی، مگر دل ہی نہیں لگ سکا۔ میں پڑھ ہی نہیں سکی، پھر میں نے سب بڑھائی چھوڑ دی اور تمہارے پاس آگئی۔ اتنے برس محمل، اتنے

برس گزر گئے، تمہیں کچھ بھی یاد نہیں؟ محمل۔“  
فرشتے نے ہولے سے اس پتھر کے مجسمے کا شان ہلایا۔ وہ ذرا سی چونکی، پھر اس کے لب کپکپائے۔  
”میرا۔ میرا تیمور؟“

”یہ تیمور تھا ناسی، ہم اسے سنی کہتے ہیں۔“  
مگر وہ کیسے مانتی؟ وہ جسے کوئی کاٹنی کا بچہ بھی تھی وہ اس کا اپنا بچہ تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ اسے تو لگا تھا کہ وہ بس ایک دن کے لیے سوئی ہے یا پھر شاید دن کا ایک حصہ۔ پھر صدیاں کیسے بیت گئیں؟ اسے کیوں نہیں بتا چلا؟ اور تیمور۔ نہیں۔

اسے کٹ میں لیٹا اپنا نو مولود بچہ یاد آیا۔  
”فرشتے! وہ میرا بچہ ہے۔ اور خدا یا۔“ اس نے بے یقینی سے آنکھیں موند کر کھولیں۔ ”وہ اتنا بدل گیا ہے؟“

”بہت کچھ بدل گیا ہے محمل! کیونکہ وقت بدل گیا ہے۔“  
”وقت ہر شے پر اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے۔“  
”ہمایوں؟“ اس کے لب پھر پھڑکے۔ ”ہمایوں کہاں ہے؟“

”نرس نے جب بتایا تو میں نے اسے کل کر دیا تھا۔ مگر۔“ وہ لمحے بھر کو چپک چپک پالی۔ ”وہ مینٹلک میں تھا، رات تک آسکے گا۔“

”نہیں فرشتے، تم اس کو بلاؤ، پلیز بلاؤ، اس سے کہو، محمل جاگ گئی ہے۔ محمل اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ میرے ایک فون پر ہی دوڑ آتا تھا۔“

”وہ سات سال پہلے کی بات تھی محمل! وقت کے ساتھ یہاں بہت کچھ بدلتا ہے، لوگ بھی بدل جاتے ہیں۔“

”وہ کیوں نہیں آیا؟“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔ عجیب بے یقینی سی، بے یقینی تھی۔  
”محمل! پریشان مت ہو۔ پلیز دیکھو۔“

وقت ہمایوں کو نہیں بدل سکا۔ میرا ہمایوں ایسا نہیں ہے، میرا تیمور ایسا نہیں ہے۔  
وہ ہڈیانی انداز سے چلائی۔ اتنی بے یقینی تھی کہ اسے رونا بھی نہیں آ رہا تھا۔

فرشتے تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔  
ابھی اسے سنبھلنے میں وقت لگے گا، وہ جانتی تھی۔

فرشتے چلی گئی اور وہ منہ پہ چادر ڈالے آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ اسے یقین نہ تھا کہ فرشتے نے اس سے سچ بولا ہے، اسے لگ رہا تھا کہ یہ سب ایک بھیانک خواب ہے اور ابھی وہ آنکھ کھولے گی تو وہ خواب ٹوٹ جائے گا۔

پھر اس نے آنکھ ہی نہ کھولی، اسے ڈر تھا کہ اگر خواب نہ ٹوٹا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔  
جانے کتنا وقت گزرا، وہ لچوں کا حساب نہ رکھ پالی۔ اور اب کون سے حساب باقی رہ گئے تھے؟  
دروازے۔ ہولے سے دستک ہوئی۔ اس نے لمحے

بھر کو آنکھیں کھولیں۔ ہوا سے چہرے پہ پڑی چادر سرک گئی تھی، منظر صاف واضح تھا۔  
کھلے دروازے کے سچے کھڑا تھا۔

اس کی نگاہیں وہیں کھرسی گئیں۔ وقت تھم گیا، لمحے ساکن ہو گئے۔ وہ اسے ویسا ہی لگا تھا، اتنا ہی وجہ اور شان دار، مگر اس کا جذبات سے عاری چہرہ اس پر چھائی سنجیدگی نہیں، وہ شاید ویسا نہیں رہا تھا۔  
وہ آہستہ سے قدم اٹھا تابیڈ کے قریب آیا اور پائنتی کے ساتھ رک گیا۔

”ہمایوں!“ تڑپ کر رہ گئی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”ہوں، کیسی ہو؟“ وہ پائنتی کے قریب کھڑا رہا، اس سے آگے نہیں بڑھا، آواز میں بھی عجیب سرد مہری تھی۔

”ہمایوں!“ وہ رونے لگی تھی۔ ”یہ سب کیا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ اتنے سال گزر گئے، میری نیند اتنی لمبی کیوں ہو گئی؟“

”معلوم نہیں۔ ڈاکٹرز کب تمہیں ڈسچارج کریں گے؟“ وہ کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ جیسے جانے کی جلدی ہو، اس کے لمحے میں کوئی ناراضی کا عنصر نہ

تھا، بلکہ بہت ہموار لہجہ تھا۔ لیکن شاید ان کے درمیان کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔  
”میں ٹھیک ہو جاؤں گی نا ہمایوں؟“ جیسے وہ تسلی کے دو بول سننا چاہی تھی۔

”ہوں۔“ وہ اب جیوں میں ہاتھ ڈالے تنقیدی نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔  
یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ ہمایوں۔ اور تیمور۔ وہ اس کے ساتھ یوں کیوں کر رہے تھے؟  
”ہمایوں۔ مجھ سے بات تو کریں۔“

”ہاں، کہو، میں سن رہا ہوں۔“ وہ متوجہ ہوا، لمحے بھر کو نگاہ اس پہ جھکا لی۔

اس کے آنسو ختم گئے۔ وہ بالکل جب ہو کر رہ گئی۔ یہ تو محبت کی نگاہ نہ تھی، یہ تو خیرات تھی، ٹھیک تھی۔  
وہ چند لمحے منتظر سا اسے دیکھتا رہا، پھر واپس جانے کو مڑا۔

اسی بل دروازے میں فرشتے کا سر ہلکا ابھرا۔ وہ ہاتھ میں فروٹ باسکٹ پکڑے تیزی سے اندر آ رہی تھی۔  
ہمایوں اس کے ایک طرف سے نکل کر باہر چلا گیا۔  
فرشتے نے پلٹ کر اسے جاتے دیکھا۔

”ہمایوں ابھی تو آیا تھا؟ چلا بھی گیا؟ کیا کہہ رہا تھا؟“  
اچھے سے کہتے ہوئے اس نے گردن اس کی جانب موڑی۔ محمل کے چہرے پہ کچھ تھا کہ وہ لمحے بھر کو چپ سی ہو گئی۔

”فکر مت کرو، وہ ہر کسی سے ایسے ہی بیہوش کرتا ہے۔“ وہ ماحول کو خوش گوار کرنے کے لیے کہتی آگے بڑھی اور فروٹ باسکٹ سائیڈ ٹیبل پہ رکھی۔

”مگر میں کسی تو نہیں تھی فرشتے۔“ وہ ابھی تک غم آنکھوں سے کھلے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔  
”ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ، تم کیوں فکر کرتی ہو؟“

”مگر وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا؟“ اس کی آنکھیں پھر سے ڈیڈ بائیں۔

”محمل دیکھو، اس تبدیلی نے وقت لیا ہے، تو اس کو ٹھیک ہونے میں بھی وقت لگے گا۔ تم اس کو کچھ وقت



دو۔ ”وہ اس کے ریشمی بھورے بال نرمی سے ہاتھ میں پکڑے برش کر رہی تھی۔

وقت، وقت، وقت۔ وہ ایک ہی تکرار ہر جگہ دہرائی جا رہی تھی۔ اس وقت نے کیا کچھ بدل دیا تھا اسے اس کا اندازہ آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔

وہ اپنے نچلے دھڑ کو حرکت نہیں دے سکتی تھی وہ اپنے پاؤں نہیں ہلا سکتی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ خود کرنا نہیں کھا سکتی تھی۔ اپنے پاؤں پہ کھڑی ہونے کے قابل نہیں رہی تھی۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔

”اس دن اس دن جب میں گھر سے نکلی تھی تو میں نے صبح کی دعائیں نہیں پڑھی تھیں۔ یہ سب اسی لیے ہوا ہے فرشتے کہ میں دعا پڑھے بغیر گھر سے نکلی تھی۔“ وہ نرمی سے اس کے بال سمجھا رہی تھی جب وہ بچکی آنکھوں اور رندھے گلے سے کہنے لگی۔ فرشتے نے گہری سانس لی کہا کچھ نہیں۔

”نہ تھا کہ اس کو اللہ سے کام آتا کچھ بھی، مگر ایک حاجت تھی یعقوب علیہ السلام کے دل میں تو اس نے اسے پورا کیا۔“ بہت دیر سے اس کے دل میں کسی نے سرگوشی کی تھی۔ وہ لکھت چوٹک سی گئی۔ ”نہ تھا کہ اس کو اللہ سے کام آتا کچھ بھی، مگر ایک حاجت تھی۔“ تب علیہ السلام کے دل میں تو اس نے اسے پورا کیا۔“

اس نے سننے کی کوشش کی۔ کوئی اس کے اندر مسلسل یہ الفاظ دہرا رہا تھا۔ دھیمی دھڑ آواز، ترنم اور سوز سے بھر۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ایک دم سنائے میں آگئی۔

یہ الفاظ یہ بات یہ سب بہت جانا پہچانا تھا۔ شاید یہ ایک آیت تھی۔

ہاں یہ آیت تھی، ”سورة يوسف“ تیرہواں سارہ جب یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو غالباً ”نظر بد“ سے بچاؤ کے لیے احتیاطاً ”شیر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونے کی تاکید کی تھی تو اس نے اللہ تعالیٰ نے جیسے تبصرہ کیا تھا کہ ان بھائیوں کو اگر اللہ کی مرضی و منشا ہوتی تو پھر اللہ کے فیصلے سے کوئی بھی نہ بچا پاتا، مگر

وہ احتیاط تو یعقوب علیہ السلام کے دل کی ایک حاجت تھی تو یہ تعجب علیہ السلام نے اسے پورا کیا۔

ایک خاموش لمحے میں اس پہ کچھ آشکار ہوا تھا۔ یہ جو ہوا تھا اسے ایسے ہی ہونا تھا۔ وہ جو کر لیتی یہ اللہ کی مرضی تھی ہو کر رہی تھی یہ اس کی تقدیر تھی شاید اس کی دعاؤں نے اسے کسی بڑے نقصان سے بچالیا ہو، مگر کیا اس سے بھی کوئی بڑا نقصان ہو سکتا تھا؟ گویا معذوری، بیزار شوہر، بدگمتا ہوا بچہ۔ اب کیا رہ گیا تھا زندگی میں۔

”کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو!“

کسی نے پھر اس کو ذرا خفگی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ پھر سے چوٹکی اور قدرے مضطرب ہوئی۔ یہ کون اسے بار بار اندر ہی اندر مخاطب کرتا تھا یہ کون تھا؟ ”فرشتے“ پلیز مجھے کچھ دیر کے لیے پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ بہت بے بسی سے بولی تو فرشتے کا اس کے بالوں میں برش کرتا ہاتھ رک گیا۔ پھر اس نے جیسے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

”اوکے۔“ اس نے برش سائیڈ پہ رکھا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔

”ہم نے بسا اتم کو زمین میں اور ہم نے تمہارے لیے اس میں زندگی کے سامان بنائے، کتنا کم تم شکر ادا کرتے ہو۔“ (سورة اعراف)

کوئی اس کے اندر ہی اندر اسے جھنجھوڑ رہا تھا، پکار رہا تھا۔ اس کے اندر یا ہر اتنا شور تھا کہ وہ سن نہ پا رہی تھی، سمجھ نہ پا رہی تھی، فرشتے گئی تو اس نے آنکھیں موند لیں۔

اب اس کے ہر سواند ہیرا تر آیا، خاموشی اور تنہائی اس نے غور سے سننا چاہا، چند ملی جلی آوازیں بار بار گونج رہی تھیں۔

”ہم تم میں سے ہر ایک کو آزمائیں گے، شر کے ساتھ اور خیر کے ساتھ۔“

”کہہ دو، بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے، جو رب ہے تمام جہانوں کا۔“

اس کے ذہن میں جیسے جھماکا سا ہوا، ایک دم اندر باہر روشنی بکھرتی گئی، اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

”میرا قرآن۔ میرا کلام پاک، میرا مصحف۔“ وہ کبھی قرآن کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اس روز بھی وہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ بلکہ بیگ میں رکھا تھا۔ جب وہ ایک سیڈنٹ کے بعد ادھر لائی گئی ہوگی تو یقیناً وہ بھی ساتھ آیا ہوگا، پھر اسے ادھر ہونا چاہیے۔

مگر سات سال اسے یاد آیا، وہ سات سال درمیان میں آگئے تھے۔ ان کے پیچھے تو ہر شے گویا دھول میں گم ہو گئی تھی۔ ”اوہ خدایا، وہ کیا کرے۔“

اس نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔ یہ ایسی عجیب سی بات تھی جس سے اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ وہ جتنا سوچتی اور الجھتی جاتی۔

تب ہی دروازہ ہولے سے کھلا، اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

تیمور دروازے میں ایستادہ تھا، جینز شرٹ پہنے اس کے بھورے بال ماتھے پہ کٹ کر گر رہے تھے۔ اس کی ناک بالکل ہالوں کی طرح تھی، کھڑکی، مغرور ناک اور آنکھیں محمل کی سی مسنری جھکتے کانچ جیسی۔

اور ماتھے کے وہ بل، وہ جانے کس جیسے تھے! ”تیمور۔“ اس کو دیکھ کر محمل کی آنکھیں جھمکا اٹھی تھیں۔ وہ اس کا بیٹا تھا۔ اس کا تیمور تھا۔

”ادھر آ بیٹا۔“

”وہیر از بائی ڈیڈ؟“ (میرے ڈیڈ کہاں ہیں؟) کوہ اسی تنفر سے جھجھکتے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ منہ پھٹ، اکھڑد تمیز، اگر وہ اس کی ماں نہ ہوتی تو یہ تین الفاظ اس کے ذہن میں اس کے متعلق فوراً ابھرتے۔

”وہ ابھی آئے تھے، پھر چلے گئے۔ تم ملنا سے نہیں ملو گے؟“ اس نے ممتا سے مجبور اپنے بازو پھیلائے۔ ”نہیں۔“ اس نے باہر نکل کر زور سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ سن ہو کر رہ گئی۔ بازو آہستہ سے پہلو میں آن کرے۔

یہ سات سال کا بچہ۔ اس کے دل میں اتنی نفرت، اتنی کڑواہٹ کیسے آگئی؟ کیا تصور تھا اس کا کہ وہ یوں اس سے متنفر تھا؟ اور صرف اس سے نہیں، بلکہ فرشتے سے بھی۔

بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اور پھر وہ کب روتے سو گئی اسے پتا بھی نہ چلا۔



فریو تھراپسٹ اسے ایسر سائز کرنے کی ناکام کوشش کر کے چاچکی تھی۔ وہ اسی طرح دنیا سے بیزار آنکھوں پہ بازو رکھے لپٹی تھی۔ یہ دایاں بازو تو بالکل ٹھیک کام کرتا تھا۔ بایاں البتہ ذرا سا ڈھیلا تھا، مگر امید تھی کہ وہ بھی جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ناگوں کے متعلق کچھ کہنے سے ڈاکٹر ز ابھی قاصر تھے۔ کبھی وہ کہتے کہ فریو تھراپی سے آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی اور بعض اوقات وہ اس سب کا انحصار اس کی اپنی قوت ارادی پہ گردانتے۔ وہ قوت ارادی جس کو استعمال کرنے کی سعی ابھی وہ نہیں کر رہی تھی۔

ایک دم سے پھولوں کی محک منتھوں سے ٹکرائی تو اس نے دھیرے سے بازو ہٹایا اور آنکھیں کھولیں۔ فرشتے بڑا سا مہکتے سرخ گلابوں کا بو کے لیے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے سیاہ اسکارف میں مقید چہرے پہ وہی مخصوص ٹھنڈی سی مسکراہٹ تھی۔

”السلام علیکم مائی سسر! کیسی ہو اور یہ فریو تھراپسٹ کو کیوں تم نے بھگا دیا؟“ وہ کانچ کے گل دان میں گلدستہ لگاتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے کسی فریو کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں، یہ لوگ مجھے گھریں نہیں جانے دے رہے؟“

”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے، وہ کہہ رہے ہیں کہ تمہیں عنقریب گھر شفٹ کر دیں گے۔“ شاید ایک ہفتے تک تمہیں ملنی بالکل ٹھیک ہو اور تمہیں مزید اسپتال میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ پھول سیٹ کر کے شاپر سے کچھ اور نکالنے لگی۔





## MEDICAM SHAMPOO

MEDICAM  
SHAMPOO

COMPLETE TREATMENT  
FOR HAIR

Dr. Shikha

AMLA, RETHA, SHIKAKAI  
+ CONDITIONER

NEW International  
Packaging

بالوں کو سنواریں اب نئے انداز سے

وہی ہے جسے آپ نے دیکھا ہے کی خوبیوں کے ساتھ

بالوں کی بہتر نشوونما کو یقینی بنائے بال لبے، گھنے، چمکدار نظر آئیں۔۔۔

وہ یہ آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ قاری  
مشاری کی سورۃ الکہف -

”وہ رہنے والے ہیں اس میں ہمیشہ ہمیشہ اور ڈرائے  
ان لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔“  
لفظ بوند بوند اس کی سماعت میں اتر رہے تھے۔ آج  
جمعہ تھا اور وہ ہمیشہ جتنے کو سورۃ کھف پڑھا کرتی تھی۔

”نہ ان کے پاس اس کا کوئی علم ہے اور نہ ہی ان  
کے آباؤ اجداد کے پاس ہے۔ ان کے منہ سے یہ بہت  
بڑی بات نکلتی ہے وہ جھوٹ کے سوا کچھ نہیں کہتے۔“  
کھٹ سے فرشتے نے اسٹاپ کاٹیں دیا تو آواز رک  
گئی اس نے تڑپ کر فرشتے کو دیکھا۔  
”نگاہیں نہ بند کیوں کر دی؟“

”اے تم جاگ رہی تھیں۔“ وہ چونک کر بٹٹی۔ ”میں  
سجھی۔ تم سو گئی ہو میں نے سوچا تمہیں تنگ نہ  
کر دوں۔“

”کوئی قاری مشاری کی سورۃ کھف سے بھی تنگ  
ہو سکتا ہے بھلا؟ اس میں تو میری جان مقید ہے فرشتے  
آپ کو یاد ہے جب جمعے کو کلاس میں سورۃ کھف  
شروع ہوئی تھی تو الحمد للہ الذی“ ہی پہ میرے آنسو  
گرنے لگتے تھے۔

”تمہارے آنسو اب بھی گر رہے ہیں محمل!“ وہ  
آہستہ سے اس کے قریب آن بیٹھی اور اس کے دونوں  
ہاتھ تھام لیے۔  
محمل کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم تیمور اور ہمایوں کی وجہ سے  
آپ سیٹ ہو۔ بھول جاؤ ان کی باتداریاں محمل! وہ  
نا سمجھ ہیں ان کی وجہ سے اپنا چین سکون برباد نہ کر دو  
وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائیں گے مگر ایک بات  
تمہیں ذہن میں بٹھالینا چاہیے کہ تمہاری زندگی ان  
انحصار نہیں کرتی تم ان کے بغیر نہیں مر جاؤ گی ان  
کے بغیر جینا سیکھو محمل! خود کو اسٹراٹک کر دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ”مگر  
ابھی آپ سورۃ کھف لگا میں نا پلیز مجھے سننا ہے۔“  
فرشتے ذرا سی حیران ہوئی پھر گہری سانس لے کر

”اور تیمور نہیں آیا؟“

”اسے آتا تھا کیا؟“ اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔  
”ہاں میں اسے روز ساتھ ہی لائی ہوں پتا نہیں  
شاید لان میں بیٹھا ہو ابھی آجائے گا۔“ وہ کہہ کر خود  
ہی شرمندہ ہوئی۔

محمل نے پھر سے چہرے پہ بازو رکھ لیا۔ وہ اب یوں  
ہی ساری دنیا سے چھٹ جانا چاہتی تھی۔

فرشتے روز صبح آتی تھی۔ پھر وہ پہر میں چلی جاتی اور  
گھنٹے بھر بعد تیمور کو ساتھ لیے آتی۔ وہ باہر ہی پھرتا  
رہتا اندر نہ آتا پھر عصر کے وقت فرشتے چلی جاتی  
غالبا اسے مسجد جانا ہوتا تھا رات کو وہ پھر ایک چکر  
لگاتی۔ چھٹی کے دن وہ تیمور کو صبح سے ہی ساتھ لے  
آتی اور باقی دنوں میں اس کے اسکول کے باعث وہ پھر  
میں آتی اس رات کو تیمور اس کے ساتھ نہیں آتا تھا۔  
اور ہمایوں وہ تو بس ایک ہی دفعہ آیا تھا۔ پھر اس  
کے بعد ہمیشہ وہ شاید بڑی ہو گا والا جواب فرشتے خوب  
شرمندہ ہو کر دیتی۔

وہ دن میں تین تین چکر لگاتی گھبرا گھبرا چکر رہتی  
رہتی۔ محمل کا ہر چھوٹا بڑا کام کرتی اور نہیں تو اس کے  
ساتھ بیٹھی سلی اور بہار کی باتیں کرتی رہتی۔ اب بھی  
وہ جانے کیا چیز الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ محمل کو کھٹ  
کھٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ مکروہ یوں ہی بیزار سی  
منہ پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔ اور پھر آہستہ سے وہ مترنم  
آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔

”سب تعریف اس اللہ کی وہ ذات جس نے اپنے  
بندے پہ کتاب اتاری اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں  
بنایا۔“

اس نے جھٹکے سے بازو ہٹایا۔

فرشتے ٹیپ ریکارڈر سیٹ کر کے ہاتھ میں پکڑے  
کیسٹ کو بند کر رہی تھی۔ محمل کی طرف اس کی  
پشت تھی۔ ”درست کرنے والی“ (کتاب) تاکہ وہ  
اپنے پاس موجود سخت عذاب سے ڈرائے اور خوش  
خبری دے ان مومنوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں کہ بے  
شک ان کے لیے اچھا اجر ہے۔



برکی تو وہ سمجھت ہے چونکہ اللہ تو اسے چھوٹے چھوٹے ہاتھ رکے اور سر اٹھایا۔ عمل کو آگے رکھ کر اس کے ہاتھ پہ قلم چمکایا اس نے قلم کا بچا کھڑا اندر سے بڑبڑاتے ہوئے دیکھا پھر کرسی پر بچے کو کھینچ لیا۔

”بھئی تیرا اچھے تم سے بات کرنا ہے۔“

”اگلی ڈانٹ ڈانٹ تو ناگ تو ہو۔“ انیس آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا کہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”مگر مجھے کرنا ہے اور یہ تمہارے ڈانٹ کا بیج ہے میرا نہیں۔“

”ڈانٹ؟“ وہ نے بھر کو دلا تھپتھپتے پہل اور بھنوں تنی ہوئی۔

”شاید میں اس گھر سے چلی جاؤں شاید اب ہم ساتھ نہ رہیں میں اور تمہارے ڈانٹ ہی۔“

”اگلی ڈانٹ کیڑی؟“

”تیرا تم کس کے ساتھ مینا چاہو گے؟“

”ساتھ ڈانڈی کے ساتھ؟“ وہ جانتی تھی کہ تیرہ کا جواب کم از کم اس کے حق میں نہیں ہوگا پھر بھی پوچھ لیا۔

”کسی کے بھی ساتھ نہیں۔“ اس نے بے ڈاری سے شانے اچکائے تھے۔

”مگر جانا! آپ کو کسی کے ساتھ تو رہنا ہی ہوگا۔“

”میں آپ کا نوکر ہوں جو کسی کے ساتھ رہوں؟“

جسٹ لہو لہو آواز۔ ”تو ایک دم اندر سے بیچا تھا اور پھر کرسی کو تھوکر کھارنا اندر چلا گیا۔

وہ تسمک سے استے لہر جاتے دیکھتی رہی۔ یہ سچا لمحہ یہ بد عزتی یہ اندر دھماکا ہو۔ یہ کس نے تیرہ کے اندر ڈالا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ اس کے باپ کو سوراخوں میں گھسوا تو ایک مٹھر سا اس کی نگاہوں کے سامنے بنے لک۔

جینز کرتے میں ملیوں مگر مٹی اپنی نیل دلی ایک لڑکی چہرے یہ ڈھیروں بے ڈاری سما کے چلا رہی تھی۔

”میں آپ کے باپ کی نوکر ہوں جو یہ کر رہی۔“

اس کے قلم بہت سے چہرے تھے ابھی کہ مستاب ابھی مسرت ابھی کڑوا تو ابھی کوئی بچا۔

اسے وہ منہ بہت بند مڑن اور سانس کی یاد تھی اور اس کا دل وہاں گلاب اٹھا۔

”گلاب! گلاب! بھول سے جیسا کرتا ہے اس کے چھوٹے بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کرتے ہیں۔“ گلابی اس کے اندر بولا تھا۔

راست ایک ہی ہے اس۔ انسان ایک وقت تک چلتا ہے اور پھر آخر وہاں اپنے قدموں کے نشانیوں پہ ٹوٹتا ہے۔ بچہ جو بھول لگا کر جاتے ہیں ان کو نوکریاں کہتے دانے کاٹتے ہی ملے ہیں اور بھولتے بچوں کی بھیر کے بول بول کا انتظار گھنٹی گھنٹی کرتے رہتے ہیں۔

”گلاب! کسی نے پھر اتوں خیالوں سے ہانگی اور یہ خفی سے اپنی آنکھوں دھڑکیں۔

”کیا میں نے ٹھیک سنا؟“ لڑکتے جیسے بے یقینی اس کے سامنے کھڑی۔

”جی ہاں! میں نے خود کو جبراً ملے ہوئے سرا لیا۔“

”فصل اتم اور اب میں۔“ تم ابگ ہو رہے ہو؟“

تجربہ کی کشتی اس کے سامنے ڈھنچ پہ کشتیوں کے شیش چٹائی اور دونوں ہاتھ اس کے گود میں دھریے ہاتھوں پہ رکھے۔

”گلاب! شاید۔“

”مگر تم نے ایسا فعل کیوں کیا؟“ وہ مضطرب تھی اس کی آنکھوں میں دھنچکی جواب تلاش کر رہی تھی۔

”میں نے نہیں کیا۔“ وہ بچوں نے کیا ہے۔“

”کیا اس نے خود نہیں ایسا کیا ہے؟“

”گلاب۔“

”تو تم نے کیا لیا؟“ اس کے یقین تھی۔

”میں نے کیا؟“ وہ اس کی نگاہ سے کیا؟

فرشتے مگر مگر اس کا چہرہ کیسے رہی تھی۔

(پانی اکھڑا ہوا شام)





محفل ابراہیم، آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرز دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد پایا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محفل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً "آئی مہتاب کارویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محفل یوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محفل نما گھر میں آغا کریم اور مہتاب مائی نواز، حستان، وسیم، مندرہ اور ہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضلہ چچی کے تین بچے حسن، ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو، معبزو اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ چچو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں مالی مہتاب اور آغا کریم کے قرزند نواز کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو، فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محفل کو مائی مہتاب کے خاندان کی اس دکھتی رگ کا بخولی اندازہ ہے۔ وہ نواز کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظر انداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو، مندرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کلج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک راسر سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محفل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محفل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی، حال، مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے گرفت میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محفل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محفل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محفل، آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلدی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکا لرشپ مل

Scan & PDF  
FIAZ AHMED  
Friends Korner.com





جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایرونا نیکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے محل کے لیے دے دیا جاتا ہے تو سب کو سانس سوکھ جاتا ہے۔ مائی متاب فوراً انکار کر دیتی ہیں۔ جس پر محل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے ہمدردی جتاتا ہے اور اسے فیکٹری میں آکر مشینیں دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر محل اس پر سرار لڑکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے قبل ہی مائی متاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ محل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ مائی متاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملائی ہیں۔ محل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت ست بھی سناتی ہے۔ اس رد عمل پر وہ لڑکی بچھ سی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر محل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ محل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، محل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو محل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میرٹ میں ڈنر کا جھانسنہ دے کر فواد، محل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ڈر امار چاکر محل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جا کر محل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اسے ایس بی کے سامنے محل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر محل چکر اکر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، محل کی آغا فواد سے بات کرنا ہے تو وہ اسے رات اسی کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ محل اس دھوکہ دہی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ جھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کو ضعیفے برابر میں مدرسہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے مائی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ محل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر محل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر محل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا اور آغا کریم اور تمام چچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہوتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ محل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکے سے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی سرگرمیوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ کر دیتی ہے۔ مائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ آغا فواد گرفتار ہو جاتا ہے۔ محل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے محل کی بات چیت بند ہے۔ وہ اس معاملے میں محل کو بھی قصور وار سمجھتی ہیں۔ محل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدرسہ جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی، لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ دینی تعلیم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ اسے رابطے کے لیے اپنا سیل نم دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف محل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات جب گھر والوں کے علم میں آتی ہے تو وہ محل کو بری طرح زد و کوب کرتے ہیں۔ وہ دو روکر ان سب کو بدعادی دیتی ہے۔ حسن گھر والوں کے اس سلوک پر ششدر رہے۔ مسرت، محل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ محل، انسپکٹر ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے مطمئن جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں حصہ دینے کا جھانسہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شہا رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں داؤد کے خلاف کورٹ میں بیان دے تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا وہ ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر رہی ہے۔

(اب آگے پڑے)

## پھٹی اور آخری قسط

”فرشتے! میرے اختیار میں نہ کل کچھ تھا نہ آج ہے۔ ہمایوں نے فیصلہ سنانا تھا سنا دیا۔ اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تو کیا میں اسے مجبور کروں؟ نہیں۔“ اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر وہ علیحدگی ہی چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں مصالحت کی آخری کوشش ضرور کروں گی، مگر اس سے بھیک نہیں مانگوں گی۔“

”پھر پھر کیا کرو گی؟ کدھر جاؤ گی؟“

”فرشتے! میں ہمایوں کی محتاج نہیں ہوں۔ اللہ کی دیا بہت بڑی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو لے کر کہیں بھی چلی جاؤں گی۔“

”تم اس کے بغیر رہو گی؟“

”کیا وہ میرے بغیر نہیں رہ رہا؟“ وہ پھیکا سا مسکرائی۔

”مگر کیا تم خوش رہو گی؟“

”اگر اللہ نے میرے منتدر میں خوشیاں لکھی ہیں تو وہ مجھے مل ہی جائیں گی، بھلے ہمایوں میرے ساتھ ہو یا نہ ہو۔“

فرشتے تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔

”آئی ایم وری سوری محل! اگر تم کہو تو میں اسے اس کا فیصلہ بدلنے کو۔“

”نہیں۔“ اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”آپ اس معاملے میں نہیں بولیں گے۔“

”مگر ایک دفعہ مصالحت کی ایک کوشش تو۔“

”پلیز فرشتے! مجھے بھکاری مت بنائیں!“ اس نے

کچھ ایسی بے بسی سے کہا تھا کہ فرشتے لب کاٹی رہ گئی۔

”مگر۔۔۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کیا اس نے تمہیں

وجہ بتائی ہے؟“

”کیا میں نہیں جانتی؟ ہونہ!“ اس نے تلخی سے

سر ہٹا دیا۔ ”وہ ایک معذور عورت کے ساتھ کب تک

رہے کب تک میری خدمت کرے؟ وہ میری بیماری سے

اکٹا لیا ہے میں جانتی ہوں۔“

”کیا یہی واحد وجہ ہے؟“

”اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”وللہ اعلم خیر، جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا، اگر تم

نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس پہ اپنے دل کو بھی راضی کر

لینا۔“ لویو سسٹر!“ اس نے اپنے ہاتھ محل کے ہاتھوں

سے ہٹائے اور ہولے سے اس کا گال پھینچا پاتی کھڑی

ہو گئی۔

”بس یہ یاد رکھنا کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں

اور جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتیں میں تمہیں

چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ اوسے۔“

محل نے غم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اثبات

میں سر ہلادیا۔

\*\*\*

جب سے ہمایوں نے علیحدگی کی بات کی تھی وہ لاکھ

فرشتے کے سامنے خود کو صابر ثابت کر ظاہر کرتی اندر سے

وہ مسلسل ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس کی یادداشت

میں ہمایوں کے ساتھ بیٹا ایک ہی سال تھا۔ بانی کے مادہ

سال ذہن کے پردے پہ اترے بغیر ہی سرک گئے

تھے۔

اور وہ ایک سال جو اس نے اس گھر میں محبتوں اور

چاہتوں کے بیچ گزارا تھا۔۔۔ جب وہ دونوں گھنٹوں

باتیں کرتے تھے۔ وہ کینڈل لائٹ ڈنرز، وہ لائنگ

ڈرائیو، وہ روز ہمایوں کے لیے تیار ہونا، وہ ٹیرس پہ جا کر

رات کو باتیں کرنا، وہ ایک ساتھ کی گئی شاہنجز۔۔۔ ہر

شے اس کی یادداشت پر سے کسی فلم کی طرح گزرتی

تھی اور ہر یاد اس کے دل پہ مزید آنسو گرانی جاتی تھی۔

اور اگر تیمور بھی اس کے ساتھ نہ رہا، تب وہ کیا

کرے گی؟ کدھر جائے گی؟ اگر ہمایوں نے اسے گھر

سے نکال دیا، تو وہ کہاں رہے گی؟ کیا اپنے چچاؤں کے



پاس؟ کیا وہ اسے رکھیں گے؟ یا فرشتے کے ساتھ؟ مگر فرشتے تو خود تنہا تھے۔ ہائیوں کے گھر میں مہمان تھی۔ پھر وہ کیا کرے گی؟

یوں لگتا تھا کہ چلچلاتی دھوپ میں اسے لاکھڑا کیا گیا تھا۔ نہ چھت، نہ سائبان، مستقبل کا خوف کسی بھیانک آسیب کی طرح اس کے دل سے چٹ گیا تھا۔ بار بار یہ سوال ذہن میں اٹھتے اور وہ بمشکل ان کو جھٹلا پاتی۔

اور پھر آخر کب تک وہ ان کو یوں جھٹکے گی؟ کبھی نہ کبھی تو اسے ان کا جواب چاہیے ہو گا اور جس کتاب سے جواب مل جایا کرتے تھے اُس کے صفحے بار بار ایک ہی آیت سے کھل جاتے تھے۔ کبھی ایک جگہ سے کھل جاتی تو کبھی دوسری جگہ سے اور یہی قصہ سامنے آ جاتا۔

”اور داخل ہو جاؤ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے اور کو حطت“

مگر یہ کل سلیمانی کا دروازہ کہاں تھا؟ وہ تو بن سواری کے شہر سے نکال باہر کی جارہی تھی۔ اندر کیسے جاتی؟ وہ سہ پہر بہت زردی اترتی تھی۔ بلقیس نے اسے بیڈ سے وہیل چیر پہ بٹھایا اور باہر لے آئی۔

تیور لاؤج میں صوفے پہ کتابیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی اور پھر نگاہیں کتاب پہ جمادیں۔ وہ پیاسی نظروں سے اسے لکتی رہی، یہاں تک کہ بلقیس وہیل چیر لاؤج کے داخلی دروازے تک لے آئی۔

دروازے کی چوکھٹ پہ لگے گلاس نیل بوٹوں اور نقش و نگار کے درمیان اسے صوفے پہ بیٹھے تیور کا چہرہ نظر آیا جو بہت غور سے اسے باہر جاتے دیکھ رہا تھا۔ بلقیس وہیل چیر لان میں لے آئی۔ تازہ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو بھورے بال پیچھے کواڑنے لگے۔ اس نے آنکھیں موند کر لئے بھر کو موسم کی تازگی اپنے اندر اتارنا چاہی۔ تب ہی دیوار کے اس پار سے مدھم مدھم سی جھنجھناہٹ سماعت میں اتری۔

”اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے۔“ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اسے گھر آئے مہینہ ہونے کو آیا تھا مگر وہ کبھی مسجد نہیں گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟

”بلقیس! مجھے مسجد لے چلو۔“ ایک دم سے اس کا دل جھل گیا تھا۔ بلقیس نے فرماں برداری سے سر ہلا کر وہیل چیر کا رخ موڑ دیا۔

”فرشتے کدھر ہیں؟“ اس نے سوچا کہ اسے بھی ساتھ لے لے۔

”وہ کھانا کھا کر سو گئی تھیں۔“ ”چلو ٹھیک ہے۔“ وہ جانتی تھی فرشتے تنہی ہوئی ہوگی۔ صبح بھی وہ فزبو تھراپسٹ کے ساتھ محل کی ایک سرسبز اور پھر مساج کرنے میں لگی رہی تھی۔ پھر بھری لانا اور گھر کی نگرانی۔ وہ شام کو مسجد جائے گی ہی پھر ابھی۔ اسے کیوں تھکائے سو اس نے فرشتے کو بلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مسجد کا ہر ابھرا گھاس سے مزین لان دیباہی خوب صورت تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ سفید ستونوں پہ کھڑی عالی شان، اوچی عمارت، چمکتے سنگ مرمر کے برآمدے۔ کونوں میں رکھے سبز لہلہاتے گلے شور مچاتی دنیا سے دور ہنگامے سے پاک شہر ابھرا، کونا کونا سکون میں ڈوبا حوال۔

مسجد کے اندر کوئی اور ہی دنیا تھی۔ ٹھنڈی تازگی بھری باوقار سی دنیا۔ اس کے درو دیوار سے سکون ٹپکتا تھا۔

وہ جیسے بچوں کی طرح کھل اٹھی تھی۔ آنکھوں میں چمک آگئی اور بے اختیار ادھر ادھر گردن گھماتی وہ ہر ہر شے دیکھ لینا چاہتی تھی۔ بلقیس آہستہ آہستہ وہیل چیر آگے بڑھا رہی تھی۔

برآمدے میں سنگ مرمر کی چمکتی سیڑھیاں اترتی تھیں۔ ان پہ مسلسل اوپر نیچے لڑکیاں آ جا رہی تھیں۔ سفید یونیفارم کے اوپر لائٹ گرین اسکارف، پائرسٹ

کلر کے اسکارف پہنے، وہ مگراتی ہوئی خوش باش لڑکیاں، ہاتھوں میں قرآن اور کتابیں پکڑے ہر کسی کو مسکرا کر سلام کرتیں اس پاس نظر آرہی تھیں۔ ”وعلیکم السلام۔۔۔ وعلیکم السلام۔۔۔“ وہ مسکرا کر ہر ایک کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔ وہ وہاں کسی کو نہیں جانتی تھی اور کوئی اسے نہیں جانتا تھا پھر بھی سلام کرنا اور سلام میں پھل کرنے کی حرص رکھے ہر کوئی پاس سے گزرتے ہوئے سلام کرتا تھا۔ اس کا پور

پور خوشی میں ڈوب رہا تھا۔ یہ مانول، یہ درو دیوار۔ یہ تو اس کی ذات کا حصہ تھے۔ وہ کبے انتاعصرہ ان سے کئی ماہ کی؟

وہ غم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے وہیل چیر پہ بیٹھی مسلسل سب کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔ نہ کسی نے رک کر ترس سے پوچھا کہ اس کو کیا ہوا ہے۔ نہ کسی نے ترقم بھری نگاہوں سے نہ کوئی تجسس نہ کر دیا۔ وہ کوئی نہ وہیل چیر پہ بیٹھی ساری چمک پھل دیکھ رہی تھی۔

پھر جتنی ہی درو دیوار ہی بیٹھی رہی، یہاں تک کہ بلقیس نے مرکز تک جانے کی اجازت مانگی۔

”رات صاحب کے کوئی سرکاری مہمان آنے ہیں اور فرشتے بی بی نے مجھے گوشت بنوانے کو کہا تھا، میں بھول ہی گئی۔ آپ بیٹھو میں لے آتی ہوں۔“ ”نہیں میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی، آج دل کر رہا ہے، دنیا کو پھر سے دیکھنے کا۔“

ایک الوہی سی چمک نے نمل کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ اس ماحول میں آکر جیسے بہت خوش تھی اور اس خوشی کو اپنے اندر سمیٹ کر اب وہ دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھی۔

آج اسے بازار جانے سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ بلقیس عادتاً ”چھوٹی موٹی ادھر ادھر باتیں کرتی اس کی وہیل چیر چلاتی مرکز تک لے آئی۔ مرکز وہاں سے بہت قریب پڑتا تھا۔ وہ گوشت بنوانے دکان میں چلی گئی اہلہ محل باہر بیٹھی رہی۔

گاڑیاں بہت تیزی سے گزر رہی تھیں لوگ بہت اونچا بول رہے تھے۔ موٹر سائیکلیں بہت شور مچا رہی تھیں۔ روخنیاں بہت تیز تھیں۔

ذرا سی دیر میں ہی سارا سکون ہوا ہو گیا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

”جلدی کرو بلقیس!“ وہ لفافے تھامے دکان سے باہر آئی تو محل سخت اکٹا چکی تھی۔

”بس بی بی! یہ سامنے والے پلازہ میں ہوٹل ہے۔ تیور بابا کے لیے بڑے لالے لالے۔ ورنہ بابا کھانا نہیں کھائے گا۔ بس بی بی پانچ منٹ۔“

وہ تیز تیز وہیل چیر دھکیلتی کہہ رہی تھی۔ محل نے بے زاری اور بے چینی سے سرک کر دیکھا۔ وہ فراتے بھرتی گاڑیاں اسے بہت بری لگ رہی تھیں۔ ایسی ہی کسی گاڑی نے کبھی اسے ٹکرماری تھی۔ بلقیس ایک فاسٹ فوڈ کے سامنے اسے کھڑا کر کے اندر چلی گئی، اور وہ اس ریسٹورنٹ کی گلاس والے کونے میں اس گاڑی کو یاد کرنے لگی جس نے اسے ٹکرماری تھی۔ نہ جانے وہ کون تھا یا تھی؟ پکڑا بھی گیا یا نہیں؟

**خواتین ڈائجسٹ**  
کی طرف سے  
بہنوں کے لیے ایک اور ناول

**تتلیاں پھول اور خوشبو**  
راحت جبین

قیمت --- - 225/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی



کیا ہاویوں نے اس پر مقدمہ کیا ہوگا؟ اسے جیل بھیجا ہوگا؟ مگر یوں مقدمہ کرنے سے اس کا نقصان پورا تو نہیں ہو سکتا تھا۔

”خیر جانے دو میں نے معاف کیا سب کو۔“

اس نے سر جھٹکا اور پھر بے چین و منتظر نگاہوں سے ریسٹورنٹ کی گلاس وال کو دیکھا۔ بلتیس جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

وہ یومی بے زاری سے نگاہ اُدھر اُدھر گھماتی رہی اور دفعتاً ”بری طرح ٹھکی۔ ریسٹورنٹ کی گلاس وال کے اس طرف کا منظر صاف واضح تھا۔

کوٹنے والی میز پر بیٹھا وہ مسکراتے ہوئے والٹ کھولتا ہاویوں ہی تھا۔ وہ ٹیک ٹیک اس کی مسکراہٹ کو دیکھے گئی۔ کیا اسے مسکراتا یاد تھا؟ کیا اسے مسکراتا آتا تھا؟

اور تب اس کی نظر ہاویوں کے مقابل بیٹھی لڑکی پر پھیلی۔ شولڈر کٹ ہال، سیولیس شرٹ، ڈوپٹہ ندارد کمان کی طرح تکی آئی بوند۔ وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی اور ہاویوں سر جھٹک کر مسلسل مسکراتے جا رہا تھا۔

اس لڑکی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ وہ آرزو تھی۔ وہ واقعی آرزو ہی تھی۔

ہاویوں اب والٹ سے چند نوٹ نکالتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا جبکہ وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ دونوں کے درمیان بے تکلفی واضح اور عیاں تھی۔

”تو یہ بات تھی ہاویوں داؤد! تمہیں آرزو ہی ملی تھی؟“ اس نے غم سے لب کاٹتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔ فرشتے ٹھیک کہتی تھی۔ یقیناً ”وجہ کوئی اور تھی۔ اس کی معذوری کا تو بہانہ تھا۔ اصل وجہ تو وہ تکی کمان سی ایزو والی شاطر لڑکی تھی جو اس کے شوہر کے ساتھ سرعام بچ کر رہی تھی۔

اس نے کہا تھا وہ ہاویوں کو اس سے چھین لے گی اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ محل نے کرب سے سوچا۔

مغرب کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں جب بلتیس اس کی وہیل چیمبر دھکیلتی گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی۔

اس کے سامنے ایک ہی منظر تھا، کوٹنے کی ٹیبل پر بیٹھے ہنستے مسکراتے دو نفوس ایک جانا پہچانا سا فرد اور ایک جانی پہچانی سی عورت۔

وہ اجڑی اجڑی سی صورت لیے گم صم سی وہیل چیمبر پر بیٹھی تھی۔ بلتیس کب اسے کمرے تک لائی اسے کچھ علم نہ تھا۔

کسی نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ چونکی اور پھر گردن اٹھا کر سامنے دیکھا۔

فرشتے حیران سی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ زرد شلوار قمیض میں ملبوس ڈوپٹہ شانوں پر پھیلائے اس نے کیلے بھورے بال سمیٹ کر دامن میں شانے پر ڈال رکھے تھے۔ شاید ابھی وہ نماز کر آئی تھی۔

”مگر ہر گم ہو محل؟ کب سے تمہیں بلا رہی ہوں۔“ وہ بیٹوں کے بل اس کے سامنے کارپٹ بیٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ تمام لیے دامن میں شانے پر پڑے اس کے کیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک گردامن کو بھگور رہے تھے۔

”آپ ٹھیک کہتی تھیں فرشتے۔“ وہ جیسے ہار گئی تھی۔ فرشتے کو لگا وہ رو رہی ہے مگر اس کے آنسو باہر نہیں اندر گر رہے تھے۔

”میں نے آج خود ان دونوں کو دیکھا ہے۔“

”کن دونوں کو؟“ وہ بری طرح چونکی۔

”ہاویوں اور۔۔۔ اور آرزو کو۔“

”آرزو؟ اسد انکل کی بیٹی آرزو؟“

”ہاں وہی۔ کیا اسد چچا کی ڈیوٹھ ہو گئی ہے؟“

”تم نے انہیں کدھر دیکھا؟“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر گئی تھی۔

”مرکز کے ایک ریسٹورنٹ میں۔ وہ دونوں لہجہ کر رہے تھے یا شاید ہالی ٹی۔ فرشتے! ہاویوں ہنس رہے تھے میں تو سمجھی تھی کہ وہ ہنسنا ہی بھول گئے ہیں۔“

”مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ۔۔۔ پتا نہیں مگر۔۔۔ وہ

مذہب تھی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”مجھے پتا ہے وہ آزادی وجہ سے میرے ساتھ یوں کر رہے ہیں۔ اس نے کہا تھا وہ ہاویوں کو مجھ سے چھین لے گی۔ اور اس نے یہ کر دکھایا۔ کیا وہ کبھی اس گھر میں آئی ہے؟“

”ہاں وہ اکثر آتی رہتی ہے۔ مگر تمہارے گھر شفٹ ہونے کے بعد وہ کبھی نہیں آئی۔“

”واقعی؟“ اسے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ آخر وہ کس حیثیت سے آئی تھی اس کے گھر؟

”آپ نے اسے نکال کیوں نہیں؟ اندر کیوں آنے دیا؟“

”میرا گھر نہیں ہے محل! مجھے اس کا حق نہیں ہے۔“

محل چپ سی ہوئی۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

”ہاویوں کے کچھ گیٹ آنے ہیں چائے پی۔ ابھی منے والے ہوں گے میں ذرا لیجن دیکھ لوں۔“ وہ اس کے ہاتھوں سے ہاتھ لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیلے بل سامنے سے پھسل کر کمرے جا کر۔

”آپ۔ آپ بہت اچھی ہیں فرشتے۔“ وہ کہہ بغیر نہ رہ سکی۔

”وہ تو مجھے پتا ہے۔“ وہ نرمی سے مسکرائی اور زرد ”پینے کا پلو سر پہ ڈالا پھر اچھی طرح چہرے کے گرد دھار سا بنا کر دایاں بوا میں کندھے پہ ڈال دیا۔ یوں کہ ال اور کان چھپ گئے۔

”تم آرام کرو۔“ وہ باہر نکل گئی اور محل وہیں اواس دوران سی بیٹھی رہ گئی۔

باہر سے چہل چل کی مدھم مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ کافی دیر بعد اس نے کھڑکی سے ہاویوں کی گاڑی کو آتے دیکھا تھا۔ اس کے ہمراہ دو تین معزز اشخاص آئی تھے۔ ہاویوں اسی لباس میں تھا جس میں ابھی شام میں آرزو کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گویا وہ واقعی وہی تھا یہ اس کاواہم نہ تھا۔

وہ حسرت و یاس سے کھڑکی سے لگی ان کو اندر

جاتے دیکھتی رہی۔ اس کے کمرے میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ باہر روشنی تھی۔ باہر والے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، اور وہ ”باہر والا“ تو شاید اب کبھی بھی اسے نہ دیکھ سکے۔ اس کے پاس اب بہتر انتخاب تھا۔ جوان کسانٹلش زندگی سے بھرپور عورت بے شک وہ محل کی طرح خوب صورت نہ تھی مگر اس کی تراش خراش کی گئی شکل ”اب“ کی محل سے حسین لگتی تھی۔

کیا کبھی حالات بدلیں گے، کیا کبھی ہاویوں لوٹے گا؟ کیا کبھی اس کی معذوری ختم ہوگی؟ کیا کبھی تیمور اس کے پاس آئے گا؟ کیا یہ گھر اس کا رہ سکے گا؟ کیا وہ در بدر کردی جائے گی؟ کیا وہ بے سہارا چھوڑ دی جائے گی؟

اندر کا خوف اور بے بسی آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے نکل کر چہرے پہ لڑھکنے لگی۔ مستقبل ایک بھیاٹک سیاہ پردے کی مانند ہر طرف چھا آدکھائی دے رہا تھا اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

”اللہ اس چیز سے بڑا ہے جس سے میں ڈرتی اور خوف کھاتی ہوں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا وہ ایک کلمہ وہ بار بار زیر لب دہرا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اندر کرب قدرے کم ہوا اور ذرا سا سکون آیا تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

”اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑی دینا ہے نکال ہی دینا ہے تو مجھے کسی بے قدرے کے حوالے مت کرنا“ میرے مالک! کوئی امید کا سرا دکھاوے کوئی روشنی دکھا دے۔“ وہ بنا لب ہلائے دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو اسی طرح بہہ رہے تھے۔

پھر جب بہت روکی تو چہرہ پونچھا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا اپنا سفید کوروالا قرآن اٹھایا اس کے فرنٹ کور پر مٹا مٹا سا ”م“ اسی طرح لکھا تھا۔

اسے یاد نہ تھا کہ اس نے آخری دفعہ تلاوت کدھر چھوڑی تھی پتا نہیں نشان کہیں لگایا تھا یا نہیں۔ بس جہاں سے صفحہ کھلا اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔



لاشعوری طور پر وہ اللہ تعالیٰ سے رہنمائی چاہتی تھی۔  
”اور کس کی بات اس شخص کی بات سے زیادہ اچھی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور اچھے عمل کرے اور کسے بے شک میں مسلمانوں میں سے ہوں۔“

اس نے اگلی آیت پڑھی۔  
”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں سو (برائی کو) اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو پھر دفعتاً وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے یوں ہو جائے گا گویا کہ تمہارا جیم (گرا جاں نثار دوست) ہو۔“

اس نے انجیل سے ان آیات کو دیکھا کیا اب بھی کوئی امید تھی کہ وہ شخص اس کا جیم (گرا جاں نثار دوست) بن سکتا ہے؟ اب تو کچھ باقی نہیں رہا تھا سب ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اس آیت کو دوبارہ پڑھا۔  
”بہت ہی عجب ماجرا تھا۔ آج وہ اپنے شوہر کو ایک دوسری عورت کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے دیکھ آئی تھی، اپنے اس شوہر کو جو بڑا اس سے علیحدگی اختیار کرنے کا کہہ چکا تھا۔ اس کا اپنا بچہ اس سے بدکوتا تھا۔ اس سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی بے انتہا امید رہنے والی، بن بھی آج خاموش تھی، آج اس نے بھی امید نہیں دلائی تھی کہ ہمایوں کا رویہ سب کے سامنے تھا۔“

اس نے پھر سے پڑھا۔  
”پھر دفعتاً وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت ہے یوں ہو جائے گا گویا تمہارا جیم ہو اور اس (خوبی) کو ان لوگوں کے سوا کوئی نہیں حاصل کر سکتا جو بہت صبر کرتے ہیں اور اس (خوبی) کو ان کے علاوہ کوئی نہیں حاصل کر سکتا جو بڑی قسمت والے ہوتے ہیں۔“

میں اتنی صبر کرنے والی اور بڑی قسمت والی کہاں ہوں اللہ تعالیٰ؟ اس نے یاس سے سوچا تھا۔ کیا وہ واقعی کبھی بھی ان عداوتوں کو پھللا نہیں سکے گی؟ کیا اسے مایوس ہو جانا چاہیے؟

باہر سے چل پھل کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ محل کے کمرے کے سامنے ہی ڈرائنگ ہال اور ڈائننگ روم تھا۔

اس نے قرآن بند کر کے شایستہ رکھا اور وہیل چیئر کو کھینچتی ہوئی کھڑکی کے پاس گئی۔ قد آور کھڑکی کے شفاف شیشوں کے اس پار ڈوبتی شام کا منظر نمایاں تھا۔ دور اور کہیں آدھا چاند بادلوں سے جھانک رہا تھا۔ یہاں تک کہ شام ڈوب گئی اور چاندنی سے کھڑکی کے شیشے روشن ہو گئے۔ وہ اسی طرح اندھیرے میں ڈوبے کمرے میں بیٹھی گردن اٹھائے چاند کو دیکھ رہی تھی۔

”ارح باقی ہی احسن۔“  
(دور کر اسے اس طریقے سے جو بہترین ہو۔)  
جو بہترین ہو۔  
جو بہترین ہو۔  
ایک آواز بار بار اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔  
وہ چپ چاپ چاند کو دیکھتی کچھ سوچے گئی۔

اس نے دیوار پر آویزاں گھڑی پہ نگاہ دوڑائی۔ ایک بجے میں ابھی چند منٹ تھے اور ہمایوں ڈیڑھ بجے تک گھر آ جاتا تھا۔

وہ وہیل چیئر کھینچتی سنگھار میز کے سامنے لے آئی اور قد آور آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ وہیل چیئر پہ بیٹھی ایک کمزوری لڑکی جس کے گھٹنوں پہ چادر پڑی تھی اور کیلے بال شانوں پہ بکھرے تھے۔ چہرے کی سپید رنگت میں زردی کھنڈی تھی اور بھوری آنکھوں سے حلقہ تھے۔

اس نے ہیر برش اٹھایا اور آہستہ آہستہ بالوں میں اوپر سے نیچے کنگھی کرنے لگی۔ کیلے بالوں سے موتیوں کی طرح ٹپکتے قطرے اس کی سرخ قمیض کو بہہ رہے تھے۔ یہ خوب صورت جوڑا فرشتے نے اس کے لیے بنوایا تھا اور آج بہت شوق سے اس نے پہنا تھا۔  
بال سلجھ گئے تو اس نے چہرے پہ ہلکا سا فاونڈیشن

لگایا، پھر گلابی سابلش آن بکھیرا، آنکھوں میں گہرا کاجل اور اوپر لائٹ پنک سا آئی شیڈ، پھر پنک اور ریڈ لپ اسٹک ملا کر لبوں پہ لگائی یوں کہ اوپر بھی نہ لگے اور بہت پھیکتی بھی نہیں۔ بال ذرا ذرا سوکھنے لگے تھے۔ اس نے ان کو برش سے سمیٹا، پھر دونوں ہاتھوں میں پکڑے اونچا کیا، اور پونی میں باندھا، یوں کہ اوپری پونی بال اس کی گردن پہ جھولنے لگی۔  
محل کی یادگار پونی ٹیل۔

وہ اسے دیکھ کر اداسی سے مسکرا دی۔ پھر ڈرائنگ ہال پہ رکھا جو لری باکس کھولا اور لٹکتے سرخ یا قوت کا مے کا سیٹ نکالا۔ کانوں میں آویزے پہنے اور گردن میں نازک سا نیلا کلیس، اب اپنا عکس دیکھا تو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔ وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ تروتازہ اور خوب صورت۔

جیولری باکس کے ساتھ ہی اس کی کلچ کی سرخ پہلیاں رکھی تھیں۔ وہ ایک ایک چوڑی اٹھا کر کلابی کس والٹی گئی۔ یہاں تک کہ دونوں کلابیاں بھر گئیں اور جب اس نے سرخ بڑے سے یا قوت کی آنکھوں کی اٹھائی تو اسے پہنتے ہوئے چوڑیاں بار بار کھنکھناتیں۔

ڈیڑھ بجتے والا تھا، اس نے ایک نظر گھڑی کو دیکھا اور پھر رفیوم اسپرے کر کے خود کو باہر نکال لائی۔  
ہمایوں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ بے چین سی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ کبھی آویزے درست کرتی، کبھی پوڑیاں ٹھیک کرتی اور بار بار دروازے کو دیکھتی۔  
”وہ بجنے والے تھے جب اس نے گاڑی کی آواز سنی۔ ایک دم اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

یہ ہی طریقہ اسے ”بہترین“ لگا تھا، سو اس نے اسی اپنایا تھا۔  
قدموں کی چاپ قریب ہوتی سنائی دی۔ وہ خواہ مخواہ کہ میں دھڑے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نروس ہو رہی تھی اور وہ یہ جانتی تھی۔

دروازہ کھلا اور اسے ہمایوں کے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ مگر نہیں، ساتھ میں نازک ہیل کی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- ✽ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✽ نئے بال آگاتا ہے۔
- ✽ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✽ مردوں و عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✽ یکساں مفید۔
- ✽ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت = 100 روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جزی بوٹوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے۔ یہ بازار میں ایک کی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دبی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 100 روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھی کر جزی پارسل سے منگوا لیں، رجسٹری سے منگوانے والے نئی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

2 بوتلوں کے لئے = 250 روپے  
3 بوتلوں کے لئے = 350 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا بندہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، ایکسٹنڈنگ فور ایم اے جناح روڈ، کراچی  
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی بیوٹی آئل ان جگہوں سے حاصل کریں  
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، ایکسٹنڈنگ فور ایم اے جناح روڈ، کراچی  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی  
فون نمبر: 32735021



نک نک بھی تھی۔

اس نے حیرت سے سر اٹھایا اور اگلے ہی پل زور کا جھکا لگا۔

ہمایوں اور آرزو آگے پیچھے اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ یونیفارم میں ملبوس تھا ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا اور وہ آرزو سے بغیر کچھ نہ چلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ہم قدم مسووری چل رہی تھی۔ وائٹ ٹراؤنزر پہ پینک گھٹنوں تک آتی شرٹ اور دوپٹہ ناپید کمان کی سی پتلی ابرو زور ٹیکھی لگا ہیں۔

اسے سامنے بیٹھے گردن اٹھائے خود کو دیکھتے ان دونوں کے قدم ذرا سے ست ہوئے۔

چند لمحے وہ شدید صدمے کی حالت میں رہی تھی مگر پھر سنبھل گئی۔

بظاہر سکون سے ان دونوں کو آتے دیکھا اور اسی سکون سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام“ ہمایوں نے جواب دے کر ایک نظر آرزو کو دیکھا جو سینے پہ بازو باندھے ٹیکھی لگا ہوں سے محمل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں واضح استہزاء تھا۔

”میں آپ کا انتظار کر رہی تھی ہمایوں! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ آرزو کو یکسر نظر انداز کیے سپاٹ لمبے میں ہمایوں سے مخاطب تھی۔

”مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھا خاکی لفافہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

”ٹھیک ہے“ آپ بتائیں۔“

وہ دونوں آنے سامنے بیٹھے تھے اور آرزو اسی طرح سینے پہ بازو لیٹے اکڑی اکڑی سی کھڑی تھی۔ چند لمحے خاموشی چاٹ رہی۔ ہمایوں ہاتھ میں پکڑے خاکی لفافے کو دیکھتا رہا جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ اس نے سر اٹھایا اور ان ہی سنجیدہ نگاہوں سے محمل کا چہرہ دیکھا۔

”میں شادی کر رہا ہوں۔“

ایک لمحے کو سکوت چھا گیا مگر نہ آسمان گرا نہ زمین پھٹی نہ ہی کوئی طوفان آیا۔ اس نے بہت صبر سے اس کی بات سنی اور پھر سوالیہ ابرو اٹھائے۔ ”تو؟“

”تو یہ کہ ہم دونوں کو الگ ہو جانا چاہیے۔ یہ لو۔“ اس نے خاکی لفافہ محمل کی طرف بڑھایا جیسے اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر تھا۔ دونوں لمحے بھر کور کے دونوں نے اس وقت خاکی لفافہ تمام رکھا تھا۔ مگر وہ بس ایک لمحے کافسوں تھا۔ پھر ہمایوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور محمل نے سفاکی سے لفافہ چاک کیا۔

”کیا ہے اس میں ہمایوں صاحب؟ کیا میرا طلاق نامہ ہے؟“ اندر سے یہ شدہ کافز نکالتے ہوئے وہ بہت آرام سے بولی تھی۔ وہ خاموش رہا۔ محمل نے کافز کی تمہیں کھولیں۔

وہ واقعی طلاق نامہ تھا۔ ہمایوں کے دستخط، محمل کا نام۔

نہ اس کے ہاتھ سے کافز پھسلانہ وہ چکر اکر گری۔ بس ایک نظر میں پورا صفحہ بڑھ ڈالا اور پھر گردن اٹھائی۔ لمحوں میں ہی اس نے سارے نیپلے کر لیے تھے۔

”اس پہلی طلاق کا شکریہ ہمایوں داؤد! جس عالم نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی دینا ایک قبیح عمل ہے۔ سو طلاق ایک ہی دینا بہتر ہے تو اس نے یقیناً“ نہ بھی بتایا ہو گا کہ اب عدت کے تین ماہ میں اسی گھر میں گزاروں گی کیا نہیں بتایا؟“

”مجھے معلوم ہے تم تین ماہ ادھر رہ سکتی ہو اس کے بعد میں شادی کر لوں گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ محمل نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا جس کے بے وفا چہرے پہ کوئی پچھتاوا کوئی ملال نہ تھا۔

”پوچھ سکتی ہوں آپ دوسری شادی کس سے کر رہے ہیں؟“

ہمایوں نے ایک نظر سامنے کھڑی آرزو کو دیکھا اور پھر شرانے جھٹکے۔

”یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ میں ذرا چھینچ کر کے آتا

اول۔“ آخری فقرہ آرزو سے کہہ کر وہ تیزی سے اوپر بیڑھیاں چڑھتا گیا۔

وہ چند لمحے اسے اوپر جاتے دیکھتی رہی۔ زندگی میں پہلی بار اسے ہمایوں داؤد سے نفرت محسوس ہوئی تھی۔ شدید نفرت۔

”آپ تو اپنا ج ہو کر بھی خوب بنی سنوری رہتی ہیں۔“ آرزو کی طنزیہ آواز پہ اس نے چہرہ اس کی جانب موڑا۔

”اگر شکل اچھی ہو تو معذوری میں بھی اچھی ہی لگتی ہے آرزو بی بی ورنہ لوگ تو گھٹنوں کی تراش تراش کے بعد بھی خوب صورت نہیں لگتے۔“

”پتلی۔“ رسی چل گئی بل نہیں گئے۔“ وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ گئی۔ دائیں ٹانگ بائیں پہ چھائی اور بڑے استحقاق سے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا ہمایوں کا موبائل اٹھایا جو اس نے بیٹھتے ہوئے ادھر رکھا تھا۔

وہ خاموش رہی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا محمل! مجھے اس سے پیار اور کیا ہے لو ایٹ فرسٹ ساٹ میں اسے حاصل کر لی اول کی۔“

”اور میں نے بھی تب کہا تھا آرزو! کہ تم خدا نہیں ہو جو ہر چیز تمہاری مرضی سے ہو۔ آج وہ تمہارے لیے مجھے چھوڑ رہا ہے کل کو کسی اور کے لیے تمہیں بھی چھوڑ دے گا تب میں تمہاری آہیں سننے ضرور آؤں گی۔“

آرزو بے اختیار مظلوظ سی ہنس پڑی۔

”جھلس ہو رہی ہو ہے نا؟“

اس کا انداز محمل کے اندر آگ لگا گیا مگر اس نے وہ آگ چہرے پہ نہ آنے دی۔ وہ بہت کمال ضبط کا وقت تھا۔

”تمہارے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس سے میں جھلس ہوں۔ رہا ہمایوں تو تم شوق سے اسے لے لے کر کھینکتی مٹی کے اس پہلے کا کیا کرنا ہے جس میں وفا ال نہ ہو۔“

”تمہاری اکڑا بھی تک نہیں گئی محمل۔“

”اور میری یہ اکڑ جائے بھی نہیں تمہیں کیا لگتا ہے محمل ہمایوں کے بغیر مر جائے گی؟ ہونہ۔“ اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔ ”میں سات سال کو ماں میں پڑی رہی تب میرے پاس ہمایوں نہیں تھا میں تب بھی نہیں مری تو اب اس کے بغیر کیوں مروں گی؟ خیر اگر تم نے بیٹھنا ہے تو بیٹھو کھانے بننے آئی ہو تو سامنے بچن ہے ویسے بھی دو سروں کے مال کھانے کی تمہاری خاندانی عادت ہے اور ہمایوں کی خیرات کرنے کی۔ جو کھانا ہو کھا لینا ٹیک کیئر۔“

اس نے دانستہ السلام علیکم کہنے سے احتراز برتا۔ کم از کم اس وقت وہ آرزو پہ سلامتی نہیں بھیج سکتی تھی اور وہیل چیئر کا رخ اسے کمرے کی طرف موڑ دیا۔

یہ شدہ زرد کافز ادھ کھلا اس کی گود میں دھرا تھا۔ اسے آرزو کے بیڑھانے اٹھنے اور بیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا گھر تاش کے پتوں کی طرح بکھریا تھا۔ اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

کمرے میں اگر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لاک نہیں لگایا اب کس کو ادھر آنا تھا بھلا؟ سب کچھ بکھر گیا تھا۔

وہ وہیل چیئر کے پیٹوں کو دونوں ہاتھوں سے گھسیٹتی سنگھار میز کے سامنے لائی۔ کمرے کی بتی بجھی تھی۔ کھڑکی کے آگے پردہ گرا تھا کہیں درزوں سے زردی روشنی جھانک رہی تھی جس سے کمرے میں نیم اندھیرا سا تھا۔

وہ اس نیم تاریک ماحول میں اپنا عکس آئینے میں دیکھے گئی۔

ہر شے اجڑ گئی تھی سب ختم ہو گیا تھا۔ راکھ کا ڈھیر لگا تھا اور اس میں کوئی چنگاری نہیں بچی تھی۔

اپنے عکس کو دیکھتے اس کا دل چاہا وہ کانوں سے آویزے نوچ پھینکے نازک سا ہار اتار کر دیوار پہ مارے چوڑیاں توڑ دے۔ زور زور سے چلائے دھانڑیں مار



مار کر روئے۔

اس نے ہاتھ آویڑوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ دفعتاً نیم تاریک کمرے میں ایک مدھم سی آواز ابھری۔

”آنکھ آنسو بہاتی ہے۔“

اور دل غمگین ہے۔

مگر ہم زبان سے وہ ہی کہیں گے جس پہ ہمارا رب راضی ہو۔“

آویڑے کو پکڑے اس کا ہاتھ بے دم سانبچے گر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا صبر صدے کی پہلی چوٹ یہ ہوتا ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جو شخص گریبان چاک اور رخساروں پر طمانچے مارے اور جاہلیت کی طرح بین (نوحہ) کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس نے سرو ہیل چیئر کی پشت سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ قطرہ قطرہ آنسو بند آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔ وہ بے آواز روتی رہی، بلکتی رہی۔ اندھیرے کمرے میں بیٹھی ایک معذور کمزور لڑکی جو بے گواز پروتے ہوئے بس ایک ہی لفظ بار بار دہرائے جا رہی تھی۔

”یارب المستغفین۔۔۔ اے کمزوروں کے رب۔۔۔ اے کمزوروں کے رب۔۔۔“

دوسرے دم توڑ گئی، شام ڈوب گئی اور ہر سورات چھلنے لگی۔ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب کسی نے دروازے پہ دستک دی اور پھر چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ وہ کھٹک چلا گیا۔

اس نے گردن موڑ کر نہیں دیکھا۔ اسے اب کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ ہمایوں بھی اس کے پاس آئے گا۔

قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک ہیولا سا اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”محمل!“ وہ فرشتے کی آواز تھی۔

وہ چپ چاپ آنکھیں چھت پہ جمائے بیٹھی رہی۔

”محمل! کیا ہوا ہے ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی متفکر سی آواز ابھری۔

”محمل! تم ٹھیک ہو؟“

اس نے دھیرے سے چہرہ اٹھایا اور متورم آنکھوں سے اندھیرے میں کھڑی فرشتے کو دیکھا۔ اس نے سیاہ جوڑا پہن رکھا تھا سیاہ دوپٹے کے بالے میں مقید اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

”محمل!“

”ہمایوں نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی تو آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ کتنے ہی بل باحول پہ سکتے سا چھایا رہا۔

”کب؟“

”تین دو پہر میں میں عدت اس گھر میں پوری کر دی گئی، پھر اس کے بعد میں چلی جاؤں گی اور وہ شادی کر لے گا۔“ اس نے رخ فرشتے سے موڑ لیا، تاکہ وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

”آئی ایم ویری سوری محمل۔“ وہ متاسف کھڑی تھی۔ تم عدت کے بعد کہاں جاؤ گی؟“

”اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے، کہیں بھی چلی جاؤں گی۔“

”کیا تم خود کو اتنا اسٹرونگ فیل کرتی ہو کہ حالات کا مقابلہ کر لو گی؟“

”ہاں میں کر لوں گی، آپ جائیں مجھے اکیلا چھوڑ دیں پلزی۔“

فرشتے نے سمجھ کر سر ہلایا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کے بند ہونے کی آواز پہ اس نے چہرہ واپس موڑا۔

کمرہ پھر سے سناں ہو گیا تھا، وہ جا چکی تھی۔

وہ رات بہت عجیب رات تھی۔ محمل نے اتنی ویران رات کبھی نہیں گزاری تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ مسجد کی دیوار پھلانگ رہی تھی۔ تب بھی نہیں جب اسے اس کی جائیداد اور گھر سے محروم کر کے باہر نکال دیا گیا تھا۔ تب بھی نہیں جب اس کی ماں مری

تھی اور تب بھی نہیں جب وہ سات سال بعد کو سے سے جاگ تھی۔ ایسی رات پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ ویل چیئر کی پشت سے سر نکالے نم آنکھوں سے چھت کو دیکھتی رہی۔ پردوں سے چھن چھن کر اندر آتی چاندنی میں پردے یوں چمک رہے تھے جیسے چاندی کے ورق ہوں۔

زندگی ایک دم گویا ختم سی ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس کے پاس آگے چلنے کو کوئی امید نہ رہی تھی۔ ہمایوں اس کا نہیں رہا تھا، تیمور اس کا نہیں رہا تھا، نہ کسی رشتہ دار کا آسرا تھا اور نہ ہی فرشتے تو وہ اس کے ہانے کے بعد مسجد شفقت ہو جاتی۔ وہ کب تک فرشتے کو اپنی وجہ سے پابند رکھتی؟

وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں۔

رات یوں ہی خاموشی سے بہتی گئی۔ وہ اسی طرح برف کا مجسمہ بنی ویل چیئر پہ پڑی رہی۔ پردوں کی ایک ختم ہوتی گئی اور کمرے میں مہیب ٹھپ اندھیرا چھا گیا۔

اسے اس اندھیرے سے خوف آنے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تارکی میں دیکھنے کی سعی کرنے لگی اور تب ہی کھڑکی کے کناروں میں صبح کاذب کی نیلاہٹ ابھرنے لگی۔

دور کہیں فجر کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کے برف بنے وجود میں پہلی بار جنبش ہوئی۔

اس نے اپنے من ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھائے اور پیوں کو آگے کی طرف گھسیٹا۔ شیاف پہ ایک طرف وضو کے پانی کا پرتن رکھا تھا۔

محمل نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کوئی دعا ذہن میں ہی نہ آئی، بس ایک وہی لفظ۔

”اے کمزوروں کے رب!“ لبوں پہ اترا۔ اس نے گلی بار اسے دہرایا، آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو اس نے آمین کہہ کر چہرے پہ ہاتھ پھیر لیے۔

کمرے میں ہلکی ہلکی نیلاہٹ اترنے لگی تھی۔ وہ

ویل چیئر کو شیاف کے قریب لائی، جہاں ٹپ ریکارڈر اور ساتھ کیتڑوں کا ڈبہ رکھا تھا۔ اس نے بنا دیکھے ایک کیسٹ لگائی اور ٹپ میں ڈال کر لیے کاٹین دبایا۔

”کیوں درمیان سے تلاوت شروع ہو گئی تھی۔“

”اور کس کی بات اس شخص کی بات سے زیادہ اچھی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے؟“

وہ حیرت سے چوکی، یہ آیت تو پرسوں اس نے پڑھی تھی، پھر یہ ہی کیوں لگ گئی؟

”اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں۔“

وہ حیران سی بن رہی تھی۔ اللہ اسے یہ آیات پھر سے کیوں سنوا رہا تھا؟ یہ آیات تو گزر چکی تھیں، پھر دوبارہ کیوں؟

”برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو؟“

قاری صاحب کی آواز پڑھتے ہوئے بھرا گئی تھی۔ وہ ابھ سی گئی۔ اللہ اسے کیوں پھر سے وہی بات بتا رہا تھا؟ وہ شخص تو اب سارے تعلق کاٹ چکا تھا، اب تو کوئی امید باقی نہیں رہی تھی، پھر کیوں اسے برائی کو بہترین طریقے سے دور کرنے کو کہا جا رہا تھا؟

وہ میرا تیمم (جال نثار دوست) نہیں بن سکتا اللہ تعالیٰ! اس نے مجھے طلاق دے دی ہے، وہ مجھے تین ماہ بعد گھر سے نکال دے گا۔ اب تو درمیان کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا، پھر آپ کیوں مجھے اس عداوت کو دور کرنے کا کہہ رہے ہیں؟ وہ ایک دم رو پڑی تھی۔

پردوں کے دوسری طرف سے روشنی جھانکنے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردے ہٹا دیے۔

باہر لان میں صبح اتر رہی تھی۔ گہری سیاہ رات کے بعد اترتی صبح۔

”برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو بہترین ہو۔“

گھاس پہ تیمور بیٹھا تھا۔ ٹیکر شرٹ میں ملبوس سوئی سوئی آنکھیں لیے وہ گھاس پہ بیٹھی ملی کی کمر پہ پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شاید اس کے ہاتھ میں کچھ تھا جو وہ ملی کو کھلانے لایا تھا۔

”پھر دفعتاً“ وہ شخص۔۔۔

”پھر دفعتاً“ وہ شخص۔۔۔







آغا فواد کریم، آغا جان کا ولی عہد جس نے اس کو بکاؤ مال بنایا، بلیک میل کر کے تمام جائیداد اپنے نام لکھوائی اور پھر اس کی گردن پہ پستول رکھ کر فرشتے کو دھمکایا، گھر سے نکلوا یا اور بعد میں جانے وہ ہمایوں کو آکر کیا کہہ گیا تھا کہ ہمایوں اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہ رہا تھا۔  
 ”ہانڈی نہیں لگی تھی، شکر مالک کا۔“ بلیقیس تیزی سے واپس اندر داخل ہوئی تھی، اس نے خیالات سے چونک کر سر اٹھایا۔

”ہائے کتنے سوئے ہوئے ہیں، یہ آپ کے گھر والوں کے ہیں جی؟“ وہ کھلے البم کو دیکھ کر اشتیاق سے اس کے کندھے کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور سر جھکائے دیکھنے لگی۔

”ہاں، میرے رشتہ دار ہیں۔“ اس نے صفحہ پلٹا۔ لگے صفحے پہ آرزو اور فواد، مائی اماں کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ خاندان کی کسی شادی کا فوٹو تھا۔  
 ”یہ تو وہ ہیں!“ بلیقیس گویا حیرت زدہ رہ گئی۔

تب اسے یاد آیا، بلیقیس نے ہی تو اسے فواد کے آنے کا بتایا تھا شاید وہ اسے پہچان گئی تھی۔  
 ”یہ آپ کی رشتہ دار ہیں جی؟ یہ تو ادھر آتی رہتی ہیں۔ کمال ہے مجھے بتائی نہیں تھا۔“

”کون؟ یہ لڑکی؟“ اسے حیرت ہوئی وہ تو سمجھی تھی کہ بلیقیس فواد کی بات کر رہی ہے۔  
 ”ہاں جی، یہ آرزو بی بی!“ اس نے آرزو کے چہرے پہ انگلی رکھی۔

”ہاں، یہ میری کزن ہے اور یہ ساتھ فواد ہے جو ہمایوں کے پاس آیا تھا۔“

”آیا ہو گا جی۔“ وہ ابھی تک اشتیاق سے آرزو کے کپڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز میں ذرا سی لاپرواہی تھی۔ یک دم محمل کو کچھ کھٹکا۔ اسے لگا وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔

”بلیقیس، یہ وہ ہی بندہ ہے جو اس روز ہمایوں کے پاس آیا تھا جب ہمایوں نے فرشتے کو ڈانٹا تھا؟“ اس نے البم ذرا اس کے قریب کیا۔ ”تمہیں یاد ہے تم نے مجھے بتایا تھا؟“

”ناجی، یہ تو کبھی نہیں آیا۔“

”یہ یہ کبھی نہیں آیا؟“ اسے جھٹکا لگا تھا۔ ”تو پھر وہ کون تھا؟“

”جی نہیں، کوئی آپ کا رشتہ دار تھا۔ آپ کے چچا، تایا کسی کا بیٹا تھا۔“

”میرے چچا کا بیٹا؟ ایک منٹ، یہ یہ دیکھو۔“ وہ جلدی جلدی البم کے صفحے پیچھے کو پلٹنے لگی۔ پھر حسن کی تصویر پر رکی۔  
 ”یہ تھا؟“

”نہیں جی، یہ تو بڑا بابو لوگ ہے بی بی، وہ تو عمر میں کم تھا۔“

”کیا مطلب کم تھا؟“ وہ ابھی۔ بلیقیس متذبذب سی کھڑی تھی جیسے اپنی بات صحیح نہ پہنچا رہی ہو۔

”چھائیہ تو نہیں تھا؟“ اس نے ساتھ لگی و سیم کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ بلیقیس پہلے ناجی میں سر ہلاتے لگی، پھر یک دم رک گئی اور چہرہ جھکا کر غور سے تصویر کو دیکھا۔ کافی دیر وہ تصویر کو بغور دیکھے گئی۔

”ہاں جی، یہ والا تھا، یہ ہی تھا۔“  
 ”تو کیا و سیم؟ وہ ابھی حیران بھی نہ ہو پائی تھی کہ بلیقیس نے معیز کی شکل پہ انگلی رکھی، جو تصویر میں و سیم کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ سدرہ کی منگنی کی تصویر تھی۔“

”معیز؟ وہ معیز تھا؟ معیز آیا تھا؟“ وہ ششدر رہ گئی۔

”یہ ہی تھائی بی، مجھے اچھی طرح یاد ہے، ابھی ذرا بچہ لگ رہا ہے، مگر یہ شاید پرانی تصویر ہے جی، جب ادھر آیا تھا تو اس سے بڑا تھا، میں بھیگ رہی تھیں، قد بھی اونچا لمبا تھا، میں آپ کو کہہ رہی تھی نا کہ عمر میں کم تھا۔“

اور وہ تو ایسی دم بخود بیٹھی تھی کہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ تصویر میں نیمز بارہ سال کا تھا، اب میں کاہو گا اور جب وہ ادھر آیا تھا تو یقیناً ”سترہ برس کا تھا۔ مگر وہ کیوں آیا؟ وہ کیوں ہمایوں سے لڑا؟ وہ دونوں کیوں بلند آواز میں جھگڑتے رہے؟

ہست سے سوال تھے جن کے جواب اسے معلوم نہ

تھے۔ بلیقیس سے پوچھنا بے کار تھا۔ اس نے پہلے جب اس کے کزن کا ذکر کیا تھا تو ایسے تعظیم سے ان اور وہ آئے جیسے الفاظ استعمال کیے تھے کہ وہ بالکل غلط سمجھ بیٹھی۔ مگر خیر، بلیقیس کا تصور نہیں تھا اور بتا نہیں کس کا تصور تھا۔

اس نے بے دلی سے البم بند کیا اور میز پر رکھ دیا۔



چمکیلی صبح برآمدے پہ پھسل رہی تھی۔ بلیقیس پاپ لگائے سفید سنگ مرمر کا چمکتا برآمدہ دھور رہی تھی۔

وہ صبح ناشتے کا وقت تھا۔ ہمایوں کو اس کے کمرے میں ناشتا دے کر بلیقیس اب ادھر مصروف تھی۔ تیمور لنگدھر تھا، اسے کچھ پتا نہیں تھا، وہ آج اپنی فحری تلاوت نہیں کر سکی تھی اور اب ادھر وہیل چیئر پہ بیٹھ کر وہ ہی کرنا چاہا رہی تھی، مگر بار بار دھیان ہٹ جاتا تھا۔

بلیقیس پاپ اٹھا بے برآمدے سے نیچے اتر گئی۔ اب وہ ڈرائیو سے یہ پانی ڈال رہی تھی۔ برآمدے کے فرش پہ کیس نہیں پانی چمک رہا تھا۔  
 دفعتاً ”دروازہ کھلا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔“

ہمایوں عجلت بھرے مصروف انداز میں کف بند کرتا باہر آ رہا تھا۔ اس نے محمل کو ادھر بیٹھے دیکھا یا نہیں، اس کے بے نیاز انداز سے یہ پتا لگانا مشکل تھا۔ وہ سیدھا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

بلیقیس نے جھانڈو اٹھائی اور بھاگ کر پاپ ڈرائیو سے بھاگا۔ چونکدار جو گھاس کاٹ رہا تھا، پھرتی سے آگے بڑھا اور گیٹ کے دونوں پٹ کھول دیے۔  
 وہ گاڑی میں بیٹھا، زور سے دروازہ بند کیا اور پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی نکال کر لے گیا۔

گیٹ کے دونوں پٹ کھلے رہ گئے۔ چونکدار نے ابھی انہیں بند نہیں کیا تھا، وہ واپس درانتی اٹھائے گھاس کی طرف آ گیا تھا۔

بلیقیس پھر سے پاپ کا فوارہ سفید بھری کے ڈرائیو سے پہ ڈالنے لگی۔ وہ سر جھٹک کر اپنی آیات کی طرف

متوجہ ہوئی۔  
 مگر پھر بڑھتے بڑھتے نگاہ پھسلی، پہلے ناخنوں کے کناروں کو دیکھا، پھر ہاتھوں کو، پھر ان سے ہوتی ہوئی پیروں پہ جا گئی اور پھر سے پاپ کے پانی کی طرف بھٹک گئی۔

کھلے گیٹ کے اس پار سامنے والوں کا گیٹ بھی کھلا نظر آ رہا تھا۔ وہ بے دھیانی میں کسی سوچ میں گم اور ہر دیکھے گئی۔ سامنے والوں کے گیٹ کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی، اس کے کندھے پہ پیارا سا پھولے پھولے گالوں والا بچہ تھا۔ ساتھ ہی گاڑی کا دروازہ کھولے ایک گڈ لکننگ سا آدمی مسکرا کر انہیں کچھ کہہ رہا تھا۔ لڑکی ہنس رہی تھی، پھر وہ آدمی جو غالباً ”اس کا شوہر تھا“ گاڑی میں بیٹھ گیا اور لڑکی بچے کا ہاتھ پکڑ کر بائیں بائیں کے انداز میں گاڑی کی طرف ہلانے لگی۔ بچہ قلقاریاں مار رہا تھا۔ آدمی نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی اشارت کرنے لگا۔

ایک کھل اور خوب صورت فیملی۔  
 وہ جیب چاپ ان تینوں کو دیکھے گئی، یہاں تک کہ گاڑی خزانے بھرتی سڑک پہ آگے نکل گئی اور لڑکی بچے کو کندھے سے لگائے گیٹ بند کرنے لگی۔

اس نے ہولے سے سر جھٹکا اور اپنی خاموش بالکل خاموش نظریں واپس قرآن پہ جھکا دیں اور پڑھا کہ آگے کیا لکھا ہوا تھا۔  
 ”اس کی طرف مت دیکھا کرو، جو ہم نے دوسرے جوڑوں کو عطا کیا ہے۔“

محمل نے بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر سر اٹھایا۔ پھر ادھر ادھر گردن گھمائی، بلیقیس اپنے کام میں مگن تھی اور چونکدار اپنے کام میں، وہاں کسی نے اس کی ایک لمحے کی وہ نظر نہیں پکڑی تھی۔ مگر۔ مگر۔

اس نے ذرا سی گردن اوپر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مگر کوئی تھا جو اس کی لمحے بھر کے لیے بھٹکی نگاہ بھی پکڑ لیتا تھا اور کسی دوسرے کو بتاتا بھی نہیں تھا۔ خاموشی سے اسے تنبیہ کر دیتا تھا۔ سمجھا دیتا تھا، بہت احسان تھے اس کے اس پر، وہ تو شکر بھی ادا نہیں کر سکتی



تھی۔  
”بلیقیں! آج کون سا دن ہے؟“ ایک دم اسے خیال آیا تو اسے پکارا۔  
”جمعہ ہے جی۔“ وہ اب پائپ بند کر کے اسے سمیٹ رہی تھی۔

”اوہ اچھا۔“ اسے یاد آیا، آج تو سورہ کہف پڑھنی تھی۔ جانے وہ کیسے بھول گئی، وہ خود کو سرزنش کرتی قرآن کے صفحے پلٹنے لگی۔

جو کیدار گیٹ بند کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا تھا اور بلیقیں اندر وہ برآمدے میں تیارہ گئی تھی، پہلے قرآن سے پڑھنے کا سوچا، مگر سورہ کہف یاد تھی ہی سو قرآن میز پر رکھا اور سرکمرہ کی پشت سے نکار آنکھیں موند لیں۔

کبھی کبھی اس کو لگتا تھا کہ اس کی زندگی مصحف قرآنی کے گرد ہی گھومنے لگی ہے۔ اس کا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں اس کا روائہ نہ ہو۔ ہر لمحے ہر وقت وہ قرآن کو اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اب اس کے بغیر اس کا گزارہ بھی نہ تھا۔  
آنکھیں موندے وہ بسم اللہ پڑھ کر سورہ کہف پڑھنے لگی۔

اس ٹھنڈی صبح میں ہر طرف خاموشی اور میٹھی سی چاشنی چھا گئی تھی۔ وہ آنکھیں موندے اپنی تلاوت کر رہی تھی۔

”ام حسب ان اصحب الکہف۔“  
”والرقیم۔“

ابھی اس نے نویں آیت ”اصحب الکہف“ تک ہی پڑھی تھی کہ کسی نے اگلا لفظ ”والرقیم“ پڑھ دیا۔ اس کے ہلے لب رک گئے۔ بہت حیرت سے چونکتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے کھلے دروازے میں تیمور کھڑا تھا۔ اپنے ٹائٹ سوٹ میں بلوس، کچی نیند سے خمار آلود آنکھیں لیے وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ سالس رو کے اسے دیکھے گئی۔ چند لمحوں کے لیے سارے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ

دونوں بنا پتلیوں کو حرکت دیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔  
اور پھر اسی طرح تیمور کی بھوری آنکھوں کو نگاہوں میں لیے اس نے ہولے سے لب کھولے اور پھر سے وہ آیت دہرائی۔

”ام حسب ان اصحب الکہف۔“ وہ دانستہ رکی تو تیمور کے ننھے سرخ ہونٹ حرکت کیے۔  
”والرقیم۔“

”کانومن اینتا عجبا۔“ اس نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے آیت مکمل کی۔

تیمور اسی طرح ساکت سا جھپکے کی طرح کھڑا تھا جیسے برآمدے اور لان میں مبہوت ہوئی فلق کا حصہ ہو۔

”لوہر آؤ۔“ وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ کسی معمول کی طرح آہستہ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا۔

اس نے اس کے ہاتھ تھامنے کو دونوں ہاتھ بڑھائے اور کسی سحر زدہ شخص کی طرح تیمور نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے لیے۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ اصحب الکہف کے بعد والرقیم آتا ہے؟“

وہ خاموش کھڑا جیسے اسے خود بھی نہ معلوم ہو۔  
”تمہیں سورہ کہف آتی ہے؟“ نرمی سے اس کے ہاتھ تھامے محمل نے پوچھا تو۔

اس نے آہستہ سے سر کو نفی میں ہلایا۔  
”پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”It...it just slipped“ (میرے منہ سے نکل گیا) وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ آنکھیں ابھی تک محمل کے چہرے پہ جمی تھیں۔

اسے یاد تھا کہ تیمور کی پریگینسی میں وہ ہر جمعہ کو یوں ہی بیٹھ کر آنکھیں موندے بلند آواز میں سورہ کہف پڑھا کرتی تھی، تاکہ وہ جنم لینے سے قبل ہی قرآن کا عادی ہو اور شاید وہ واقعی عادی ہو گیا تھا اور شاید

سات سال بعد اس نے یہ آواز سنی تھی۔  
”تمہیں اور سورنیں آتی ہیں؟“

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ وہ اپنے ہاتھ ابھی تک محمل کے ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا۔  
”تمہیں قرآن پڑھنا آتا ہے؟“

اس نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔  
”مسجد جاتے ہو یا کہیں اور سے سیکھا ہے؟“  
”گھر پر قاری صاحب لگوائے تھے ڈیڈی تھے۔“

”کتنی دفعہ قرآن ختم کیا ہے؟“  
”نوٹا نمز۔“

”کیا قاری صاحب کا قرآن بھی یوں ہی سنا کرتے تھے جیسے میرا سنتے ہو؟“

”نہیں۔ وہ بالکل اچھا نہیں بولتے تھے۔“  
”اور میں؟“

”آپ۔۔۔ آپ اچھا بولتی ہو۔“ وہ اب بھی اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

”اور فرشتے کا اچھا لگتا ہے؟“  
”She never reads“ (وہ کبھی نہیں پڑھتی۔)

وہ recite (تلاوت) کو read (پڑھنا) کہہ رہا تھا، مگر وہ وقت اس کی غلطی ٹکالنے کا تھا، نہ ہی یہ بتانے کا کہ وہ کون سا تمہارے سامنے پڑھتی ہوگی، وہ لمحے تو بہت خاص تھے ان کو ضائع نہیں کرنا تھا۔

”تم ایسا پڑھ سکتے ہو؟“  
”نہیں! اس نے نفی میں گردن ہلائی۔“

”پڑھنا چاہتے ہو؟“  
وہ خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا۔

محمل نے آہستہ سے اس کے ہاتھ چھوڑے۔  
”چلو، کل صبح پھر پڑھیں گے۔“ اور سرو ہیل چیئر کی پشت سے نکار آنکھیں موند لیں۔ اس نے سوچا کہ اسے کھلا چھوڑ دے۔ اگر وہ اس کا ہوا تو واپس آجائے گا نہ ہوا تو نہیں آئے گا۔

کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو تیمور ادھر نہیں تھا۔ فرش کا پانی سوکھ چکا تھا۔ چڑیاں اڑ گئی

تھیں۔ سرخ کیرے اپنے بلوں میں جا چکے تھے۔  
چوئیاں بکھر گئی تھیں، سفید لمبی بھی واپس چلی گئی تھی۔

”اور اللہ کی طرف بلائے والی بات سے اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے بھلا۔“

اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ دشمن کو دوست بنانے کا ”حسن“ طریقہ تو اسی آیت میں دے رکھا تھا، اس کی سمجھ میں ذرا دیر سے آیا تھا۔



اگلی صبح وہ لان میں پہلے سے موجود تھی۔ لان میں لاؤنج کی کھڑکی کھلتی تھی اور اس کے سامنے تیمور کا کمرہ تھا۔ آواز کا راستہ صاف اور کھلا تھا۔

پچھلا پورا دن اس نے دانستہ تیمور کا سامنا نہیں کیا۔ وہ بھی کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس کی غالباً چھٹیاں تھیں، سو آج کل گھر پر ہی ہوتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کل قرآن سننا کر اس نے تیمور کو ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا ہے۔ اگر وہ واقعی قرآن کی چاہ رکھتا ہے تو اس کے اندر مزید سننے کی خواہش ضرور بھڑکے گی اور وہ خود ہی چل کر آئے گا۔ اس نے نو ماہ اسے قرآن سنایا تھا۔ وہ سات سالوں میں اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

بلیقیں نے اسے لان میں ہی ٹیپ ریکارڈر سیٹ کر کے دے دیا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ تیمور جاگ چکا ہے یا ابھی سو رہا ہے، پھر بھی اس نے پلے کاٹن دبایا اور آواز اونچی کر دی۔

قاری المشاری کی سورہ کہف جلنے لگی تھی۔ گو کہ قاری حضرات اور بھی بہت اچھے تھے۔

مگر جو بات قاری المشاری کے دھیمے، سوز انداز میں تھی، وہ اسے دنیا میں کہیں نہیں ملی تھی۔ اور سورہ کہف تو شروع ہوتی اور اس کے آنسو بہنے لگتے تھے۔

پہلا رکوع ابھی ختم ہی نہیں ہوا تھا کہ برآمدے کا دروازہ کھلا اور تیمور بھاگتا ہوا برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گھاس پہ آیا۔ پھر اسے بیٹھے دیکھ کر اس کے قدم سست پڑ گئے۔



وہ کہنیوں تک آستھیں فولڈ کیے ہوئے تھا۔ جن کے کنارے اور اس کے بازو کیلے تھے چہرہ اور ماتھے پہ گرے بال بھی کیلے تھے۔ پاؤں بھی دھلے لگ رہے تھے۔ شاید وہ وضو کر کے آیا تھا۔

اس نے مسکرا کر سر قلم کر کے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

دونوں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے وہ مدھر، مترنم سی آواز سنتے رہے جو غار والوں اور کتے والوں کا قصہ بیان کر رہی تھی۔ ان چند نوجوانوں کا قصہ جو کہیں چلے گئے تھے۔ اور دو باغوں کے مالک کا قصہ جسے اپنے مال اور اولاد پہ بہت غرور تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جو اللہ کے ایک بندے سے ملنے اس جگہ کو ڈھونڈ رہے تھے جہاں پچھلی نے سمندر میں راستہ بنایا تھا۔ اور اس گردش کرنے والے آدمی کا قصہ جو سفر کرتا ہوا مشرق و مغرب تک جا پہنچا تھا۔

وہ چار قصے تھے جو قرآن کے درمیان میں رکھ دیے گئے تھے۔ جب وہ ختم ہوئے تو تیمور نے سراٹھایا۔

محمل اب اسٹاپ کاٹن دبا رہی تھی۔

”تمہیں پتا ہے یہ کس کی آواز ہے؟“

تیمور نے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ قاری مشاری تھے۔ تمہیں پتا ہے وہ کون ہیں؟“

اس نے پھر گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

”پہلے وہ سگر تھے۔ پھر انہوں نے قرآن پڑھا تو گلوکاری چھوڑ دی اور قاری بن گئے۔ ان کے گیارہ مختلف ٹونز میں قرآن موجود ہیں، مگر مجھے یہ والی ٹون سب سے زیادہ پسند ہے، تمہیں پسند آئی؟“

”جی!“ وہ بے ساختہ کہہ اٹھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی چیخا، بد تمیزی کرتا پچہ تھا جو اب جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔

چند لمحوں وہ خاموشی سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی۔ (آخر تھا تو وہ بچہ ہی، کتنا ناراض رہ سکتا تھا بھلا؟) اور پھر آہستہ سے بولی۔

”مجھ سے ابھی تک خفا ہو؟“

تیمور نے آنکھیں اٹھا کر خاموشی سے اسے دیکھا، منہ سے کچھ نہ بولا۔

”کیوں خفا تھے مجھ سے؟“

وہ چپ رہا، بالکل چپ۔

”تمہیں میں بہت بری لگتی ہوں؟ تمہارا دل کرتا ہے کہ تم مجھے قتل کرو؟“

”تو تیمور!“ وہ گھبرا کر کہہ اٹھا، پھر ایک دم چپ ہو کر لب کاٹنے لگا۔

”تم پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ تم میرے لیے اسپتال پھول لے کر آتے تھے، مجھ سے اتنی باتیں کرتے تھے، میرے ہاتھوں پہ پیار کرتے تھے، تمہیں بھول گیا ہے؟“

اس کی بھوری آنکھوں میں استغواب پھیل گیا۔

”آپ کو سنائی دیتا تھا سب؟“ زندگی میں پہلی دفعہ اس نے محمل سے یوں بات کی وہ اندر سے تڑپ کر رہ گئی۔

”تمہیں لگتا تھا کہ میں اپنے تیمور کی بات نہیں سنوں گی؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے الناسوال پوچھا۔ تردید نہیں کی، نہ وہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی، نہ ہی اسے مایوس کرنا چاہتی تھی۔

”آپ۔ آپ پھر اس رات بولتی کیوں نہیں تھیں جب ڈیڈی نے مجھے مارا تھا؟ آپ کو سب سننا تھا تو آپ بولتی کیوں نہیں تھیں؟“ اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ غصے سے نہیں دکھ سے۔

”میں بول نہیں سکتی تھی، میں بیمار تھی۔ اور۔ اور۔ ڈیڈی نے تمہیں کیوں مارا تھا؟“

وہ تڑپ کر رہ گئی تھی، مگر ظاہر خود کو کمپوز رکھا۔

”وہ اس چریل (چریل) سے شادی کر رہے تھے۔ میں نے ان سے بہت لڑائی کی تھی۔“

اس کی موٹی موٹی بھوری آنکھیں ڈنڈیا گئیں۔ ”وہ کہتے تھے وہ اس وجہ سے شادی کر لیں گے۔ وہ آپ کو ڈائیورس کروں گے۔ میں ان سے بہت لڑا تھا۔“ اور ایک دم وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”تیمور!“ وہ متحیر رہ گئی۔ اس نے کبھی اسے روتے نہیں دیکھا تھا۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔“

وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ چہرے پہ رکھے رو رہا تھا۔ محمل نے بے اختیار بازو بڑھا کر اس کے ہاتھ تھامے۔

”میرے پاس آؤ۔“ اسے ہاتھوں سے تھام کر کھڑا کیا اور خود سے قریب کیا۔

”ڈیڈی نے کیوں مارا تمہیں؟“

”میں نے کہا تھا میں ان کو اور اس وجہ کو گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری ماں بری عورت ہے۔ میں نے ان پہ بہت شاوٹ کیا، تو انہوں نے مجھے ادھر پھینک مارا۔“ اس نے ہاتھ اپنے آنسوؤں سے بھیکے گال پہ رکھا۔ محمل نے بے اختیار اس کا گل چوم لیا۔ بیٹھی تھی، اور وہ اس کے ساتھ کھڑا رو رہا تھا۔

”تم پھر میرے پاس آئے تھے؟“

”ہاں، میں اتنی دیر تک آپ کے پاس روتا رہا تھا، بٹ یوور سلیدنگ۔ آپ نے مجھے جواب نہیں دیا، آپ نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا، آپ بولتی نہیں تھیں، آپ نے مجھے پیار بھی نہیں کیا۔“

”اور تم مجھ سے ناراض ہو گئے؟“ وہ ہچکیوں کے درمیان آنسو پونچھ رہا تھا۔

”میں تب بیمار تھی، بول نہیں سکتی تھی، لیکن اب میں تمہارے پاس ہوں نا، اب تو تم ناراض نہیں ہو؟“

ہتھلی کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

ایک دم ہی اس کے ادھر سے وجود میں ٹھنڈک اتر آئی۔ اسے لگا وہ مکمل ہو گئی ہے، آپ اسے کسی ہالیوں داؤد نامی شخص کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اس کا تیمور واپس مل گیا تھا۔



وہ دن بہت خوب صورت تھا۔ جب وہ دونوں خوب

رو چکے، تو پھر مل بیٹھ کر خوب باتیں کیں، کبھی لان میں، کبھی ڈاننگ ٹیبل پہ، کبھی لاونج میں اور پھر تیمور کے کمرے میں۔

اس سے بات کر کے محمل کو پتا چلا تھا کہ اس کا یہ رویہ اس رات کا رد عمل تھا جو اس نے ہالیوں سے پھینک کھانے کے بعد محمل کو ریکارڈ گزاری تھی۔ شاید وہ ساری رات روتا رہا تھا، مگر اس کی ماں نے جواب نہیں دیا تو وہ اس سے بدظن ہو گیا۔ مگر پچہ تھا، آخر کتنی دیر ناراض رہ سکتا تھا۔ بالاخر اپنے اندر کا سارا لاوا نکال کر اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا اور یہ بدگمانی کی عادت تو اس نے اپنے ماں اور باپ دونوں سے ورثے میں لی تھی۔ اس کا قصور نہیں تھا۔

اس کی باتوں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آرزو اور ہالیوں کے تعلق کو بھی جانتا ہے، مگر محمل دانستہ اس موضوع کو نہیں چھیڑتی تھی۔ محمل کو اب احساس ہوا تھا کہ تیمور غیر معمولی ذہین اور سمجھ دار لڑکا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کے بارے میں خبر رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کب ہالیوں نے اسے طلاق دی، کب اسے جھڑکا، کب اس پہ چلایا اور دوسری ہر شے جو ان دونوں کے درمیان تھی، وہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے اس سے نفرت ہے، مگر اس کے باوجود وہ اس کے ہر بل کی خبر رکھتا تھا۔ ”مگر ڈیڈی نے آپ کی ڈائیو رس واپس نہ لی تو آپ یہاں سے چلی جائیں گی؟“ وہ دونوں تیمور کے کمرے میں بیٹھے تھے، جب اس نے بے حد اداسی سے کہا۔

”جانا تو ہے۔“

”پر ابھی ٹو اینڈ آف منتھ تو آپ ادھر ہی ہیں نا؟“

آپ کی ڈائیو رس کے تھری منتھس بعد تک آپ نے یہیں رہنا ہے نا۔“

وہ اپنی باتوں سے اسے حیران کر دیتا تھا۔ اس کی عمر اتنی نہیں تھی، مگر وہ ہر بات سمجھتا تھا۔

”ہاں۔“

”ابھی تو ہاف منتھ ہوا ہے، ابھی تو بہت ٹائم ہے، کیا پتا ڈیڈی ڈائیو رس واپس لے لیں۔“



# خوبصورت اور گوری رنگت ہریل

Mod Girl  
Oxygen Active  
**Peach**  
Creme Bleach



”آجاؤ۔“ فرشتے کا چہرہ دکھائی دیا تو محمل نے مسکرا کر کہا۔  
وہ حیران سی دروازے میں کھڑی تھی۔  
”تم اور سنی۔۔۔ اوہ گاڈ۔۔۔ یہ سب کیسے ہوا؟“ وہ حیرت زدہ بھی بھی اور خوش بھی۔  
”بس اللہ کا شکر ہے!“ اس نے مسکراہٹ دیا کر کندھے اچکائے، جیسے خود بھی اس خوش گوار واقعے پہ لاجواب ہو گئی ہو۔  
”آئی ایم سوینی محمل!“ فرط جذبات سے فرشتے کی آنکھیں دہل پانگیں۔ اور اس سے پہلے کہ محمل جواب دے، کچھ کہہ پانی تیمور زور سے بولا۔ ”تو یو آؤ ناٹ آپ جھوٹ بولتی ہو مجھے سب بتا ہے۔“ فرشتے کا چہرہ مائل ہو گیا۔  
”سنی تمہیں۔۔۔“  
”یو کین گوناؤ، جسٹ گواؤ!“ وہ ایک دم زور سے چلایا۔ فرشتے لب کاٹتی ایک دم پٹی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔  
تیمور بھی غصے میں ٹھہریاں کھینچے بیٹھا تھا۔ وہ گئی تو اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور قریب رکھا کانڈ اٹھا کر پھاڑ ڈالا۔ پھر اس کے ٹکڑے دروازے پہ دے مارے۔  
محمل بغور اس کا رویہ دیکھ رہی تھی۔ وہ واپس آکر بیڈ پہ بیٹھا تو اس نے اس کی رقبہ کاپی اٹھائی، تین صفحے پھاڑے اور تیمور کی جانب بڑھائے۔  
”لو! ان کو بھی پھاڑو۔“ تیمور نے پہلے ذرا حیرت سے اسے دیکھا، پھر جھپٹ کر کانڈ پکڑے اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔  
”یہ بھی پھاڑو۔“ وہ اس کی کاپی سے ایک ایک صفحہ نکال کر اسے پکڑاتی جا رہی تھی اور وہ وحشانہ انداز میں اسے پھاڑتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گیا اور سر ہاتھوں پہ گرا دیا۔  
محمل نے اس کی کاپی بند کر کے بیڈ پہ ڈال دی۔  
”انھو پانی پیو اور مجھے بھی پلاؤ۔“  
اس کے اندر کالا باہر آچکا تھا۔ سو خاموشی سے

اس نے سوچا کہ اسے سمجھائے کہ پہلی طلاق واپس نہیں ہوتی بلکہ اس میں رجوع ہو سکتا ہے، مگر اس کے سچے دماغ کو خواہ مخواہ کہاں الجھاتی سو بات بدل دی۔  
”مجھے اپنی بکس دکھاؤ۔“  
”آپ ٹاپک مت چینیج کریں“ میں آپ کو ساری بکس دکھا چکا ہوں۔“  
”اوہ میرا مطلب تھا کہ کاہیز دکھاؤ۔“  
”محمل۔۔۔ محمل۔“ اس سے پہلے کہ تیمور جواب دیتا، اس نے فرشتے کی آواز سنی جو باہر اسے پکار رہی تھی۔ اس کی وہیل چیر دروازے سے ذرا دور تھی۔ سو اس نے تیمور کو اشارہ کیا۔  
”ہٹا! دروازہ کھولو۔“  
”پلیز، نو!“ اس نے برا سامنہ بنایا اور وہیں بیڈ پہ بیٹھا رہا۔  
”محمل۔“ فرشتے کی آواز میں پریشانی تھی۔  
”تیمور، پلیز دروازہ کھولو، خالہ بلا رہی ہیں۔“ وہ چاہتی تو فرشتے کو آواز دے لیتی، مگر ابھی وہ تیمور کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔  
”شی از ناٹ مالی خالہ۔“ وہ منہ ہی منہ میں بدبھارتا اٹھا، دروازہ آدھا کھول کر سر ہا ہر نکالا اور غصے سے بولا۔  
”والس رائگ وریو؟“  
”اوہ سوری سنی! میں محمل کو ڈھونڈ رہی تھی۔“  
فرشتے کی نجل سی آواز آئی۔  
”شی از دومی، پلیز ڈونٹ ڈسٹرب آؤ۔ (وہ میرے ساتھ ہیں پلیز ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔) اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر واپس مڑا تو محمل قدرے خفا سی اس کو دیکھ رہی تھی۔  
”وہ میری بہن ہے، تم اسے مجھ سے بات بھی نہیں کرنے دو گے بیٹا۔“  
”آپ کیوں اس ویج نمبر نو کو پسند کرتی ہیں؟ میرا تو دل کرتا ہے اس سے کہوں اپنا بروم اسٹک اٹھائے اور یہاں سے چلی جائے۔“ بگڑ کر کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر دروازہ کھولا۔



اٹھا اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں بعد واپس آیا تو ہاتھ میں پانی سے بھرا شیشے کا گلاس تھا۔ محل نے گلاس اٹھا پانی پیا اور پھر گلاس واپس اس کی طرف بڑھایا۔

”اس کو بھی دیواریہ مارو اور توڑ دو۔“  
تیمور لب کانٹے اسے دیکھتا رہا گلاس لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

”اسے توڑنا چاہتے ہو؟“  
”نہیں۔“ اب وہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔  
”چلو لان میں چلتے ہیں میں تمہیں ایک اسٹوری بھی سناؤں گی۔“

اس کی بات پہ وہ مسکرا دیا اور گلاس اس سے لے کر دروازہ کھولا پھر ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ وہ آسودگی سے مسکراتی وہیل چیئر کے پیٹوں کو دونوں ہاتھوں سے گھماتی آگے بڑھنے لگی۔

وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ محل کے ہاتھ میں قرآن کے قصوں کی کتاب تھی اور وہ موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تیمور کو سنارہی تھی۔ ان گزرے کچھ دنوں میں اس نے آہستہ آہستہ بہت سارے قصے اسے سنا ڈالے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ تیمور میں قرآن کا شوق پیدا ہو جائے۔

”اور پھر موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل خالی ہو گیا۔“  
دروازہ کھلنے کی آواز پہ وہ لاشعوری طور پر رک گئی۔ جانتی تھی اس وقت کون آیا ہو گا۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔  
”آگے بتا میں نا، اما!“ تیمور چند لمحوں کے انتظار کے بعد بے چین ہو گیا اسی بل ہمایوں اندر داخل ہوا، بے ساختہ ہی محل نے سر اٹھا لیا۔

وہ تھکا تھکا سا سرخ آنکھیں لیے، آستین کنبیوں تک فولڈ کیے چلا آ رہا تھا۔ ان دونوں کو یوں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر ایک دم ٹھٹک کر رکا۔ آنکھوں میں واضح حیرت اور الجھن ابھری۔ وہ پچھلے دنوں کافی دیر سے گھر آ رہا تھا اور سوئے اتفاق وہ ان دنوں کی اس دوستی کے بارے

میں کچھ جان سکا نہ ہی دیکھ سکا۔  
محل نے نگاہیں کتاب پہ جھکا لیں اور آگے بڑھنے لگی۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ تیمور صوفے سے اٹھا اور لپک کر ریسور اٹھایا۔  
”ہیلو؟“ کچھ دیر تک وہ دوسری طرف منتارہا پھر سر ہلایا۔ ”جی وہ ہیں ایک منٹ!“  
وہ ریسور ہاتھ میں پکڑے محل کی طرف گھوما۔ اسی بل ہمایوں کے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔  
”اما! آپ کا فون ہے۔“

”کون ہے؟“ وہ ذرا حیران ہوئی۔ اس کے لیے بھلا کہاں فون آتے تھے۔  
”وہ کہہ رہے ہیں ان کا نام آنا فواد ہے۔“ تیمور نے ریسور اس کی طرف بڑھایا۔ بار لمبی تھی ریسور اس تک پہنچ ہی گیا۔  
”آنا فواد؟“ وہ بے یقینی سے بڑبڑاتی پھر ریسور

تھا۔ کتنی ہی دیر وہ سن سی اسے کان سے لگائے بیٹھی رہی۔

”ہیلو۔“ اور پھر بمثل لفظ لبوں سے نکل ہی پایا تھا کہ کسی نے سختی سے ریسور اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ محل نے بری طرح چونک کر پیچھے دیکھا۔  
”میرے گھر میں یہ سب نہیں ہو گا یہاں سے جا کر جو بھی کرنا ہو کر لیتا۔“ ریسور ہاتھ میں لیے درشتی سے کتاوہ محل کے ساتھ آنا فواد کو بھی سنا چکا تھا۔  
”وہ ششدر سی بیٹھی رہ گئی۔ ہمایوں نے ایک شعلہ بار نگاہ اس پہ ڈالی اور ریسور کھٹاک سے کریڈل پہ ڈال دیا۔ پھر جیسے آیا تھا اسی طرح تیز تیز بیڑھیاں چڑھتا گیا۔

تیمور خاموشی سے مگر بغور سب دیکھ رہا تھا ہمایوں واپس ہو لیا تو وہ آہستہ آہستہ سے محل کی طرف بڑھا۔  
”اما!“ اس نے ہولے سے محل کا ہاتھ چھوا پھر ہلایا۔

وہ اسی طرح شل سی بیٹھی تھی۔  
”ایک دفعہ پہلے بھی ان کا فون آیا تھا آپ کے لیے“

ڈیڈی نے تب ان کو کہا تھا کہ یہاں کوئی محل نہیں رہتی، اما! ڈیڈی ان کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وہ تو آپ کے کزن ہیں نا؟“  
وہ ابھی تک سن نہی پہلی دفعہ ہمایوں نے اتنی زہریلی بات کی تھی۔ یہ اتنا سارا زہر اس کے اندر کس نے بھریا تھا؟

”اچھا چھوڑیں نا مجھے اسٹوری آگے سنائیں۔“ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ ہلا کر اس کو متوجہ کیا۔ محل نے سر جھٹک کر کتاب اٹھالی۔

وہ لان میں بیٹھی تھی اور تیمور پانی کا پائپ اٹھائے گلاس پہ چھتر کاؤ کر رہا تھا۔ قطرے موتیوں کی طرح سبز تھوڑے گہرے تھے۔ وہ چہرے پہ ڈھیروں سکون لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

امام شافعی کہتے تھے آفتاب نش جب بہت ٹھک ہو جاتی ہے تو پھر وہیں سے کھل جاتی ہے ٹھیک ہی کہتے تھے جب اسے زندگی میں کب اندھیرا نظر آنے لگا تھا وہیں پہ فجر کی پہلی کرن چمکی تھی۔ ہمایوں کی بے وفائی کا غم اب اتنا شدید نہیں رہا تھا جتنا اس سے قبل تھا۔ تیمور کی محبت مرہم کا کام کر رہی تھی۔

شام اتر رہی تھی جب اس نے گیٹ پہ آہٹ سنی تو گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ فرشتے نے باہر سے ہاتھ اندر کر کے گیٹ کا ہک کھولا تھا اور اب وہ دروازہ کھول کر داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پینڈ بیگ تھا اور وہ اپنے مخصوص سیاہ عیابا اور اسکارف میں ملبوس تھی۔ جس میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ غالباً مسجد سے آرہی تھی۔ اس وقت وہ ادھر بڑھانے جاتی تھی۔

”السلام علیکم، جلدی آگئیں؟“ اسے آتے دیکھ کر محل نے مسکرا کر مخاطب کیا۔

”ہاں، بس ذرا تھک گئی تھی۔“ وہ تھکان سے مسکراتی اسی کی طرف چلی آئی۔

”کھانا کھالیں، آپ نے دوپہر میں بھی نہیں کھایا نا۔“

”ہاں کھاتی ہوں۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں کہہ کر انگلی سے کپٹی سیلائی۔ اس کی مخروطی انگلی میں چاندی کی وہ بی انگوٹھی تھی جو وہ اکثر دیکھتی تھی۔ جانے کیوں وہ محل کو قدرے پریشان لگی تھی۔

”فرشتے فرشتے؟ مجھے آپ ٹینس لگ رہی ہیں۔“  
”نہیں تو۔“ وہ پھیکا سا مسکرائی۔ تب ہی فاصلے پہ کھڑے تیمور نے پائپ پھینکا اور ان کی طرف آیا۔

”ٹینس بھی ہے تو آپ کیوں کیس (ریوا) کرتی ہیں؟ جسٹ لیو ہر لون!“ وہ بہت غصے اور بدتمیزی سے بولا تھا۔ محل نے فرشتے کی مسکراہٹ کو واضح ماند پڑتے دیکھا اس کا دل دکھا۔

”تیمور، بیٹا! وہ تمہاری خالہ ہیں ایسے بات۔۔۔“  
”جسٹ گوا چلی جاؤ آپ یہاں سے۔“ وہ پیرخ کر چیخا۔ بالکل ہمایوں کا پر تو۔

”سوری سنی!“ وہ خشکی سے انھی بیک ہاتھ میں لیا اور تیز تیز قدموں سے لان کی روشنی پار کر گئی۔

”اور جہاں میری اما ہوں وہاں مت آیا کرو۔“ وہ اس کے پیچھے چلایا تھا۔ محل نے تاسف سے برآمدے میں دیکھا جہاں فرشتے دروازہ بند کر کے گم ہو گئی تھی۔ تیمور ابھی تک لب پیچھے برآمدے کو دیکھ رہا تھا۔

”الف۔۔۔ یہ لڑکا۔۔۔ کیسے سمجھاؤں اسے کہ تمہارے بڑے تمہارے دشمن نہیں ہیں۔“ وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”کچن میں اپنی وہیل چیئر پہ بیٹھی تھی۔ گود میں نوکری تھی جس میں مٹر رکھے تھے۔ تیمور بلیٹس کے ساتھ مرکز تک گیا تھا۔ وہ مٹر چھیلے ہوئے لاشعوری طور پہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

پکن کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہ ویسے بھی اس سمت میں بیٹھی تھی کہ لاؤنج سے نظر نہ آسکتی تھی۔ تب ہی اسے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ قدموں کی چاپ بھی۔ پھر قریب آتی آوازیں۔ مٹر چھیلے اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔



”ایسا کب تک چلے گا ہمایوں؟“ وہ آرزو تھی اور  
تک کر کہہ رہی تھی۔  
”کیا؟“  
”انجان مت بنو۔ ہم کب شادی کر رہے ہیں؟“  
ان کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ وہ دم سادھے بیٹھی  
رہ گئی۔ مٹر کے دانے ہاتھ سے پھسل گئے۔  
”کر لیں گے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“  
”کیا مطلب جلدی؟ اتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہیں  
اسے طلاق دیے ہوئے۔“  
”اس کی عدت ختم ہو لینے دو۔“  
”اور کب ختم ہوگی وہ؟“  
”ایک دو ہفتے رہتے ہیں۔“ وہ رساں سے کہہ  
رہا تھا۔ وہ دونوں وہیں لاؤنج کے وسط میں کھڑے باتیں  
کر رہے تھے۔  
”کیا اس کی عدت کے ختم ہونے سے پہلے ہم  
شادی نہیں کر سکتے؟“  
”نہیں!“ اس کا انداز اتنا سرد اور قطعی تھا کہ پل  
بھر کو آرزو بھی چپ رہ گئی۔  
”مگر ہمایوں۔!“ اس نے کہنا چاہا۔  
”کہنا نہیں!“ وہ اب سختی سے بولا تھا۔ ”مگر تمہیں  
منظور نہیں ہے۔ تو بے شک شادی نہ کرو۔ جاؤ چلی  
جاؤ۔“ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا گیا۔  
”نہیں ہمایوں، سنو، رکو۔“ وہ بوکھلائی ہوئی سی اس  
کے پیچھے لگی۔  
سیڑھیاں چڑھنے کی آوازیں مدھم ہو گئیں۔ وہ  
دونوں اب اس سے دور جا چکے تھے۔  
”ماما!“ کتنی ہی دیر بعد میمر نے اسے پکارا تو اس  
نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔  
”تم کب آئے؟“ وہ سنبھلی۔  
”ماما!“ وہ آہستہ سے اس کے قریب آیا۔ ”آپ رو  
رہی ہیں؟“ اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اس کے  
چہرے پہ گرتے آنسوؤں پہ رکھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ پتا  
نہیں کب یہ آنسو پھسل پڑے تھے۔  
”آپ نہ رونا کریں۔“ وہ اب آہستہ سے اس کے

آنسو صاف کر رہا تھا۔ محل بھیگی آنکھوں سے مسکرائی  
اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔  
”میں تو نہیں رو رہی۔“  
”آپ رو رہی ہیں۔ میں بچہ تھوڑی ہوں۔“ وہ اس  
کی غلط بیانی پہ خفا ہوا۔  
”چھا! اب تو نہیں رو رہی۔ اور شاپ سے کیا  
لائے ہو؟“  
”چپس!“ اس نے چپس کا پیکٹ سامنے کیا۔  
”اور میں اتنی دیر سے کیا ہوا ہوں پر آپ نے ابھی  
تک مٹر نہیں چھیلے یو آر ٹو سلو ماما!“ اس نے مٹر کی  
ٹوکری اس کی گود سے اٹھائی اور کاؤنٹر پہ رکھ دی۔  
”آئیں، پاپر چلتے ہیں۔“  
”رہنے دو میمر، میمر ادل نہیں کر رہا۔“  
”بلیقیں بوا!“ اس کی سنے بغیر بلیقیں کو پکارنے لگا۔  
”ماما کو پاپر لے آؤ۔“  
اور وہ اپنی ناقدری کا غم اندر ہی اندر دباتی رہ گئی۔  
بڑے عرصے سے لائبریری کی صفائی نہیں ہوئی  
تھی۔ وہ کتنے ہفتوں سے سوچ رہی تھی کہ کسی دن  
کروالے آج ہمت کر ہی لی۔  
بلیقیں کو تو کہنے کی دیر تھی۔ فوراً لگ گئی۔ وہ  
دروازے کی چوکھٹ پہ وہیل چیئر پہ بیٹھی ہدایات دے  
رہی تھی۔  
”یہ والی بکس اندر رکھ دو، اس طرف والی سامنے کر  
دو۔ میز سے یہ سب ہٹا لو اور اس والے شیاف میں  
رکھ دو۔“  
جھاڑ پونجھ سے گروا اڑ رہی تھی۔ سالوں سے کسی  
نے کتابوں کو صاف نہیں کیا تھا۔  
”بی بی! ان کو تو کیرا لگ گیا ہے۔“ وہ پریشان سی کچھ  
کتابوں کے کنارے دکھا رہی تھی۔ مارتھ کی پرانی  
کتابیں۔  
”ان کو الگ کر دو۔ اور وہ دراز خالی کرو یہ اس میں  
رکھ دیں گے۔“

”چھا جی!“ بلیقیں اب اسٹڈی ٹیبل کی درازوں  
سے کتابیں نکال رہی تھی۔  
”ان کو اس آخری شیاف پہ نہ سیٹ کر دوں؟“  
اس نے دراز سے نکلنے والے کتابوں کے ڈھیر کی طرف  
اشارہ کیا۔  
”ہاں کر دو۔“ اسے بھلا کیا اعتراض تھا۔ بلیقیں  
پھرتی اور اشہاک سے کتابیں صاف کر کے اوپر لگانے  
لگی۔  
ڈھیر ذرا ہلکا ہوا تو اسے ان کتابوں کے بیچ ایک پھولا  
ہوا خاکی لفافہ رکھا نظر آیا۔  
”یہ لفافہ اٹھا کر دو۔ شاید ہمایوں کے کام کا ہو۔“  
کتابیں سیٹ کرتی بلیقیں رکی اور خاکی لفافہ اٹھا کر  
اسے تھمایا۔  
لفافہ ورنی نہیں تھا، مگر پھولا ہوا تھا۔ اس نے الٹ  
پلٹ کر دیکھا۔  
کوئی نام آتے نہیں لکھا تھا۔ اوپر اکھڑی ہوئی سی ٹیپ  
لگی تھی جیسے کھول کر پھر لگا دی گئی ہو۔  
”پتا نہیں کس کا ہے۔“ ماما کی جستجس کے محل  
نے ٹیپ اتاری اور لفافہ گود میں الٹ دیا۔ ایک عدالتی  
کانڈ اور ساتھ ایک سفید خط کا کور گود میں گرا۔ اس  
نے زرد عدالتی کانڈ اٹھایا۔  
اس کی تہیں کھولیں اور جرے کے سامنے کیا۔  
اسٹامپ پیپر کی تحریر کے نیچے بہت واضح سے دستخط  
تھے۔  
”محمل ابراہیم۔“  
”فرشتے ابراہیم۔“  
وہ بری طرح سے چونکی اور تیزی سے اوپر تحریر پہ  
نگاہیں دوڑائیں۔  
یہ وہی کانڈ تھا جو فواد نے اس سے اور فرشتے سے  
سائن کروایا تھا۔ وسم سے نکاح نہ کروانے کی شرط پہ  
اس کی گردن پہ پستول رکھ کر۔  
مگر یہ ادھر ہمایوں کی لائبریری میں کیا کر رہا تھا؟ وہ تو  
اس معاملے سے قطعی لاعلم تھا۔ یہ موضوع کبھی زیر  
بحث آیا ہی نہیں، بس ایک دفعہ آغا جان کے گھر سے

واپسی پہ ہمایوں نے اسے اپنا حصہ لینے کے لیے کہا تھا  
مگر وہ ٹال گئی تھی۔ اگر وہ براہ راست پوچھتا تو وہ بتا دیتی۔  
پھر فرشتے نے بھی نہیں بتایا کہ یہ کانڈ اس کے ہاتھ  
کیسے لگا اور کیا وہ اسی کی وجہ سے اس سے بدظن تھا؟ مگر  
یہ اتنی بڑی وجہ تو نہیں تھی۔ اور یہ کانڈ ہمایوں کے  
ہاتھ لگا بھی کیسے یہ تو اس کے پاس تھا۔  
اس نے دوسرا سفید لفافہ اٹھایا۔ وہ بے دردی سے  
چاک کیا گیا تھا اس نے اس کے کھلے منہ میں جھانکا۔  
اندر کچھ فوٹو گراف تھے شاید۔  
محمل نے لفافہ گود میں الٹ دیا۔ چند تصویریں اس  
کے گھٹنے پر سے پھسلتی فرش پہ جا گریں اس نے ہاتھ  
جھکا کر تصویروں کو اٹھایا اور سیدھا کیا۔  
وہ فواد اور محل کی تصاویر تھیں۔ فواد اور محمل  
۔۔۔  
وہ ساکت سی ان تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔ ان  
میں وہ کچھ تھا جو کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کی  
فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا فواد اور اس کے کندھے پہ سر رکھے  
محمل۔۔۔ ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے فواد اور محمل۔۔۔ ہاتھ  
میں ہاتھ ڈالے واک کرتی فواد اور محمل۔۔۔ اک ساتھ  
کسی شادی کی تقریب میں رقص کرتے۔ قابل  
اعتراض تصاویر۔ قابل اعتراض مناظر۔ وہ سب جو  
کبھی نہیں ہوا تھا۔  
اس نے پھر سے تصویروں کو الٹ پلٹ کر کے  
دیکھا۔  
اس کا لباس اور چہرہ۔ ہر تصویر میں ذرا الگ تھا۔  
کوئی بچہ بھی بتا سکتا تھا کہ وہ فوٹو شاپ یا اس قسم کی کس  
ٹرک کا کمال ہے۔ پہلی نظر میں واقعی پتا نہیں لگتا تھا۔  
مگر بغور دیکھنے پہ صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ سب نقلی  
ہے ہمایوں خود ایک پولیس آفیسر تھا، وہ ان بچوں والی  
باتوں میں نہیں آسکتا تھا۔ اور کس نے لا کر دیں اس کو  
یہ تصاویر؟  
کیا معین جو ایک دفعہ آیا تھا اسی لیے آیا تھا؟ اس  
کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔  
پزل کے سارے ٹکڑے ایک ساتھ جڑنے لگے۔



آرزو نے کہا تھا کہ وہ ہمایوں کو اس سے چھین لے گی۔ محمل کو سجا سورا اور نشتا بتا دیکھ کر وہ شاید شدید حسد کی آگ میں جلنے لگی تھی۔ اس سے اس کی خوشیاں برداشت نہیں ہو رہی تھیں پھر اسد چچا کی ناگہانی وفات کے بعد یقیناً وہ لوگ مالی کرانسمز کا شکار ہوئے ہوں گے۔ ایسے میں محمل کی طویل بے ہوشی نے آرزو کو امید دلائی ہوگی۔ اور شاید یہ سب ایک سوچا سمجھا پلان تھا۔

یہ جعلی تصاویر بنا کر محمل اور فرشتے کا دستخط شدہ کانڈ ہمایوں کو دکھا کر اس نے ہمایوں کو بھڑکایا ہوگا۔ مگر کیا ہمایوں چھوٹا بچہ تھا جو ان کی باتوں میں آجاتا؟ کیا ایک مجتہد پولیس آفیسر اس قسم کے پکناٹھیل کا شکار بن سکتا تھا؟ کیا بس اتنی سی باتوں پر ہمایوں اتنا بدظن ہو گیا تھا؟ اپنی بیوی سے دوری اور آرزو سے برہتا ہوا التفات۔ پزل کا کوئی ٹکڑا اپنی جگہ سے غائب تھا۔ پوری تصویر نہیں بن رہی تھی۔

اس نے بے اختیار ہرگز مردوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ دماغ چکر کر رہ گیا تھا۔

”بی بی، تسی ٹھیک ہو؟“ بلتیس نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ چونکی۔

”ہاں، مجھے باہر لے جاؤ۔“ اس نے جلدی سے تصویریں لفافے میں ڈالیں، مبادا بلتیس انہیں دیکھ نہ لے۔

پزل کا کوئی ٹکڑا واقعی غائب تھا۔

وہ اندر داخل ہو رہا تھا، یونیفارم میں ملبوس، کیپ ہاتھ میں لیے، وہ چند قدم چل کر قریب آیا، اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر لمحے بھر کو رکا۔

”السلام علیکم، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”بولو۔“ وہ اکھڑے تیوروں سے سامنے آکھڑا ہوا۔

”آپ بیٹھ جائیں۔“

”میں ٹھیک ہوں بولو۔“

محمل نے گہری سانس لی اور الفاظ ذہن میں مجتمع کیے۔

”مجھے صرف ایک بات کا جواب چاہیے ہمایوں! بس ایک بار مجھے بتا دیں کہ آپ میرے ساتھ ایسے کیوں کر رہے ہیں۔“ آنسوؤں کا گولا اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا۔

”کیا کر رہا ہوں؟“

”آپ کو لگتا ہے آپ کچھ نہیں کر رہے؟“ وہ سنجیدہ اور بے نیاز تھا۔

”مگر آپ اتنے کیوں بدل گئے ہیں؟ آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چٹکڑ کر بیٹھی۔

”پہلے میں کاٹھ کا الو تھا، جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ ہوش اب آیا ہے، دیر ہو گئی، مگر خیر۔“

”ہو سکتا ہے، کسی نے اب آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہو۔ آپ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیں۔“

اس نے سوچا تھا وہ اس کی منت نہیں کرے گی، مگر اب وہ کر رہی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس سے اسے بے حد محبت تھی، وہ اسے نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

”صفائی کا موقع ان کو دیا جاتا ہے جن پر شک ہو۔ مگر جن پر یقین ہو، ان پر صرف حد جاری ہوتی ہے۔“ وہ بہت چپا چپا کر بولا تھا۔

”یہ آپ کی اپنی بنائی گئی حدود ہیں ایس بی صاحب! لوگوں کو ان کے اوپر نہ پرکھیں۔ کھوٹے کھرے کو الگ کرنے کا پیمانہ دل میں ہوتا ہے، ہاتھوں میں نہیں۔“

کیس آپ کو پچھتاوانہ پڑ جائے۔“

”کھوٹے کھرے کی پہچان مجھے بہت دیر سے ہوئی ہے محمل بی بی! جلدی ہوتی تو اتنا نقصان نہ اٹھاتا۔“

ان تین ماہ میں پہلی دفعہ اس نے محمل کا نام لیا تھا۔ وہ اداسی سے مسکرا دی۔

”مگر میں کھوٹی ہوں تو جس کے پیچھے مجھے چھوڑ رہے ہیں، اس کے کھرے پن کو بھی ماپ لیجئے گا۔“

کیس پھر دھوکا نہ ہو جائے۔“

”وہ تم سے بہتر ہے۔“ چند لمحے خاموش رہ کر وہ سرد لہجے میں بولا اور ایک گہری چیمٹی ہوئی نگاہ اس پر ڈال کر بیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نم آنکھوں سے اسے زینے چڑھتے دیکھتی رہی۔ آج ہمایوں نے اپنی بے وفائی پر مرگادی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے برش لیے مغموم، گرم صم سی بیٹھی تھی، جب فرشتے نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

”میری چھوٹی بہن کیا کر رہی ہے؟“ اس نے چوکھٹ سے ٹیک لگا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔“ محمل نے مسکرا کر گروں موڑی۔ اس کے کھلے بال شانوں پر گرے تھے۔

”تو کچھ خاص کرتے ہیں۔“ وہ اندر چلی آئی۔ فیوزی شلوار قمیص پہ سلیقے سے سر پہ ڈپٹہ لیے وہ ہمیشہ کی طرح جہت ترو تا رہ لگ رہی تھی۔

”تمہارے بال ہی بناؤں لاؤ۔“ اس نے رساں سے کہتے ہوئے برش محمل کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے کھلے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹا۔

”بس اب تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ اب پیار سے اس کے بالوں میں اور سے نیچے برش کر رہی تھی۔ وہ محمل کی وہیل چیئر کے پیچھے کھڑی تھی، محمل کو آئینے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

”تم نے آگے کا کیا سوچا؟“

”پتا نہیں، جب عدت ختم ہو جائے گی تو چلی جاؤں گی۔“

گی۔“ وہ بے زار ہوئی۔

”لیکن کدھر؟“ فرشتے نے اس کے بالوں کو سلجھا کر سمیٹ کر اونچا کیا۔

”اللہ کی دنیا بہت وسیع ہے، پہلے آغا جان کو ڈھونڈوں گی، اگر وہ نہ ملے تو مسجد چلی جاؤں گی۔ مجھے امید ہے کہ مجھے ہاسٹل میں رہنے دیا جائے گا۔“

”ہوں۔“ اس نے اونچی سی پونی باندھی، پھر ان بالوں کو دوبارہ سے ذرا سا برش کیا۔

”اور آپ نے کیا سوچا؟ میرے بعد تو آپ کو بھی جانا ہوگا۔“

”میں شاید ورکنگ ویمن ہاسٹل چلی جاؤں، پتا نہیں ابھی کچھ ڈیپارٹمنٹ نہیں کیا، خیر چھوڑ دو، آج میں نے چائینز بنایا ہے، تمہیں منچورین پسند ہے نا؟ اب فائنٹ چلو، کھانا کھاتے ہیں۔“ اس نے محمل کی وہیل چیئر پیچھے سے تھام کر اس کا رخ موڑا۔

اب وہ کیا بتاتی کہ عرصہ ہوا، ڈالتے محسوس کرنا چھوڑ دیے ہیں۔ مگر ایسی مایوسی کی باتیں اللہ کو ناراض کر دیتی ہیں، اسی لیے چپ رہی۔ ہمایوں کی طرف سے دل اتنا دکھا ہوا تھا کہ ایسے میں فرشتے کا دھیان ہٹانا اچھا لگا۔

ڈاننگ ٹیبل پر کھانا لگا ہوا تھا۔ گرم گرم چاولوں کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔

”تیمور کدھر؟“ وہ پوچھتے پوچھتے رک گئی۔ پھر تھک کر بولی۔ ”میں کیا کروں جو وہ آپ کو ناپسند کرنا چھوڑ دے؟“

”یہ چاول کھاؤ، بہت اچھے بنے ہیں۔“ فرشتے نے مسکرا کر ڈش اس کے سامنے رکھی، اس کا ضبط بھی کمال کا تھا۔

”تیمور کی ساری بد لحاظیوں پر میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ بھیگ گیا۔

”او نہوں، جانے دو، میں مائنڈ نہیں کرتی، خالہ بھی ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔“

محمل بھیگی آنکھوں سے ہولے سے ہنس دی۔

فرشتے نے رک کر اسے دیکھا۔ ”کیوں؟ کیا نہیں



ہوتی؟

”میرے بھانجے نہیں ہیں، ورنہ ضرور اپنی رائے دیتی، لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہی فرمایا ہے تو آف کورس ٹھیک ہے۔“

”کیا؟“ فرشتے انہیں۔

”یہ ہی کہ خالہ ماں جیسی ہوتی ہے، یہ ایک حدیث ہے۔“

”اوہ اچھا؟ مجھے بھول گیا تھا۔“ فرشتے سر جھٹک کر مسکرا دی اور چادر اپنی پلیٹ میں نکالنے لگی۔

\*\*\*

وہ دن اپنی دانست میں ”ہمایوں کے گھر میں“ اس کا آخری دن تھا۔ کل دپہر اس کی عدت کو تین قمری ماہ مکمل ہو جانے تھے اور تب وہ شرعی طور پر ہمایوں کی بیوی نہ رہتی اور پھر اس گھر میں رہنے کا جواز بھی ختم ہو جاتا۔

آج وہ صبح اترتے ہی لان میں آ بیٹھی تھی۔ چڑیاں اپنی مخصوص بولی میں کچھ گنگنا رہی تھیں۔ گھاس چمن سے گیلی تھی۔ سیاہ بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پر جا بجا بکھری تھیں۔ امید تھی کہ آج رات بارش ضرور ہوگی۔

شاید اس کی اس گھر میں آخری بارش۔ فرشتے صبح جلد ہی کسی کام سے باہر گئی تھی۔ ہمایوں رات دیر سے گھر آیا تھا اور صبح سویرے نکل گیا تھا۔ تیمور اندر سو رہا تھا۔ اور بلقیس اپنے کوارٹر میں تھی۔ سو وہ لان میں تنہا اور مغموم بیٹھی چڑیوں کے اداس گیت سن رہی تھی۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی کانچ سی بھوری آنکھوں سے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

اس گھر کے ساتھ اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ زندگی کا ایک بے حد حسین اور پھر ایک بے حد تلخ دور اس نے گھر میں گزارا تھا۔ یہاں اسی ڈرائیو وے پر وہ پہلی دفعہ سیاہ ساڑھی میں اتری تھی اس وقت جب اس کی مشکلات کا آغاز ہوا تھا۔ پھر ادھر ہی وہ سرخ کام دار جوڑے میں دلہن بنا کر لائی گئی تھی، کبھی وہ

ادھر ملکہ کی حیثیت سے بھی رہی تھی، مگر خوشی کے دن جلدی گزر جاتے ہیں، اس کے بھی گزر گئے تھے۔ ایک سیاہ تاریک نیند کا سفر تھا اور وہ بہت نیچے لا کر پھینک دی گئی تھی۔

”ماما۔“ تیمور نیند بھری آنکھیں لیے اس کا شانہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا، پھر مسکرا دی۔

”ہاں بیٹا! اس نے بے اختیار پیار سے اس کا گال چھوا۔

”کیوں رو رہی ہیں اتنی دیر سے؟ کب سے دیکھ رہا ہوں۔“ وہ مضمومت بھری فکر مندی سے اس کے ساتھ آ بیٹھا۔ وہ ٹائٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔ غالباً ابھی جاگا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں۔“ محل نے جلدی سے آنکھیں رگڑیں۔

”آپ بہت روتی ہیں ماما۔ ہر وقت روتی ہی رہتی ہیں۔“ وہ خفا تھا۔

”مجھے لگتا ہے آپ دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ روتی ہوں گی۔“

”نہیں تو اور تمہیں پتا ہے کہ دنیا کے سارے لوگوں سے زیادہ آنسو کس انسان نے بہائے تھے؟“

”کس نے؟“ وہ حیرت بھرے اشتیاق سے اس کے قریب ہوا۔

”ہمارے باپ آدم علیہ السلام نے جب ان سے اس درخت کو چھونے کی غلطی ہوئی تھی۔“ وہ نرمی سے اس کے بھورے بالوں کو سلواتی بنا رہی تھی، اسے تیمور کو اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا تھا، اس کا ذہن ہٹانے میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئی تھی۔

”چھا! وہ حیران ہوا۔“ اور ان کے بعد؟

”ان کے بعد داؤد علیہ السلام نے جب ان سے ایک فیصلے میں ذرا سی کمی رہ گئی تھی۔“

”اور ان کے بعد؟“

”ان کے بعد؟“ اس نے گہری سانس لی۔ ”پتا نہیں بیٹا! یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ آپ بھی بہت روتی

ہیں مگر آپ کو پتا ہے آپ جیسی مدر کسی کی نہیں ہیں۔ میرے کسی فریڈ کی بھی نہیں، کوئی نیچر بھی نہیں۔

”میرے جیسی کیسی؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”آپ جیسی Noble اور Honourable۔ آپ کو پتا ہے، آپ میرے لیے پوری دنیا میں سب سے زیادہ آئرلینڈ اور نوبل ہیں۔“

”جبکہ میں ایسی نہیں ہوں۔ تمہیں پتا ہے؟“

noble کون تھے؟

محمل نے ایک گہری سانس لی۔

”یوسف علیہ السلام جو پیغمبر کے بیٹے، پیغمبر کے پوتے اور پیغمبر کے پرپوتے تھے۔“

”وہ کیوں ماما؟“

”وہ کیوں؟“ اس نے زیر لب اس کا سوال دہرایا۔

یہ اختیار آنکھوں میں اداسی چھا گئی۔ ”کیونکہ شاید وہ بہت صبر کرنے والے تھے اور الفاظ لیوں پہ ٹوٹ گئے۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔

”بھانجے والی نہیں ہوتی۔“

”ہنا میں نانا۔“ وہ بے چین ہوا۔ ”میں جب بھی آپ سے حضرت یوسف کی اسٹوری سنتا ہوں۔ آپ

یوں ہی اداس ہو جاتی ہیں۔“

”پھر کبھی بتاؤں گی، تمہارا اسکول کب کھل رہا ہے؟“ اس نے بات پلٹ دی۔

”منڈے کو۔“

”اور تمہارا ہوم ورک دن ہے؟“

”یہ باتیں چھوڑیں، مجھے پتا ہے آپ اپ سیٹ ہیں۔ کل آپ اور ڈیڈی ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں گے؟“ وہ تھیلیوں پہ چہرہ گرائے، اداسی سے بولا۔

”ہاں! ہو تو جائیں گے، تم میرے ساتھ چلو گے یا ڈیڈی کے پاس رہو گے؟“ اس نے خود کو بے پروا ظاہر کرنا چاہا۔

”میں آپ کے ساتھ جاؤں گا، اس چڑیل کے

ساتھ نہیں رہوں گا۔ مجھے پتا ہے ڈیڈی فوراً شادی کر لیں گے۔“ اسے شاید آرزو بہت بری لگتی تھی۔ وہ محمل کو اس پہ ترجیح دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا، ہمایوں نے کہا تھا، وہ اس سے بہتر ہے۔

”وہ مجھ سے بہتر ہے تیمور؟“ وہ ہمایوں کی اس زہریلی بات کو یاد کر کے پھر سے دکھی ہو گئی۔

”کون؟“ تیمور کی سفید ملی بھانکتی ہوئی اس کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔ وہ جھک کر اسے اٹھانے لگا۔

”آرزو۔“ بہت دفعہ سوچا تھا کہ بچے سے یہ معاملہ ڈسکس نہیں کرے گی، مگر وہ نہیں سکی۔

”آرزو آئی؟“ تیمور ملی کو بازوؤں میں اٹھا کر سیدھا ہوا۔ ”وہ جو آپ کی کزن ہیں، جو ادھر آتی ہیں؟“

”ہاں، وہ ہی۔“

”وہ آپ سے اچھی تو نہیں ہیں، نہیں بالکل نہیں۔“ وہ سوچ کر نفی میں سر ہلانے لگا۔

”پھر تمہارے ڈیڈی کیوں اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟ کیا تم اسے ماں کے روپ میں قبول کر سکو گے؟“

”آپنا خود کو سمجھایا تھا کہ بچے کو درمیان میں انوالو نہیں کرے گی، مگر ہمایوں کی اس روز کی بات ابھی تک کہیں اندر چبھ رہی تھی، لیکن پھر کہہ کر خود ہی پچھتائی۔

”چھوڑو، جانے دو، یہ ملی ادھر دکھاؤ۔“

مگر تیمور الجھا الجھا سانس سے دیکھ رہا تھا۔ ملی ابھی تک اس کے بازوؤں میں تھی۔

”ڈیڈی، آرزو آئی؟“ شادی کر رہے ہیں؟“ اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی۔

”تمہیں نہیں پتا؟“

”آپ کو یہ کس نے کہا ہے؟“ وہ کنفیوزڈ بھی تھا اور حیرت زدہ بھی۔

”تمہارے ڈیڈی نے بتایا تھا اور ابھی تم خود کہہ رہے تھے کہ وہ اس سے شادی کر لیں گے۔“

تیمور اسی طرح ابھی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ موتی ملی اس کے سبھے سبھے ہاتھوں سے پھسلنے کو بے تاب کسمسمار ہی تھی۔

بے تاب کسمسمار ہی تھی۔

بے تاب کسمسمار ہی تھی۔





## فیس فریش کلینزر کریم

پانچ اضافی خوبیوں کے ساتھ

- 1 چھائیوں، جھریوں، دھبوں اور کالے نشانات کو مکمل طور پر صاف کرے۔
- 2 آبی سکن، نارمل سکن، اور ڈرائی سکن کیلئے یکساں مفید ہے۔
- 3 یہ ہر قسم کے معراثرات سے پاک کریم ہے۔
- 4 مرد و خواتین کیلئے یکساں مفید ہے۔

بہترین نتائج کے لئے کم از کم 15 دن استعمال کریں

www.facefreshproducts.com

”مگر تیمور! وہ میری بہن ہے۔“ اس کی آواز بونے لگی تھی۔  
”آپ نے نہیں دیکھا؟ جب وہ ڈیڈی کے ساتھ شام کو باہر جاتی ہیں؟“ ایک دفعہ وہ مجھے بھی لے گئے تھے وہ سمجھتے ہیں میں بچہ ہوں، مجھے کچھ پتا نہیں چلتا۔“

”مگر تیمور! وہ تو میری بہن ہے۔“ وہ بکھری شکست خوردہ سی کھٹی کھٹی آواز میں چلائی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کوئی دھیرے دھیرے اس کی جان نکال رہا ہے۔ تیمور کیا کہہ رہا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔  
”مجھے اسی لیے وہ اچھی نہیں لگتی ڈیڈی، بس اس کی وجہ سے ڈیڈی آپ کو پیار کر رہے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا؟ جب وہ شام کو ڈیڈی کے ساتھ باہر

رہتے ہیں؟“  
”نہیں، تم غلط کہہ رہے ہو، شام کو تو وہ مسجد جاتی ہیں۔“

اسے یاد آیا، شام کو فرشتے مسجد جاتی تھیں۔ یقیناً تیمور کو غلط فہمی ہوئی ہوگی اس نے غلط سمجھا ہوگا۔  
”مسجد؟“ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔  
”یہ ساتھ والی مسجد؟“ ماما، آپ کدھر رہتی ہیں؟ فرشتے تو کبھی مسجد نہیں گئی۔“

”وہ۔۔۔ وہ ادھر قرآن پڑھاتی ہے، تمہیں نہیں پتا تیمور! وہ۔۔۔“  
”وہ تو کبھی قرآن نہیں پڑھتی، میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔“

”نہیں! وہ مجھ سے اور تم سے زیادہ قرآن پڑھتی ہے۔ اس نے۔۔۔ اس نے ہی تو مجھے قرآن سکھایا تھا۔ تم غلط کہہ رہے ہو، وہ ایسے نہیں کر سکتی۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے اسے جھٹلا رہی تھی۔  
”آپ نے کبھی اس کو قرآن پڑھتے دیکھا؟ مسجد جاتے دیکھا؟“

”نہیں۔۔۔ وہ جو فرشتے کے دفاع میں تیمور کو جھٹلاتے کے لیے کچھ کہنے لگی تھی، ایک دم رک گئی۔  
اس نے اسپتال سے آکر کبھی فرشتے کو مسجد جاتے

”آرڈو آئی سے؟ نہیں ماما ڈیڈی تو ان سے شادی نہیں کر رہے۔“  
”مگر تم نے۔۔۔“ لیکن تیمور کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔  
”وہ تو فرشتے سے شادی کر رہے ہیں۔ آپ کو نہیں پتا؟“

اسے لگا کسی نے ڈھیروں پتھر اس کے اوپر لڑھکا دیے ہوں۔  
”تیمور! وہ درشتی سے چلائی تھی۔“ تم ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟“  
بلی سسم کر تیمور کے بازوؤں سے نیچے کودی۔  
”آپ کو نہیں پتا ماما؟“ وہ اس سے بھی زیادہ حیران تھا۔

”تم نے ایسی بات کی بھی کیسے؟ ماما! گاؤں وہ میری بہن ہے، تم نے اتنی غلط بات کیوں کی اس کے بارے میں؟“ غصہ اس کے اندر سے ابلتا تھا۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتی کہ تیمور ایسے کہہ سکتا ہے۔

”ماما! آپ بے شک ڈیڈی سے پوچھ لیں، فرشتے سے پوچھ لیں۔ وہ دونوں شادی کر رہے ہیں۔“  
”نہیں! آپ جسٹ شٹ اپ، تم اس لڑکی کے بارے میں ایسی بات کر رہے ہو جو میری بہن ہے؟“  
”جی ماما! اسی لیے تو ڈیڈی نے آپ کو ڈائیو رس دی ہے، بی کاوشی از پور سسٹر اور مسلم ایک ٹائم پہ وہ سسٹرز سے شادی نہیں کر سکتے۔“

مجل کا دل غ بھک سے اڑ گیا۔ وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔  
”آئی تھا! آپ کو پتا ہے، میں نے آپ کو کہا تو تھا کہ ڈیڈی اس چڑیل سے شادی کر رہے ہیں۔“  
اور تیمور فرشتے کو بھی چڑیل کہتا تھا، وہ کیوں بھول گئی؟ اس کا دل غ بری طرح چکرانے لگا تھا۔  
”نہیں تیمور! وہ میری بہن ہے۔“ اس کی زبان لڑکھائی۔

”وہ اسی لیے تو ادھر ہمارے ساتھ رہتی ہے، ماما کہ جب آپ چلی جائیں تو وہ ڈیڈی سے شادی کر لے۔“



نہیں دیکھا تھا، کبھی قرآن پڑھتے نہیں دیکھا تھا، ہاں نمازیں وہ ساری پڑھتی تھی۔  
”کم آن ما، آپ بلیقےس بوا سے پوچھ لیں، وہ مسجد نہیں جاتی، کیا آپ کو اس نے خود کہا ہے کہ وہ مسجد جاتی ہے؟“ اور تیمور کے سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

”اسپتال کی وجہ سے صبح کی کلاسز لینا ممکن نہیں تھا۔“ فرشتے نے تو اس کے استفسار پر مبہم سا جواب دیا تھا۔ باقی سب اس نے خود فرض کر لیا تھا۔  
تو کیا تیمور سچ کہہ رہا تھا؟ نہیں، پرگز نہیں، فرشتے اس کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو اس کی بہت پیاری، بہت خیال رکھنے والی بہن تھی، وہ بھلا کیسے۔

”وہ مسجد نہیں جاتی، وہ ڈیڈی کے ساتھ جاتی ہے، پہلے ڈیڈی گاڑی پہ نکلتے ہیں، پھر وہ باہر نکلتی ہے، اور کالونی کے اینڈ پو ڈیڈی اس کو پک کر لیتے ہیں، تاکہ بلیقےس بوا کو تانہ چلے۔ میں نے تیسرے سے بہت دفعہ دیکھا ہے، صبح بھی وہ ڈیڈی کے ساتھ ہی گئی تھی۔“  
وہ پھر ہنسی سن رہی تھی۔

”جب آپ اسپتال میں تھیں تب بھی وہ یوں ہی کرتے تھے، پر میں کوئی چھوٹا بے بی تو نہیں ہوں، مجھے سب سمجھ آتا ہے۔“

”یہ سب کب ہوا؟ کیسے ہوا؟“ وہ متحیر، بے یقین سی سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ تیمور آگے بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا، مگر وہ نہیں سن رہی تھی، تمام آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ سب چہرے مٹ گئے تھے، ہر طرف اندھیرا تھا، سناٹا تھا۔

”اما! آپ ٹھیک ہو؟“ تیمور نے پریشانی سے اس کا ہاتھ ہلایا۔ وہ ذرا سی چوکی۔ آنکھوں کے آگے جیسے دھند سی چھا رہی تھی۔

”مجھے اکیلا چھوڑ دو بیٹا۔“ اس نے بے اختیار چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا۔  
”ابھی۔۔۔ ابھی جاؤ یہاں سے پلیز۔“

چند لمحے وہ اداسی سے اسے دیکھتا رہا، پھر جھک کر

گھاس پہ بیٹھی موٹی سفید ملی اٹھائی اور اپس پلٹ گیا۔  
”کیا یہ ہی واحد وجہ ہے؟“  
”کیا تمہیں بالکل امید نہیں ہے کہ وہ رجوع کرے گا؟“

”کیا تم خود کو اتنا اسٹراٹک فیل کرتی ہو کہ حالات کا مقابلہ کر لو گی؟“ اس کے ذہن میں فرشتے کی باتیں گونج رہی تھیں۔

ہر شام ہمایوں گھر سے چلا جاتا۔ کسی دوست کے پاس، ہر شام فرشتے بھی گھر سے چلی جاتی۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کدھر جاتی ہے۔ اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ حمل کی عدت ختم ہونے کے بعد کدھر جائے گی؟ اور وہ ابھی تک ادھر کیوں رہ رہی تھی؟ کیا صرف حمل کی کیئر کے لیے؟ وہ کیئر تو کوئی نرس بھی کر سکتی تھی۔ پھر وہ کیوں ان کے گھر میں تھی؟

اس نے کبھی فرشتے کو قرآن پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ جس روز وہ مسجد گئی تھی۔ فرشتے ادھر نہیں تھے۔ وہ شام تک وہیں رہی، مگر وہ ادھر نہیں آئی۔ وہ غلط فہمی کا شکار رہی اور فرشتے نے اس کی غلط فہمی نہیں دور کی۔  
اور آرزو؟ اس کا کیا قصہ تھا؟ وہ گواہ تھی کہ ہمایوں اس سے شادی کر رہا تھا۔ اس نے خود آرزو سے یہی کہا تھا مگر جب حمل نے پوچھا تھا تب اس نے کیا کہا تھا، یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔ اس نے کبھی نہیں کہا کہ وہ آرزو سے شادی کر رہا ہے۔ فرشتے نے کبھی اس کے اور آرزو کے غیر واضح تعلق پر فکر مند نہیں ظاہر کی۔ وہ سب کسی سوچی سمجھی پالیسی کا حصہ تھا، وہ دونوں جانتے تھے اور ایک اسی کو بے خبر رکھا تھا، وہ تم سے بہتر ہے۔ یہ ہی کہا تھا ہمایوں نے، اور وہ یقیناً ”فرشتے کی بات کر رہا تھا۔“

لیکن وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ وہ اس کے گھر میں خیانت کیسے کر سکتی ہے؟ وہ تو قرآن کی طالبہ تھی، وہ تو سچی تھی، وہ تو امانت دار تھی۔ پھر وہ کیوں بدل گئی؟ وہ تو انھوں کی امانت کا خیال رکھتی تھی، رشتوں میں خیانت کیسے کر گئی؟  
سوچ سوچ کر اس کا دل غمناک رہا تھا۔ دل ڈوبا جا رہا

تھا۔ آج اسے لگا تھا کہ سب دھوکے باز نکلے تھے، سب دھوکے نکلے تھے۔ ہر شخص اپنی زمین کی طرف جھکا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا، کوئی بھی نہیں، وہ کتنی ہی دیر ہاتھوں میں سرگرائے بیٹھی رہی۔

بہت سے لمحے سر کے تواسے یاد آیا کہ جہاں سب بدل گئے تھے، وہاں کوئی نہیں بھی بدلا تھا۔ جہاں سب نے دھوکا دیا، وہاں کسی نے اس کا خیال بھی رکھا تھا۔ جہاں سب ساتھ چھوڑ گئے، وہاں کسی نے سہارا بھی دیا تھا۔

”اور!“ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا اور پھر دھیرے سے چیل چیر کے بہنوں کو اندر کی جانب موڑا۔

اس کے کمرے میں شیفت کے اوپر اس کا سفید جلد والا محض قرآن رکھا تھا۔ اس نے سرعت سے اسے اٹھایا۔ اس وقت اسے اس کی بے حد ضرورت تھی۔

صحف کے نیچے اس کا پرانا رجسٹر رکھا تھا۔ اس نے قرآن اٹھایا تو رجسٹر پھسل کر نیچے جا گرا۔ حمل نے ایک ہاتھ میں قرآن پکڑ لیا، جھک کر رجسٹر اٹھایا۔ وہ درمیان سے کھل گیا تھا۔ اسے بند کر کے واپس رکھتے ہوئے وہ ٹھہری گئی، کھلے صفحے پر سورہ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر لکھی تھی جس پر وہ ہمیشہ الجھتی تھی۔ حطنتہ اور حطنتہ۔ یہ صفحہ بہت دفعہ کھولنے کے باعث اب ریشم کھولتے ہی یہ کھل جاتا تھا۔

کھلا ہوا رجسٹر اس کے دائیں ہاتھ میں تھا، اور قرآن بائیں میں، دونوں اس کے بالکل سامنے تھے۔ رجسٹر کی سطر حطنتہ کا مطلب ہوتا ہے گن۔ کے آگے صفحہ ختم تھا۔ وہ بے اختیار اس سطر کو قرآن کے سفید کور کے قریب لائی جہاں نظاما سام لکھا تھا۔

اس نے گن اور م کو ملایا۔ دونوں کے درمیان ایک، ایک ننھا سا نقطہ تھا۔ اس نے نقطوں کو جوڑا، احوال لفظ مکمل ہو گیا۔

”گندم۔“  
وہ ننھے نقطے والے دو حصے تھے۔  
اسے یاد آیا وہ غلطی سے قرآن پر رجسٹر رکھ کر لکھ

رہی تھی۔ صفحہ ختم ہوا تو لاشعوری طور پر اس نے لفظ قرآن کے کور پر مکمل کر دیا۔ اسی وقت اسے کلاس انخارج سے ڈانٹ پڑی تو یہ بات ذہن سے محو ہو گئی۔ وہ کبھی جان ہی نہ پاتی کہ یہ منامنا سام اس ادھورے لفظ کی تکمیل تھا۔

آج برسوں بعد وہ قصہ مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک روشنی کا کوند اسارا پکا تھا اور ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

بنی اسرائیل کو شہر کے دروازے میں داخل ہونے سے قبل بخشش مانگنے کا حکم ملا تھا۔ مگر وہ گندم مانگتے رہے۔ بخشش نہیں مانگی۔ یہ بنی اسرائیل کی ریت تھی اور یہ ہی ریت خود اس نے بھی دہرائی تھی۔

ہم زمانہ جاہلیت سے دور اسلام میں اگر ایک ہی دفعہ توبہ کرتے ہیں، ساری عمر پھر عمل صالح تو کرتے رہتے ہیں، مگر بار بار کی توبہ بھول جاتے ہیں، ہم ایک کھالی سے بچ کر بجھتے ہیں کہ زندگی میں پھر بھی کھالی نہیں آئے گی اور اگر آئی تو بھی ہم بچ جائیں گے۔ ہم ہمیشہ نعمتوں کو اپنی انیکوں کا انعام سمجھتے ہیں اور مصیبتوں کو گناہوں کی سزا۔ اس دنیا میں جزا بہت کم ملتی ہے اور اس میں بھی امتحان ہوتا ہے، نعمت شکر کا امتحان ہوتی ہے اور مصیبت صبر کا اور زندگی کے کسی نئے امتحان میں داخل ہوتے ہی منہ سے پہلا کلمہ حطنتہ کا نکلنا چاہیے۔ مگر ہم وہاں بھی گندم مانگنے لگتے ہیں۔

اللہ اسے زندگی کے ایک مختلف فیز میں لایا تو اسے بخشش مانگنی چاہیے تھی۔ مگر وہ ”ہمایوں“ اور ”تیمور“ کو مانگنے لگ گئی۔ حطنتہ، حطنتہ کہنے لگ گئی۔ گندم مانگنا برا نہیں تھا۔ مگر پہلے بخشش مانگنی تھی۔ وہ پہلا زینہ چڑھے بغیر دوسرے کو پھلانگنا چاہ رہی تھی اور ایسے پار کب لگا جاتا ہے؟

اسے نہیں معلوم وہ کتنی دیر تک میز پر سر رکھے زار و قطار روٹی رہی، آج اسے اپنے سارے گناہ پھر سے یاد آرہے تھے۔ آج وہ پھر سے توبہ کر رہی تھی۔ وہ توبہ جو بار بار کرنا ہم ”نیک“ بننے کے بعد بھول جاتے



زندگی میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب آپ سے خود قرآن نہیں پڑھا جاتا۔ اس وقت آپ کسی اور سے قرآن سننا چاہتے ہیں۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ کوئی آپ کے سامنے کتاب اللہ پڑھتا جائے اور آپ روتے جائیں۔ بعض دفعہ آپ خوش ہونے کے لیے اس کے پاس جاتے ہیں اور بعض دفعہ صرف رونے کے لیے۔

اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ خوب روئے قرآن سنتی جائے اور روئی جائے۔ تلاوت کی کیمٹوں کا ڈبہ قریب ہی رکھا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ بھی ساتھ تھا۔ اس نے بنا دیکھے آخر سے ایک گیٹ نکالی اور بنا دیکھے ہی ڈال دی۔ ابھی نہ وہ معافی مانگنا چاہتی تھی نہ ہی غم پر غور و فکر کرنا چاہتی تھی۔ ابھی وہ صرف سننا چاہتی تھی۔ صرف رونا چاہتی تھی۔

اس نے پلے کاٹن دیا اور سر میز پر رکھ دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر میز کے پیشے پہ گر رہے تھے۔ قاری صاحبہ احمد کی یہ ہم پر سوز آواز دھڑکے سے کمرے میں گونجنے لگی تھی۔ ”والضحیٰ۔ قسم ہے دن کی۔“

وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ اسے اپنی زندگی کے روشن دن یاد آرہے تھے جب وہ اس گھر کی ملکہ تھی۔ ”اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔“

اس کو وہ سنائے بھری رات یاد آئی جب ہمایوں نے اسے طلاق دی تھی وہ رات جب وہ بیس بیسی چھت کو دیکھتی رہی تھی۔

تمہارے رب نے تمہیں اکیلا نہیں چھوڑا اور نہ ہی وہ ناراض ہے۔ (الضحیٰ 3)

اس کے آنسو روانی سے گرنے لگے تھے۔ یہ کون تھا جو اس کی ہر سوچ پڑھ لیتا تھا؟ یہ کون تھا؟ ”یقیناً“ تمہارے لیے انجام تمنا سے بہتر ہوگا۔“

(الضحیٰ 4)

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ کیا واقعی اب بھی اس سارے کا انجام اچھا ہو سکتا تھا؟

”تمہارا رب بہت جلد تمہیں وہ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔“ (الضحیٰ 5)

ذرا چونک کر بہت آہستہ سے محل نے سر اٹھایا۔ اللہ کو اس کی اتنی فکر تھی کہ وہ اس کے اداس دل کو تسلی دینے کے لیے یہ سب اسے بتا رہا تھا؟ کیا وہ واقعی اس سے ناراض نہیں تھا؟ کیا واقعی اس نے اسے چھوڑا نہیں تھا؟

”کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر ٹھکانا نہیں دیا؟“ (الضحیٰ 6)

وہ اپنی جگہ سن سی رہ گئی۔ یہ سب کیا واضح، انتہائی صاف، یہ سب اس کے لیے اتنا تھا؟ کیا وہ اس قابل تھی؟ کیا اس نے تمہیں راہ گم پا کر ہدایت نہیں دی؟ (الضحیٰ 7)

وہ ساکت سی بنے جا رہی تھی ہاں یہی تو ہوا تھا۔ ”اور تمہیں نادار پا کر غنی نہیں کر دیا؟“ (الضحیٰ 8)

اس کے آنسو گرنارک گئے تھے۔ کپکپاتے لب ٹھہر گئے تھے۔

”پس تم بھی یتیم بہ سختی نہ کرنا اور سائل کو مت ڈانٹنا۔ اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتے رہنا۔“ (الضحیٰ 9)

سورۃ الضحیٰ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی زندگی کی ساری کہانی گیارہ آیتوں میں سمیٹ کر اسے سنائی گئی تھی۔ وہ سورۃ جیسے ابھی ابھی آسمانوں سے اتری تھی اس کے لیے صرف اس کے لیے۔

اس نے تھک کر سر کرسی کی پشت پہ گر دیا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ کچھ دیر ہر سوچ سے بے نیاز سونا چاہتی تھی۔

پھر اٹھ کر اسے فرشتے سے ملنا تھا۔

بابل نور سے گرے تھے۔  
محل نے ایک نظر کھڑکی سے باہر پھسلتی شام پہ ڈالی

اور دوسری بند دروازے پر۔ اس کی دوسری طرف اسے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ابھی چند منٹ قبل اس نے فرشتے کو گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے آنے کے کچھ دیر بعد ہمایوں کی گاڑی اندر داخل ہوئی تھی۔ البتہ وہ بمشکل ایک منٹ بعد ہی کچھ کلنڈرات اٹھا کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کی گاڑی ابھی ابھی نکلی تھی۔

وہ کھڑکی کے اس طرف چوکیدار کو گیٹ بند کرتے دیکھ رہی تھی جب دروازہ بولے سے بجا۔

”محل؟“ فرشتے نے اپنے مخصوص نرم انداز میں پکارا، پھر بولے سے دروازہ کھولا۔ اب وہ کثرت سے سلام نہیں کرتی تھی۔ محل نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ دروازے کے نیچوں پہ کھڑی تھی۔ دراز قد، کلچر سی سنہری آنکھوں والی لڑکی جو کھلے گلابی رنگ کے لباس میں سر پہ دیشہ لے کھڑی تھی۔ وہ کون تھی؟ اسے لگا کہ اسے نہیں جانتی۔

”کیسی ہو؟“ نرم سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے وہ اندر داخل ہوئی۔

”ہلیس بتا رہی تھی، تم میرا پوچھ رہی تھیں۔“ وہ آگے بڑھ کر عادتاً شایف سے بڑی کتابیں رجسٹر اور ٹیپ ریڈیو سلینے لے جوتے لگی۔ اس کے بھورے بال کھلے تھے اور اس نے ان ہی پہ دیشہ لے رکھا تھا، ایسے کہ چند لٹیں باہر گر رہی تھیں۔ گلابی دپے کے بالے میں اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔

”جی۔ مجھے بتائیں تھا کہ آپ کدھر ہیں۔“ محل نے بغور اس کو دیکھا، جو اس کے سامنے سر جھکائے کتابیں سیٹ کر رہی تھی۔

اسے ابھی بھی تیور بیات پہ مکمل یقین نہ تھا۔ فرشتے ایسا نہیں کر سکتی تھی، کبھی بھی نہیں ”یقیناً“ تیور کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔

”میں ایک دوست کے ساتھ تھی، کچھ شاپنگ کرنا تھی۔“ بے حد رمان سے بتا کر اس نے رجسٹر ایک دوسرے کے اوپر رکھے۔

نہ اس نے جھوٹ ڈالا، نہ سچ بتایا۔ اس کا یقین

ڈگر گانے لگا۔

”آپ نے آگے کا کیا سوچا ہے فرشتے؟ میرے جانے کے بعد آپ کیا کریں گی؟“

”ابھی پلان کروں گی، دیکھو، کیا ہوتا ہے۔“ وہ اب گلخان میں رکھے گلدستے سے سوکھے پھول احتیاط سے نکال رہی تھی۔ اس کے جواب مبہم تھے۔ نہ سچ، نہ جھوٹ۔

”اور تم سارا دن کیا کرتی رہیں؟“ اس نے چہرے پر سوکھے پھول ڈسٹ بن میں ڈالے۔

”کچھ خاص نہیں۔“

دونوں خاموش ہو گئیں، اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ اب اس کے پاس حقیقت جاننے کا ایک ہی طریقہ تھا اور اس نے اسے استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔

”فرشتے، وہ جسم کس کی کرسی پہ ڈالا گیا تھا؟“

”کون سا جسم؟“ فرشتے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ملنے سے اس کا دیشہ سرکنے سے بھورے بال جھلکنے لگے۔

”قرآن میں ایک جگہ ایک جسم کا ذکر ہے جو کسی کی کرسی پہ ڈالا گیا تھا۔ آپ کو یاد ہے وہ کس کا جسم تھا؟“ اس کا انداز یوں تھا جیسے وہ بھول گئی ہو۔

فرشتے نے الجھ کر چند لمحے سوچا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں، مجھے نہیں یاد آ رہا۔“

اور محل کو سارے جواب مل گئے تھے۔ فرشتے قرآن بھول گئی تھی۔ اگر وہ اسے پڑھتی رہتی تو اسے یاد رہتا، لیکن وہ اسے پڑھنا چھوڑ چکی تھی اور قرآن تو چند دن کے لیے بھی چھوڑ دیا جائے تو وہ فوراً ”فیہنوں سے مکمل طور پہ محو ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اللہ کی سنت تھی اور کبھی یہ تبدیل نہیں ہوگی۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”وہ سلیمان علیہ السلام کی کرسی تھی جس پہ ایک جسم ڈال دیا گیا تھا۔“

”اوہ اچھا۔“ فرشتے نے میز پہ گرے پانی کے قطرے نشو سے صاف کیے۔

”کیوں کیا آپ نے ایسا فرشتے؟“ وہ بہت دکھ سے



ہولی تھی اب وقت آگیا تھا کہ وہ چوبلی کا کھیل بند کر دے۔

”کیا؟“ فرشتے نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر صرف استفسار تھا۔

”وہ جو اس گھر میں ہوتا رہا میں وہ سب جانتا چاہتی ہوں؟“

”مثلاً؟“ اس نے ابرو اٹھائی اس کے چہرے پر وہ ہی نرم سا اثر تھا۔

”سب کچھ!“

”سب کچھ؟ کس بارے میں؟ میری اور ہمایوں کی شادی کے بارے میں؟“ اس کے انداز میں ندامت تھی نہ پکڑے جانے کا خوف وہ بہت آرام سے پوچھ رہی تھی۔

”سب کچھ!“ اس نے آہستہ سے دہرایا۔

”جب ہمایوں کراچی سے آیا تو اس نے مجھے پروپوز کیا۔ وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا مگر طلاق سے قبل وہ مجھ سے شادی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سو ہم نے ڈی سی ایڈ کیا کہ جب تم ہوش میں آ جاؤ تو وہ تمہیں ڈائیو رس دے دے گا اور ہم شادی کر لیں گے۔“

وہ جیسے موسم کی کوئی خبر سن رہی تھی۔

”وہ کہتا تھا کہ علمائے فتویٰ لے لیتے ہیں مگر میرا دل نہیں مانا میں نے سوچا کہ کچھ وقت اور انتظار کر لیتے ہیں۔ اور پھر تم ہوش میں آ گئیں۔ سو اس نے ڈائیو رس پیپر سائن کر دیے۔ مجھے پروپوز کرنے سے قبل ہی وہ تمہیں ڈائیو رس دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اگر یہ ضروری نہ ہوتا وہ تب بھی ایسے ہی کرتا کیونکہ وہ یہ شادی رکھنے کو راضی نہیں تھا۔“

وہ بہت اطمینان اور سکون سے میز سے ٹیک لگائے کھڑی اس کے پارے میں ان کے سوالات کے جوابات دے رہی تھی۔

”میں نے اس کا پروپوزل اس لیے قبول کر لیا کیونکہ طلاق کے بعد اس کو بھی کسی نہ کسی سے شادی کرنی تھی اور مجھے بھی اور چونکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے اور سمجھتے تھے سو

اس کا پروپوزل میرے لیے بہترین چوائس تھا۔ میں اس کو تمہارے ساتھ تعلق کو قائم رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی نہ ہی وہ کسی کی مانند ہے۔ سو شرعی لحاظ سے میرے پاس پروپوزل قبول کرنے کا حق تھا سو میں نے وہ استعمال کیا۔“

اس کے پاس دلائل تھے تو جہات تھیں، ٹھوس اور ذیلی شرعی سہارے تھے۔ محمل خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتی رہی وہ ذرا دیر کو چپ ہوئی تو اس نے لب کھولے۔

”اور جب ہمایوں نے آپ سے میرے اور فواد کے تعلق کی نوعیت اور ان تصاویر کے بارے میں پوچھا تھا تب آپ نے کیا کہا تھا؟“ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔

”وہ ہی جو سچ تھا۔“ وہ اب بھی پرسکون تھی۔ ”اس کو معیض نے کچھ تصویریں اور وہ ایگری منٹا کر دکھایا تھا جو ہم نے فواد سے ملے کیا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ تم نے اس کے بارے میں ہمایوں کو بتا دیا ہو گا میں نے اس کے غصے کے ڈر سے خود نہیں بتایا تھا۔ مگر تم نے بھی نہیں بتایا تو اس کا غصہ کتنا لڑی تھا۔ اس نے مجھے بلایا پھر وہ مجھ پر چیخا چلایا میں چپ کر کے سنتی رہی اس نے پوچھا کہ یہ ایگری منٹ سچا ہے یا جھوٹا۔ میں نے سچ بولا۔ وہ غصے سے چلاتا رہا اسے دکھ تھا کہ ہم دونوں نے اس پر ٹرسٹ نہیں کیا۔ پھر اس نے وہ تصویریں مجھے دکھائیں اور پوچھا کہ وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ میں نے سچ ہی بولا۔“

”کیا بولا؟“ محمل نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”یہ ہی کہ مجھے معلوم نہیں اور مجھے واقعی معلوم نہیں تھا۔“

اور وہ اسے دیکھتی رہ گئی یہ فرشتے کا سچ تھا؟

”پھر اس نے پوچھا کہ معیض جو باتیں اسے بتا گیا ہے وہ سچ ہیں یا جھوٹ؟ وہ اسے یہ بتا کر گیا تھا کہ تمہارا اور فواد کا اقرار تھا اس رات فواد نے تمہیں پروپوز کرنا تھا کوئی رنگ بھی دی تھی غالباً اور پھر اس نے تمہیں ہمانے سے ہمایوں کے گھر بھیج دیا۔ اس رنگ کا ذکر فواد

کی اس فون کال میں بھی تھا جو ہمایوں نے ٹیپ کی تھی۔ یہ بات اس نے بے انور کدی تھی پھر ظاہر ہے معیض نے یاد دلایا تو وہ ابا گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سچ بولا۔“

اب کی بار وہ ہوش رہی۔ اس نے نہیں پوچھا کہ فرشتے کا سچ کیا تھا وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہے۔

”میں نے اسے بتا دیا کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی نہ ہی تم نے کبھی مجھے اس معاملے میں رازدار بتایا ہے۔ اس نے اس رات کے متعلق پوچھا تو میں نے سچ سچ بتا دیا کہ فواد تمہیں پروپوز کرنے کے ہمانے سے ہی ڈر کے لے کر جا رہا تھا۔ تم نے مجھے یہ ہی بتایا تھا سو میں نے ہی اس کو بتا دیا۔“

وہ چپ چاپ ایک ٹک سا مٹنے کھڑی محمل سے سی لڑکی کو دیکھتی رہی جس کے چہرے پر ملال ٹک نہ تھا۔ وہ اس کا ایک راز رک نہیں سنبھال سکی تھی۔

وہ سچ کیسے ہو سکتا ہے جس میں کسی امانت کا خون شامل ہو؟ وہ تو اسے جانتی تھی وہ اس کی بہن تھی کیا وہ اس کی پردہ پوشی میں کر سکتی تھی؟ فواد نے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ اسے پروپوز کرنے جا رہا ہے۔ یہ سب تو اس نے خود اخذ کیا تھا۔ اس سے ایک غلطی ہوئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ون کی دھول نے اس غلطی کو دبا دیا ہو گا مگر لڑکیوں کا کبھی عمر کی ناوائیاں اتنی آسانی سے کھل جاتی ہیں۔

”اس ٹیپ میری رنگ کا بھی ذکر تھا۔ ہمایوں نے اسے بار بار سناؤ وہ یہ غصہ ہوتا رہا کہ میں نے اسے بے خبر کیوں رکھا پھر اس نے اپنا ٹرانسفر کراچی کر دیا۔“

وہ اب کھڑکی سے باہر لان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”یہاں کراچی میں اسے آرزو ملی۔ اس کے قادر کی اہنہ کے بعد کہہ کر پاپا اور غفران چچا نے اس کا حصہ بھی دے دیا تھا۔ سو اس نے سوچا کہ ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں۔ اس نے فواد سے تمہارا اور میرا سائن کروہ کاغذ لیا

اور معیض کے ہاتھوں ہمایوں کو بھجوا دیا۔ فواد آرزو کو پسند کرنے لگا تھا وہ اب اس سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ اسے اپنانے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر آرزو کو ہمایوں بہتر لگا سو اس نے چاہا کہ ہمایوں تمہارا حصہ قانونی طور پر آقا کریم سے واپس لے اس کا حصہ لینے میں بھی مدد کرے تاکہ جب وہ ہمایوں سے شادی کرے تو تمہارے حصے پر بھی وہ قابض ہو سکے جو ہمایوں کی ملکیت میں ہو گا اور نیچرلی تمہارے بارے میں وہ پریقین تھی کہ تم کبھی نہیں اٹھو گی۔“

بادل ایک دفعہ پھر زور سے گرجے، دور کہیں بجلی چمکی شام کی نیلا ہٹ سارے میں بھر رہی تھی۔ وہ ابھی تک خاموشی سے فرشتے کو سین رہی تھی۔

”مگر ہمایوں کو فواد سے ضد ہو گئی تھی۔ صرف اس لیے کہ فواد آرزو کو پسند کرتا ہے اس نے آرزو کو اپنے قریب آنے دیا۔ فواد ہمایوں کی منتیں کرتا رہا کہ وہ آرزو کو چھوڑ دے مگر ہمایوں اس سے اپنے سارے بدلے چکانا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ فواد نے اس کی محبت کو اس سے چھینا ہے، وہ بھی اس کی محبت کو ویسے ہی چھینے لگا۔ وہ آرزو سے کبھی بھی شادی نہیں کر رہا تھا مگر اس نے آرزو کو دھوکے میں رکھا۔ ابھی مجھے ڈراپ کر کے وہ آرزو کے پاس ہی گیا ہے اس کو یہ بتانے کہ جیسے وہ اس کو استعمال کر رہی تھی وہ بھی ویسے ہی اسے استعمال کر رہا تھا۔ وہ شدت پر لڑکی ہے جانے غصے میں کیا کر ڈالے مگر جو بھی ہو وہ آج اسے آئینہ دکھا کر ہی واپس آئے گا۔“

کھڑکی کے بند شیشے پر کسی اڑتی چڑیا نے زور کی چونچ ماری پھر چکر اکر پیچھے گوی گری بادل وقفے وقفے سے گرج رہے تھے۔

”شاید تم یہ سمجھو کہ میں نے تمہارے ساتھ برا کیا ہے یا یہ کہ مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن تم یہ سوچو کہ میں پھر اور کیا کرتی؟ میں ہمایوں سے بہت محبت کرتی تھی اور کرتی ہوں۔ مگر جب مجھے لگا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو میں درمیان سے نکل گئی لیکن اب وہ تمہیں نہیں چاہتا اور مجھے بھی کسی نہ کسی



سے شادی تو کرنی تھی۔ مجھے بتاؤ میں نے کیا غلط کیا؟ میرے دین نے مجھے پروپونل سلکٹ کرنے کا اختیار دیا تھا۔ سو میں نے اسے استعمال کیا۔ تم کسی بھی مفتی سے پوچھ لو اگر کوئی عورت شوہر کی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ رہی ہو تو شوہر دوسری شادی کر سکتا ہے اور اس میں کسی کی حق تلفی کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی قطع رحمی کا عنصر شامل ہے یاد کرو سورہ نساء میں ہم نے کیا پرہیز کیا ہے اگر کوئی ایک حقوق ادا نہ کر سکے تو پھر اسے حقوق چھوڑ دے الگ ہو جائے کہ اللہ دونوں کے لیے وسعت پیدا کر دے گا۔

اپنے مطلب کی آیات اسے آج بھی یاد تھیں۔ ”آئی ہو پ کہ اب تمہاری کنفیوژن اور اعتراضات دور ہو گئے ہوں گے۔ میں نے سات سال تمہاری خدمت کی حالانکہ یہ میرا فرض نہیں تھا مگر اس لیے کہ تم کبھی یہ نہ سمجھو کہ تم سے پیار نہیں کرتی۔ میں آج بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ تم نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر تم میرے لیے اپنا حق چھوڑ دو گی، نواد نے تمہاری گردن پر پستول رکھا تھا تمہیں بچانے کے لیے میں نے اپنا حق چھوڑا تھا۔ یہ باتیں میں نے آج کے دن کے لیے سنبھال رکھی تھیں تاکہ آج میں تم سے تمہارے وعدے کی وفا مانگ سکوں۔“

وہ خاموش ہو گئی اب وہ حمل کے بولنے کی منتظر تھی۔ حمل چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر آہستہ سے لب کھولے۔

”آپ نے کہہ لیا جو آپ نے کہنا تھا؟“  
”ہاں۔“  
”کیا اب آپ میری سنین گی؟“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔  
”ہاں۔“

”تو پھر سنئے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔“ اس نے تعویذ پڑھا تو فرشتے نے ذرا الجھ کر اسے دیکھا مگر وہ رکی نہیں تھی بہت دھیمے مگر مضبوط لہجے میں وہ عربی

میں اسے کچھ سنانے لگی تھی۔ وہ عربی جوان دونوں کی سمجھ میں آتی تھی۔

”اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔ شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔“

فرشتے کی آنکھوں میں الجھاس سا اثر ابھرا۔ حمل بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پڑھتی جا رہی تھی۔

”ان لوگوں کو اس شخص کی خبر پڑ کر سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیات دی تھیں۔ جس کو ہم نے اپنی آیات دی تھیں۔ پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو اس کے پیچھے شیطان لگ گیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔“

فرشتے کی بھوری آنکھوں میں بے چینی ابھری تھی۔ ”حمل! میری بات سنو۔“

مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ پتلیوں کو حرکت دے بنا لگا ہیں اس پر مڑ کر اذیت دیتی جا رہی تھی۔

”تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔“ اس کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ”اور اگر ہم چاہتے تو اسے ان ہی آیات کے ساتھ بلندی عطا کرتے لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا۔“

”حمل چپ کر۔“ وہ ذریعہ لب بڑھاتی تھی مگر حمل کی آواز اڑی ہو رہی تھی۔

”لیکن وہ زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ تو اس کی مثال کتے جیسی ہے۔ تو اس کی مثال کتے جیسی ہے۔“

”اگر تم اس جملہ کو تو وہ زبان باہر نکالتا ہے یا تم اس کو چھوڑ دو تو بھی وہ زبان باہر نکالتا ہے۔“

”خاموش ہو جاؤ! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ!“ اس نے تڑپ کر حمل کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا اس کا دوپٹہ کندھوں سے پھسل گیا تھا کلمے بال شانوں پر آگرے تھے۔

حمل نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ اسی میکانیکی انداز میں اسے دیکھتی پڑھتی جا رہی تھی۔

”جسے اللہ ہدایت بخشے“ پس وہی ہدایت پانے والے ہیں۔“

اس کے ہاتھ بے دم ہو کر اپنی گود میں آگرے شخصہ بچھی بچھی نگاہوں سے اسے دیکھتی گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں گری تھی۔

”تب شک ام نے جنم کے لیے بہت سے جنوں میں سے اور بہت سے انسانوں میں سے پیدا کیے ہیں۔ ان کے لیے دل ہیں۔ وہ ان سے کچھ نہیں بھی سمجھتے اور ان کے لیے آنکھیں ہیں وہ ان سے کچھ بھی نہیں دیکھتے۔ اور ان کے لیے کان ہیں۔ وہ ان سے کچھ بھی نہیں سنتے۔ یہی دگ مویشیوں کی طرح ہیں بلکہ یہ تو زیادہ بکٹے ہوئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غافل ہیں جو غافل ہیں جو غافل ہیں۔“ وہ کسی معمول کی طرح بار بار

باروی الفاظ دہرا رہی تھی۔

فرشتے سفید چہرے بے دم سی بیٹھی تھی۔ اس کے لب بولے ہوئے کپکپا رہے تھے۔ حمل نے آہستہ سے پلک جھپکی تو دو آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرے۔

”اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ پلٹ آئیں!“

اس نے وائیل چیر کے پیوں کو دونوں اطراف سے تھما اور اس کا رخ کھڑکی کی طرف موڑا وہ آہستہ آہستہ چیل چیل کھڑکی کی طرف بڑھانے لگی۔

فرشتے پیچھے بیٹھی رہ گئی تھی۔ حمل نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا وہ ابھی پلٹنا نہیں چاہتی تھی۔

”اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ پلٹ آئیں!“ وہ کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے سر لب بڑھاتی تھی۔

فرشتے سے مزید کچھ سنا نہیں گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور منہ پر ہاتھ رکھے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

حمل ہی طرح نم آنکھوں سے باہر چمکتی بجلی کو دیکھتی رہی۔

وہ تب بھی کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی جب ہمایوں

کی گاڑی اندر آئی۔ اور تب بھی جب رات ہر سو چھا گئی۔ اس کی اس گھر میں آخری رات۔ اور وہ اسے سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ تب اس نے بلیقوں کو بلوایا جس نے اسے بستر پر لیٹنے میں مدد دی۔ پھر وہ آنکھوں پر بازو رکھے کب گہری نیند میں چلی گئی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا۔

اس کے ذہن میں اندھیرا تھا گھپ اندھیرا جب اس نے وہ آواز سنی۔ تاریکی کو چیرتی مدھری آواز۔ اپنی جانب کھینچتی آواز۔

حمل نے ایک جھٹک سے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں ہارٹ بلب جل رہا تھا۔ کھڑکی کے آگے پردے بٹے تھے۔ وہ رات کے وقت شیشے کے پٹ کھول کر رکھتی تھی تاکہ جالی سے ہوا اندر آئے۔ وہیں باہر سے کوئی آواز آرہی تھی۔

اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا اور بٹن دبایا۔ ٹیبل لمپ فوراً جل اٹھا۔ روشنی سامنے دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ مدھم سی دکھ بھری آواز بھی تک آرہی تھی۔

اس نے رک کر سنا چاہا۔ لفظ کچھ کچھ سنائی دینے لگے تھے۔

”اللہم جعل فی قلبی نوراً“  
(اے اللہ! میرے دل میں نور ڈال دے)

حمل نے بے اختیار سائیڈ ٹیبل پر رکھی ٹیل پر ہاتھ مارا۔

”وہی بصری نوراً“  
(اور میری بصیرت میں نور ہو)

بلیقوں تیزی سے دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ حمل کی وجہ سے وہ کچن میں ہی سوتی تھی۔

”جی ہاں؟“  
”مجھے بٹھاؤ، بلیقوں!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں وہیل چیر کی طرف اشارہ کیا۔ بلیقوں سر ہلا کر آگے بڑھی تب ہی کھڑکی کے اس پار سے آواز آئی۔

”وہی سمعی نوراً“  
(اور میری سماعت میں نور ہو)



بلیقں چونک کر کھڑکی کو دیکھنے لگی، پھر سر جھٹک کر اس کی طرف آئی۔

”وَعْنِ یَمَنِ نُّورًا“ وَعْنِ یَسَارِی نُّورًا“

(اور میرے دائیں جانب اور بائیں جانب نور ہو)

بہت احتیاط سے بلیقں نے اسے وہیل چیئر پہ بٹھا دیا۔

”اب تم جاؤ۔“ اس نے اشارہ کیا۔ بلیقں سر ہلاتی متذبذب سی واپس پلٹی۔

”وَفَوِّی نُّورًا“ وَفَوِّی نُّورًا“

(اور میرے اوپر اور نیچے نور ہو)

مدھم چاندنی کی چاشنی میں ڈوبی آواز ہر شے پہ چھا رہی تھی۔ محمل نے وہیل چیئر کا رخ باہر کی جانب موڑا۔

”وامای نُّورًا“ وَخَلْفِی نُّورًا“ (اور میرے آگے پیچھے نور ہو) آواز میں اب آنسو گرنے لگے تھے۔

وہ وہیل چیئر کو بمشکل گھسیٹتی باہر لائی۔

”واجعل لی نورًا“

(اور میرے لیے نور بنا دے)

چاندنی میں ڈوبا برآمدہ سنان پڑا تھا۔ وہ مترنم، غم زدہ آواز لان سے آرہی تھی۔

”وَفِی لِسَانِی نُّورًا“ وَعَصْبِی نُّورًا“ (اور میری زبان اور اعصاب میں نور ہو)

اس نے سوز میں پڑھتے ذرا سی ہچکی لی۔

محمل آہستہ آہستہ برآمدے کی آرام دہ ڈھلان سے نیچے وہیل چیئر کو اتارنے لگی۔ یہ ڈھلان فرشتے نے ہی اس کے لیے لگوائی تھی۔

”وَلَحْمِی نُّورًا“ وَدَمِی نُّورًا“

(اور میرے گوشت اور لہو میں نور ہو)

لان کے آخری سرے پہ دیوار سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا سر بندھال سا دیوار سے ٹکا تھا۔ آنکھیں بند تھیں جن سے قطرہ قطرہ آنسو ٹوٹ کر رخسار پہ گر رہے تھے۔ لمبے بھورے بال شانوں پہ پڑے تھے۔

”وَشَعْرِی نُّورًا“ وَبَشْرِی نُّورًا“ (اور میرے بال و کھال

میں نور ہو)

محمل وہیل چیئر کو گھاس پہ آگے بڑھانے لگی۔ گھاس کے تنکے پہلوں کے نیچے چرمرانے لگے تھے۔

”واجعل لی نفسی نورًا“ وَاَعْظَم لی نورًا“ (اور میرے نفس میں نور ہو اور میرے لیے نور کو بڑھا دے)

وہ اسی طرح آنسو بہاتی بند آنکھوں سے، بے خبری پڑھتی جا رہی تھی۔

محمل وہیل چیئر اس کے بالکل سامنے لے آئی۔

اللہم اعطنی نورًا“

(اے اللہ! مجھے نور عطا کر دے!)

چاندنی میں اس کے آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

”فرشتے! اس نے ہولے سے پکارا۔

فرشتے کی آنکھوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے بلیقں جدا کیں اور محمل کو دیکھا۔ وہ شاید بہت روئی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم، سرخ تھیں۔

”کیوں رو رہی ہیں؟“ اس کے اپنے آنسو گرنے لگے تھے۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے اسے قرآن سنایا تھا۔

قرآن پڑھایا تھا۔ اس کی جان ان لوگوں سے چھڑائی تھی سات سال اس کی خدمت کی تھی۔ بہت احسان تھے اس کے محمل پہ۔ اور آج اس نے اسے زلا دیا!

”مجھے رونا ہی تو چاہیے“ وہ سر اٹھا کر چاند کو دیکھنے لگی۔

”میں نے بہت زیادتی کی ہے۔ محمل، بہت زیادتی۔“

وہ خاموشی سے اس کو سننے لگی۔ شاید ابھی فرشتے نے بہت کچھ کہنا تھا وہ سب جو وہ پہلے نہیں کہہ سکی۔

”میں نے سات سال تو جہمات جوڑیں، دلیلیں اکٹھی کیں، اور تم نے سات آیتوں میں انہیں ریت کا ڈھیر بنا دیا۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا تھا۔ بہت نفس دلایا تھا کہ یہی صحیح ہے مگر آج میرا یقین ٹوٹ گیا ہے۔

محمل میں خود غرض ہو گئی تھی، کتے کی طرح خود غرض جو ہڈی نہ ڈالنے پہ بھی زبان نکالتا ہے۔“

اس کی اوپر چاند کو کتنی آنکھوں سے قطرے گر رہے تھے۔

”کبھی تم نے میری چاندی کی داغ بھٹی دیکھی ہے؟

محمل نے کبھی نہیں پوچھا کہ ”مجھے کس نے دی تھی؟ جانتی ہو“ وہ مجھے میری خالہ نے دی تھی۔ وہ انہوں نے اپنی بہو کے لیے رکھی تھی اور اپنی وفات سے قبل وہ بہت بیمار تھیں، انہوں نے وہ مجھے پہنا دی۔ میری امی ان کا مطلب سمجھتی تھیں، مگر خاموش رہیں۔ وہ وقت آنے پہ ہاؤں سے بات کرنا چاہتی تھیں، مگر وقت نہیں آیا۔ امی نہیں سکا۔ امی فوت ہوئیں تو میں چپ چاپ مجھ چلی گئی۔ میں ہر سول انتظار کرتی رہی کہ ہمایوں بھی تو اس داغ بھٹی کے بارے میں پوچھے گا، مگر اس نے نہیں پوچھا۔ پھر میں نے صبر کر لیا، مگر انتظار تو مجھے تھا۔ میں نے بچپن سے اپنے نام کے ساتھ اسی کا نام سنا تھا، مجھے اس پہ اپنا حق لگتا تھا۔ اور جب ایک روز ہمایوں نے مجھے کہا کہ مجھے شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے، تو میں نے اس کو خالہ کی خواہش کے بارے میں بتانے کا سوچا۔

اس رات میں بہت دیر تک مسجد کی چھت پہ بیٹھی رہی تھی، اور جب میں فیصلہ نہ کھائی تو دعائے نور پڑھنے لگی۔ تمہیں پتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کا ایک حصہ سجدے میں پڑھا کرتے تھے؟

اور یہ دعا قرآن سمجھنے میں مدد دیتی ہے میں جب بھی فیصلہ نہ کر پاتی، اس دعا کو پڑھتی۔ اس رات بھی میں پڑھ کر ہٹی ہی تھی کہ تم ہماری چھت پہ آئیں، اور پھر تم ہماری زندگی میں بھی آ گئیں۔

میں نے آج تک تمہارے لیے جو بھی کیا ہے، وہ اللہ کے لیے کیا تھا۔ مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے کیا کیا تھا، پھر جب میں نے ہمایوں کو تمہارے لیے مسکراتے دیکھا اور اس کے لیے تمہاری آنکھوں کو چمکتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ تمہیں آگاہ کر دوں اور تمہیں یاد ہے اب ہسپتال میں تم ہمایوں کو دیکھنے آئی تھیں، تو میں تمہیں بتانے ہی والی تھی۔ مگر تم نے نہیں سنا، تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں گی۔ قربانی دے دوں گی۔ تب میرا جینا مرنا نماز اور قربانی ہمایوں کے لیے ہو گئی۔“

میری قربانی صرف اللہ کے لیے تھی۔ میں نے ہر چیز بہت خلوص دل سے کی۔ خود تمہاری شادی کروائی اور اپنے تئیں میں مطمئن تھی۔ لیکن۔

جب تمہارا ایک سینڈنٹ ہو اور میں پاکستان واپس آئی تو مجھے پہلی دفعہ لگا کہ شاید تم زندہ نہ رہ سکو، اور ہمایوں میرا نصیب۔ اور اس سے آگے سوچنے سے بھی میں ڈرنے لگی تھی۔ سو واپس چلی گئی۔ مگر ہمایوں جب بھی کال کرتا اور تمہاری مایوس کن حالت کی خبر دیتا تو مجھے لگتا شاید یہی تقدیر ہے۔ شاید تم ہمیں چھوڑ جاؤ، تب ہمایوں میرے پاس واپس آجائے۔ مجھے لگا میری قربانی قبول ہو گئی ہے۔ اس کا انعام مجھے دیا جانے لگا ہے۔ مجھے بھول گیا کہ وہ قربانی تو اللہ کے لیے تھی، اللہ کو پانے کے لیے تھی، دنیا کے لیے یا ہمایوں کے لیے تو نہیں تھی۔ مگر تمہاری طرف سے ہم اتنے مایوس ہو گئے تھے کہ آہستہ آہستہ مجھے سب بھولنا گیا۔ میں ہر نماز میں، ہر روز تلاوت کے بعد ہمایوں کو خدا سے مانگنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکنے لگی تو میرے ساتھ شیطان لگ گیا۔“

اس کی انھی لمبی گردن پہ آنکھوں سے نکلنے آنسو پھسل رہے تھے۔ اس کی نگاہیں ابھی بھی اوپر چاند پہ تکی تھیں۔ شاید وہ ابھی محمل کو تئیں دیکھنا چاہتی تھی۔

”جب میں دوبارہ واپس آئی تو اپنی ”زمین“ کی طرف جھکی ہوئی آئی، اس امید پہ تمہاری خدمت کرنے آئی کہ شاید یہی دیکھ کر ہمایوں کا دل میری طرف کھینچ جائے۔ میری اس انتھک خدمت میں ریا شامل ہو گئی۔ مجھے اس وقت سے ڈر نہیں لگا جب میں حشر کے بڑے دن اپنے رب کے سامنے اپنے اعمال نامے میں ان بڑی بڑے نیکیوں پہ کانٹا لگے دیکھوں گی کہ یہ تو ریا کے باعث ضائع ہو گئیں، قبول ہی نہیں کی گئیں۔ مجھے ڈر نہیں لگا۔ میں ریا کاری کرتی گئی مگر یقین کرو، قرآن مجھ سے نہیں چھوٹا۔ میں تب بھی روز اسے پڑھتی تھی مگر میرا جینا مرنا نماز اور قربانی ہمایوں کے لیے ہو گئی۔“

یکدم بابل زور سے گرجے اور اگلے ہی لمحے بارش



کے ٹپ قطرے گرنے لگے مگر وہ دونوں بے خبر بیٹھی تھیں۔

”پھر ایک دن معیذ چلا آیا“ اسے آرزو نے بھیجا تھا۔ وہ ان گزرے سالوں میں کئی دفعہ ہمایوں سے رابطے کی کوشش کر چکی تھی مگر اس نے جب توجہ نہ دی تو اس نے معیذ کو بھیجا۔ اس کے پاس تصویریں تھیں اور وہ کانڈر ہمایوں نے مجھ سے پوچھا تو کانڈر کی بابت میں نے سچ بولا، مگر جب اس نے تصویریں میرے سامنے پھینکیں تو میں خاموش ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جعلی ہیں، مگر سیکینگی میں نہیں جانتی تھی کہ وہ سچ ہیں یا نہیں۔

میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا مگر میرا دل بار بار کوئی میرے اندر وہ آیت دہرا رہا تھا کہ

”کیوں نہیں تم نے کہا کہ یہ کھلم کھلا بہتان ہے۔“

وہ آیت بھی ایک ایسی محترم ہستی کے لیے نازل ہوئی تھی جس کے اوپر لگے بہتان کی حقیقت سے مومنین بے خبر تھے، پھر بھی اللہ نے ان کو سرزنش کی کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کروار کی کتنی سچی ہے تم نے اس کی حمایت نہیں کی؟

میں ہمایوں کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ میرے اوپر چلا رہا تھا اور مسلسل کوئی میرے اندر کہہ رہا تھا کہ کہو ہذا الک مبین“ (یہ بہتان ہے کھلم کھلا) میں نے سر اٹھایا، ایک نظر ہمایوں کو دیکھا، وہ ہمایوں جس سے میں نے بہت محبت کی تھی اور پھر میں نے کہہ دیا کہ میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔

تب ایک دم میرے اندر باہر خاموشی چھا گئی۔ وہ آواز آنا بند ہو گئی۔ تب ہمایوں نے معلوم نہیں کہاں سے وہ ٹپ نکالی اور مجھے سنوائی۔ اس میں کسی انگوٹھی کا تذکرہ تھا۔ اس نے معیذ کی کئی بات دہرائی کہ کیا اس روز فواد تمہیں پروپوز کرنے کا جھانسہ دے کر باہر لے کر گیا تھا؟ تب پھر سے کسی نے میرے اندر کہا۔

”اللہ خیانت کار کی چال کی راہنمائی نہیں کرتا۔“

مگر اب وہ آواز کمزور پڑ چکی تھی۔ مجھے لمانت کے سارے سبق بھول گئے۔ میں نے اسے وہ بتا دیا جو تم

نے مجھے بتایا تھا۔ تب وہ مجھ سے بہت چیخا۔ اس نے کہا کہ میں نے اپنی بہن کو بچانے کے لیے اس کے سر تھوپ دیا ہے۔ اس نے بہت مشکل سے دل بڑا کر کے اس بات کو نظر انداز کیا تھا کہ تم کس طرح پہلی دفعہ اس کے گھر لائی گئی تھیں۔ مگر یہ بات کہ فواد کا پورا تہنہ اگولی افر تھا۔ اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میرے ایک قبرے نے ہر چیز پر تصدیق کی مہر لگا دی۔ وہ مجھ پر بھی ایسے نہیں برساتا تھا۔ جیسے اس رات برساتا تھا۔ میں ساری رات روتی رہی۔ تا معلوم غم کس بات کا زیادہ تھا۔ خیانت کا یا ہمایوں کے رویے کا۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر ہمایوں نے اگلی صبح مجھ سے ایک سیکور کر لیا۔ میں چپ چاپ سنی رہی۔ تب آخری دفعہ میرے دل سے آواز آئی کہ اس کو بتا دو کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔

مگر میں چپ رہی۔ میں نے خواہشات کی پیروی میں چلنا شروع کر دیا۔ اور میں بھٹک گئی۔ وہ کراچی چلا گیا اور میں کئی دن تک تمہیں دیکھنے ہسپتال نہیں جاسکی پھر میں مسجد بھی نہیں جاسکی۔ جس دن میں خیانت کی، محفل اس دن سے آج کے دن تک تین ساڑھے تین سال ہونے کو آئے ہیں، میں قرآن نہیں کھول پائی۔ ہاں نمازیں میری آج بھی ملتی ہیں، لیکن میں سجدوں میں گر کر ہمایوں کو اب بھی مانگتی ہوں، مگر قرآن پڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

بارش تیز تر برس رہی تھی۔ فرشتے کے بھورے بال بھیک چکے تھے۔ موٹی موٹی گیلی گئیں، چہرے کے اطراف میں چپک گئی تھی۔ وہ ابھی تک اوپر چاند کو دکھا رہی تھی۔

”وہ کراچی سے آیا تو بدل گیا تھا۔ پھر ایک روز اس نے مجھے پروپوز کیا۔ اچانک بالکل اچانک سے اور مجھ لگا میری ساری قربانیاں مستجاب ہو گئی ہیں۔ پھر مزید پیچھے دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تم سے بہت بدگن ہو چکا تھا۔ مگر میں نے اسے مجبور کیا کہ کہہ وہ تمہارا علاج کروانا نہ چھوڑے۔“

موسلا دھار بارش میں بار بار بجلی چمکتی تو بیل پر

سارا لان روشن ہو جاتا۔

”فواد نے کئی دفعہ فون کر کے تمہارا پوچھنا چاہا، میں نے اسے کبھی کچھ نہیں بتایا، بس اس کی بات سن کر کچھ کہے بنائی بند کر دیتی۔ وہ بہت بدل گیا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر اک دفعہ اسے اس سارے کھیل کا علم ہو گیا تو وہ ہمایوں کے پاس آکر اسے سب بتا دے گا۔ مشکل ہی تھا کہ ہمایوں اس کا یقین کرے مگر اس ڈر سے میں نے اسے کبھی کچھ بتا نہیں لگنے دیا۔“

”مجھے ہمایوں نہیں چاہیے فرشتے!“ وہ روتے ہوئے بولی تھی ”مجھے اپنی بہن چاہیے!“

”مجھے بھی ہمایوں نہیں چاہیے۔ مجھے بھی اپنی بہن چاہیے!“ اس نے بجلی آنکھوں کا رخ پہلی دفعہ بیل کے چہرے کی طرف کیا۔ محفل نے اس کے گھٹنوں پر رکھے ہاتھ پکڑ لیے۔ ان میں آج چاندی کی انگوٹھی نہیں تھی۔

بارش زور سے ان دونوں پر برس رہی تھی۔

”میں نے فواد کو فون کر دیا ہے۔ وہ بچنے والا ہو گا۔ وہ بالکل سمجھ دار بندہ ہے ایسے ثبوت لانے کا کہ ہمایوں اسے جھٹلا نہ سکے گا۔ وہ ابھی آکر ہمایوں کو سب کچھ بتا دے گا، ابھی کل دوپہر میں خاصا وقت ہے۔ تمہاری مدت ختم نہیں ہوئی۔ میں جانتی ہوں کہ وہ حقیقت جان کر رہ نہیں سکے گا۔ اور تمہیں واپس اپنائے گا۔ آؤ۔ اندر چلتے ہیں۔“ فرشتے نے اپنے ہاتھ اس کے گھٹنوں سے نکلے، انگوٹھی اور پھر وہیل چیئر کی پشت تھام لی۔

”بس مجھ پہ ایک احسان کرنا۔ ہمایوں کو مت بتانا کہ میں نے خیانت کی۔ میں اس کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتی۔ بظاہر میں نے جھوٹ نہیں بولا مگر تمہارا راز نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ میں اس سے کہہ دوں گی کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی، میں فواد کے سامنے تمہاری تائید کروں گی، مگر تم۔ تم میری عزت رکھ لینا۔ وہ جانتا ہے۔ کہ فرشتے جھوٹ نہیں بولتی، خیانت نہیں کرتی۔ اس نے ان تصویروں پہ نہیں مجھے یقین کر کے تمہیں طلاق دی تھی۔ تم میری عزت

رکھ لینا۔“

وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتی آہستہ آہستہ بے خود سی کہہ رہی تھی۔ محفل نے سر جھکا لیا۔ وہ فرشتے کو نہیں بتا سکی کہ آج وہ پھر زمین کی طرف جھک رہی ہے مگر اسے پتہ نہیں ہے۔

”تم ہمایوں کو واپس لے لو محفل۔ وہ تمہارا ہے“ اسے تمہارا ہی رہنا چاہیے۔“ وہ اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر پلٹ گئی۔

\*\*\*

کمرے میں اسی طرح نیم اندھیرا تھا۔ کھڑکی کے پردے کھینچے تھے۔ ٹیبل لیپ ابھی تک جل رہا تھا۔ وہ خود کو گھسیٹتی آگے بڑھی اور لیپ کا بٹن بجھایا۔ ایک دم کمرے میں اندھیرا پھیل گیا۔ بس کھڑکی کے پار بارش کے قطرے گرتے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ وہیں کھڑکی کے سامنے بیٹھی برسی بارش کو دیکھنے لگی۔

”انسان جس سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے اللہ اسے اسی کے ہاتھوں سے توڑتا ہے، انسان کو اس ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح ہونا چاہئے جس سے لوگوں کی محبت آئے اور باہر نکل جائے۔“

اللہ نے اسے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں توڑا تھا جن سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتی تھی۔ ہمایوں، فرشتے اور تیمور!

تب ہی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

وہ گاڑی بار بار ہارن بجا رہی تھی۔ تب اس نے برسی بارش میں ہمایوں کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے گیٹ کھولا تو ایک گاڑی زن سے اندر داخل ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ تیزی سے باہر نکلا تھا وہ فواد ہی تھا وہ پہچان گئی تھی۔ وہ ویرسائی تھا، بس آنکھوں پہ فریم گلاس لگا سز تھے اور بالوں کا کٹ زیادہ چھوٹا تھا۔

کیا ہمایوں اس کی بات سن لے گا؟ کبھی بھی نہیں!



”تب ہی فواد نے لیک کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور کسی کو بازو سے کھینچ کر باہر نکالا۔ محمل دھک سے رہ گئی۔ وہ معین تھا۔“

پتلا لمبا، نوجوان جس کی مسین بھیک رہی تھیں۔ فواد اس کو پکڑ کر ہمایوں کے سامنے لایا جو قدرے چونکا ہوا کھڑا تھا۔

برستی بارش کا شور بہت تیز تھا۔ ان کی باتوں کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ وہ تینوں بارش میں بھیکتے کھڑے تھے۔ فواد زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ہمایوں سینے پہ ہاتھ باندھے صرف خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس کی محمل کی طرف پشت تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اور تب اس نے معین کو ہاتھ جوڑے دیکھا۔ شاید اس کے چہرے پہ بارش کے قطرے تھے یا شاید وہ رو رہا تھا۔ روتے ہوئے وہ کچھ کہتے ہوئے وہ ہمایوں سے معافی مانگ رہا تھا۔ اور تب اس نے فرشتے کو باہر آتے دیکھا۔ وہ بھی کچھ کہہ رہی تھی۔

محمل نے ہاتھ برسا کر پرہیز کر دیا۔ وہ اس منظر کو اب مزید نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

کتنی ہی دیر بعد اس نے فرشتے کی آواز سنی وہ فواد اور معین کو ادھر لارہی تھی۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلا، محمل کی اس طرف پشت تھی۔

”محمل...“ فواد کی بھرائی ہوئی آواز اسے سنائی دی۔

”معین نے ہمایوں کو سب کچھ بتادیا ہے۔ اگر مجھے پہلے پتہ ہوتا تو۔۔۔ محمل ہمیں معاف کر دو۔ ہم نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔“

بھائی نے ان کو روک جیکٹ کر دیا تھا۔ اماں سنبھل نہیں پاریں۔ ہمیں بددعامت دینا آیا۔“

”جاؤ معین! میں نے تمہیں معاف کیا۔ سب کچھ معاف کیا۔“

وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

”آباد دعا کرو آرزو آج پانچ جائیں۔ ان کے لیے بددعا مت کرنا۔“

”میں دعا کروں گی، تم جاؤ معین! ان کا خیال رکھنا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے، بلکہ تم نے تو مجھے انسانوں کی محبت اور وفا کی حقیقت دکھائی ہے۔ تمہارا شکریہ معین۔ تم جاؤ۔“

اور وہ ویسے ہی اٹھ کر قدموں پلٹ گیا۔

”کیا تم ہمیں معاف کر سکتی ہو محمل؟“ وہ شکست خورہ ٹوٹا ہوا شخص آتا فواد ہی تھا۔

”میں نے معاف کیا، سب معاف کیا۔“ وہ اب بھی پیچھے نہیں مڑی تھی۔

”آغا جان کو آدھے جسم کا فلج ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ مئی ان کے غم کی وجہ سے زندوں میں رہی ہیں نہ مردوں میں۔ سدرہ کے شوہر کی ڈیوٹی ہو گئی ہے اور اس کے وہ خاندانی سسرال والے اس کو میکے نہیں آنے دیتے۔ وہ اور اس کے یتیم بچے اپنے گھر میں اس سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں جو تم نے اور مسرت چچی نے گزار دی تھی۔ مہربن کو۔۔۔“

”مجھے کچھ مت بتائیں فواد بھائی۔ پلیز! میں نے معاف کیا۔ سب معاف کیا۔ مجھے یہ سب بتا کر اور دکھ نہ دیں۔ ابھی مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ اس کے نرم لہجے میں منت تھی۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ آغا فواد کا کیا انجام ہوا؟ مگر یہ دنیا انجام کی جگہ تھوڑی ہے؟ یہ تو امتحان کی جگہ ہے اپنے گناہ نظر آتا بھی ایک امتحان ہے اصل فیصلہ تو روز حساب ہی ہوگا۔

اس کے بیڈ کی پائنتی پر چند کانڈر رکھے تھے۔ وہ کانڈر جو کبھی اس کی زندگی کا محور تھے مگر آج اس نے ان پہ دوسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ ان ہی کانڈروں کے لیے اس نے فواد کا جھانسا قبول کیا تھا، آج فواد نے اسے خود لاد لیے تھے مگر کتنی بھاری قیمت تھی اس غلطی کی جو اسے کٹانی پڑی تھی۔

پچی عمر کے بچے سو رہے۔

بارش دھیمی آؤ چکی تھی۔ کھڑکی کی جالیاں گیلی ہو چکی تھیں۔ ان سے مٹی کی سوندھی خوشبو اندر آرہی تھی۔ بہت دیر تک وہ وہیں بیٹھی خوشبو سونگھتی رہی۔ اسے لاشعوری طور پہ اس کا انتظار تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کے کمرے میں ضرور آئے گا۔

کانی کچھ بیت گئے تو اس نے چوکھٹ پر آہٹ ماری۔ وہ آہستہ سے مڑی۔

ہمایوں تھا ہارا سا دروازے میں کھڑا تھا۔ یہ وہ دروازہ تھا جو اس نے محمل کی موجودگی میں کبھی پار نہیں کیا تھا۔ یہ وہ چوکھٹ تھی جس پہ وہ بھی سوالی بن کر نہیں آیا تھا۔ مگر آج وہ آیا تھا۔

اس کے تھکے تھکے ٹوٹے قدم آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئے تھے۔

”محمل! ٹوٹی ہوئی آواز میں اس نے پکارا تھا۔ اور پھر وہ پورے قد بے گھٹنوں کے بل اس کے قدموں میں آن کر اٹھا۔

”مجھے معاف کر دو محمل! اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پہ صدیوں کی تھکان تھی۔

تھی۔ محمل ابراہیم تو کہیں بھی نہیں تھی! ”میں نے صرف فرشتے کی بات پر۔ اور آج وہ کہہ رہی ہے کہ تم نے اس سے صرف ایک مسئلہ پوچھا تھا، اس نے خود غلط اخذ کیا۔ میں نے صرف فرشتے کی وجہ سے۔“

”کیا آپ نے پہلے زندگی کے سارے فیصلے فرشتے کے دماغ سے کیے تھے ایس بی صاحب؟“ وہ سیٹ لمبے میں بولی تھی۔ ”آپ چھوٹے بچے تھے جو یہ نہیں جانتے تھے کہ میرے رشتے دار میرے کھلے دشمن ہیں؟ آپ ان بڑھ جالیتے تھے جو یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ایسی تصویریں تو ہر گلی محلے میں بن جاتی ہیں۔“

”محمل! یقین کرو میں۔“

”ایک منٹ ایس بی صاحب! میں نے کئی مہینے صرف آپ کی سنی ہے۔ آج آپ میری سنیں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے فرشتے کے کہے پہ یقین کر لیا؟ آج میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ آپ نے فرشتے سے پوچھا ہی کیوں؟ آپ میری طرف سے اتنے بدگمان تھے کہ آپ کو دوسروں سے پوچھنا پڑا؟

کیوں نہیں آپ نے وہ تصاویر معین کے منہ پہ دے ماریں؟ کیا آپ بہت قابل پولیس آفیسر نہیں تھے؟ کیا آپ کو کھرا اور کھوٹا الگ کرنا نہیں آتا تھا؟ کیا آپ آرزو کی خصلت کو نہیں جانتے تھے؟ یا شاید آپ کی دلچسپی ایک بیمار بے ہوش عورت میں ختم ہو گئی تھی۔ شاید آپ کو میری خدمت سے دور بھاگنے کا ایک موقع چاہیے تھا۔ آپ آزاد ہونا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ مجھے صفائی کا ایک موقع تو دیتے۔ ایک بار تو پوچھتے کہ کیا تم نے ایسا کیا ہے؟ مگر آپ خود بھی مجھ سے تھک گئے تھے۔ آپ نے ایک لمبے کے لیے بھی نہیں سوچا ہمایوں کہ اگر میری جگہ آپ ہوں بیمار ہوتے اور میں آپ کے ساتھ بی بی کرتی تو آپ کی کیا حالت ہوتی؟“

بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ تب ہی کھلے دروازے سے تیور بھاگتا ہوا اندر آیا۔ شور سن کر وہ غیند سے جاگ اٹھا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آیا اور اس

”مجھے معاف کر دو۔ میں بہت دور چلا گیا تھا۔“

اس نے تاسف سے ہمایوں کو دیکھا۔ پہلے بھی وہ سب اس سے اس کا سب کچھ چھین کر لے گئے تھے۔ آج بھی وہ مانگ ہی رہے تھے مانگنے ہی آئے تھے۔

ہر ایک کو اپنے ضمیر کے بوجھ سے نجات چاہیے



کے گھٹنوں سے لیٹ گیا۔ مگر ہمایوں اور محمل اس کو نہیں دیکھ رہے تھے۔

”محمل“ مجھے معاف کر دو۔ میں رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔“ ہمایوں اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر محمل ایک دم پیچھے کو ہٹ گیا۔ لیکن اب میں ایسا نہیں چاہتی۔ ٹوٹے دھاگے کو دوبارہ جوڑا جائے تو اس میں ایک گرہ رہ جاتی ہے۔ ہمارے درمیان بھی وہ گرہ رہ گئی ہے سو اس دھاگے کو ٹوٹا رہنے دے۔“

”محمل!“ وہ بے یقین تھا۔ معافی کے لیے جڑے اس کے ہاتھ نیچے گر گئے۔ محمل نے گہری سانس لی۔

”میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے ہمایوں! دل سے معاف کر دیا ہے۔ مگر اب رجوع کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ آپ فرشتے سے شادی کر لیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ درمیان میں میں آگئی تھی۔“

”مگر محمل یہ تم۔“ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر آج وہ نہیں سن رہی تھی۔

”مجھے کسی سارے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ ہمایوں۔ میرا بیٹا میرے پاس ہے، فواد نے مجھے میرا حصہ بھی دلا دیا ہے۔ میں لوگوں کی محتاج نہیں رہی، آپ فرشتے سے شادی کر لیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ہمایوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔

فرشتے وہاں کھڑی رو رہی تھی۔ ہمایوں کو گردن موڑتے دیکھ کر وہ منہ پہ ہاتھ رکھے باہر کو بھاگی تھی۔

”آپ اس کا اور امتحان نہ لیں۔ اس سے شادی کر لیں۔ میں اور تیمور ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے ہیں۔ آپ ہمیں جانے دیں۔ اب ہمارا ساتھ ناممکن ہے۔“

وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں نے تمہاری قدر نہیں کی، محمل!“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھا اور شکستہ قدموں سے باہر کی

جانب بڑھ گیا۔

”دروازہ بند کر جائیے گا۔“

اس کے الفاظ پر وہ ذرا دیر کو رکھا، مگر پلٹا نہیں۔ اب شاید وہ پلٹنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔

بہت آہستہ سے وہ باہر نکلا اور کمرے کا دروازہ بند کیا۔

وہ محمل کی زندگی سے جا چکا تھا۔

دو آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹے اور گردن پہ لڑھک گئے۔

فرشتے کہتی تھی کہ اس نے سنا نہیں جب وہ برسوں پہلے اس ہسپتال میں ”کچھ“ جانا چاہتی تھی۔ حالانکہ وہ منظر تو اسے آج بھی یاد تھا۔ وہ جنورس کے پکارنے پر اٹھی تھی، فرشتے کی اوجھری بات سن کر ہی اٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ فرشتے ہمایوں کو پسند کرتی ہیں۔ مگر جب فرشتے نے خود اپنے رویے سے یقین دلایا تو وہ بھی بظاہر خود کو مطمئن کرنے لگی کہ بھلا فرشتے ایسے جذبات کیوں رکھیں گی، مگر وہ اندر وہ ہمیشہ سے جانتی تھی۔ اگر آرزو کو درمیان میں نہ دیکھا ہوتا تو وہ کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتی کہ ہمایوں کس سے شادی کر رہا ہے۔ ہاں، وہ جانتی تھی کہ فرشتے کیوں ان کی شادی کے بعد باہر چلی گئی تھی۔

وہ سب جانتی تھی۔ یہ بھی کہ اب وہ معذور ہو گئی تھی۔ ایک بے کشش عورت بن گئی تھی۔ ہمایوں نادام ہو کر پلٹا تو تھا۔ مگر تھا تو مرد ہی۔ کب تک اس سے بندھا رہتا؟ جو کالوں کا اتنا کچا تھا کہ اس فون کال میں ایک انگوٹھی کا ذکر اس کی سمجھ میں آیا۔ اور اس کی مسلسل ”فواد بھائی“ ”فواد بھائی“ کی تکرار میں ”بھائی“ کا لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ ”وہ کب تک اس کا رہتا؟“

ایک دن وہ پھر کسی دوسری عورت کی طرف چلا جاتا۔ تب بھی وہ اکیلی رہ جاتی مگر تب وہ شاید برداشت نہ کر پاتی۔ اس میں بار بار ٹوٹنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

اس نے ٹوٹا ہوا برتن بننے کا سوچا۔ فرشتے نے اعتراف کیا تھا، معافی نہیں مانگی تھی۔ ہمایوں نے معافی مانگی تھی مگر اعتراف نہیں کیا تھا۔ اور وہ دونوں سمجھتے تھے کہ

وہ بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ خیر!

”تیمور! اس نے گود میں سر رکھے تیمور کے نرم بھورے بالوں کو پیار سے سہلایا۔

”ہوں؟“ وہ کتنی نیند میں تھا۔

”تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا کہ میں یوسف علیہ السلام کے ذکر پہ اداس کیوں ہو جاتی ہوں؟ ہے یا؟“

”جی ہاں!“ وہ نیم غنودہ سا بولا۔

”پتا ہے میں کیوں اداس جاتی ہوں؟“ اس نے اپنے آنسو پونچھے، ”کیونکہ وہ بہت صبر کرنے والے تھے اور وہ اپنے والد کے بہت پیارے تھے۔“ اسے بولتے ہوئے کچھ اور بھی یاد آ رہا تھا۔

”مگر ان کے اپنے بھائیوں نے ان کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔“ اس کی آنکھوں کے حاشے کچھ مناظر تیزی سے چل رہے تھے۔

”پھر ان کو درہم کے عوض مصر میں بیچا گیا۔ ان پہ بہتان لگایا گیا۔ ان کو برسوں قید میں رکھا گیا۔ اور پھر ایک دن آیا جب وہ اسی مصر کے قتلس فشر بنے جس میں کبھی ان کو بیچا گیا تھا۔ ان کو اپنا بچہ بھائی مل گیا۔ اور وہ جنہوں نے ان پہ ہمتیں لگائی تھیں۔ اور وہ جنہوں نے ان کو ان کے گھر سے بے دخل کیا تھا، وہ ان کے پاس معافی مانگنے آئے۔ مگر اس ہستی نے کچھ نہیں جتایا، کچھ نہیں گنوا یا، سب کو معاف کر دیا۔ میں اس لیے اداس ہوتی ہوں تیمور کہ میں صبر کے اس مقام پہ کبھی نہیں پہنچ سکی۔ کیا تم سن رہے ہو؟“ اس نے چند لمحے اس کے جواب کا انتظار کیا۔ اور پھر جھک کر اس کے بالوں کو چوما۔

تیمور گہری نیند سوچا تھا۔

\*\*\*

ٹی وی لائونج کی مرکزی دیوار پہ بڑی سی پلازمہ اسکرین لگی تھی۔ اس پر ایک خوبصورت منظر پوری آب و تاب سے چک رہا تھا۔

روشنیوں سے منور ایک بڑا سا ہال، ہزاروں لوگوں

# حنا

بہنوں کا اپنا نامہ

اگست 2011 کا شمارہ ”رضوان نیر“ شائع ہو گیا ہے

اگست 2011 کے شمارے کی ایک جھلک

☆ اداکار ”توقیر ناصر“ سے ملاقات،

☆ ”سانول“ سعدیہ عابد کا مکمل ناول،

☆ ”شام فراق“ صبا جاوید کا مکمل ناول،

☆ ”ماہیا مینو یاد آؤ لدا“ تحسین اختر کاناوٹ،

☆ ”محببتوں میں حساب کیسا“ مدیحہ تبسم کاناوٹ،

☆ اس کے علاوہ ہفت روزہ، ہمارا، طبیہ، اشقی، سہارا، جبین اور

اداکار کے افسانے،

☆ ”میرے ساحر سے کہو“ ام مریم کا سلسلہ وار ناول،

☆ ”میں سقارہ صبح امید کا“ فوزیہ غزل کا سلسلہ وار ناول،

☆

☆

☆ بیار سے نئی ٹیکنیک کی باتیں، انشا، نامہ، انٹرویو، شوہر

☆ کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ حنا

☆ کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں

☆ اگست 2011ء کا شمارہ

☆ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں



کا مجمع۔ اسٹیج پہ بیٹھی نامور دینی شخصیات اور روشم پر کھڑا وہ شخص جو لیکچر دے رہا تھا۔

نی وی کے سامنے صوفے پہ بیٹھے ہمایوں داؤد نے ریموٹ اٹھا کر آواز اونچی کی۔ دایوم کے بڑھتے نکتے اسکرین پہ موجود شخص کے کوٹ پہ نمودار ہوئے تھے۔ ہمایوں نے ریموٹ رکھ دیا۔ اب وہ بنا پلک جھپکے، ساکت بیٹھا اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ فیصلہ آج نہیں ہوا تھا بلکہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہی ہو گیا تھا کہ قرآن صرف عربی کا قرآن ہے اس کے تراجم قرآن نہیں ہیں۔“

وہ روشن چہرے والا شخص اپنے خوبصورت انگریزی لب و لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پہ نفاست سے تراشیدہ داڑھی تھی اور سر پہ سفید جالی دار ٹوپی اس کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ کانچ سی بھوری چمکتی ہوئی۔ اور مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔ کچھ تھا اس کی مسحور کن شخصیت میں کہ ہزاروں لوگوں سے بھرے ہال میں سناٹا تھا۔ سب سانس روکے اس کی بات سن رہے تھے۔

”آج کے دور کا مسلم جب قرآن کھولتا ہے تو کہتا ہے کہ اسے اس میں وہ انداز کلام نظر نہیں آ رہا جس کے قصے وہ بچپن سے سنتا آیا ہے وہ انداز کلام جسے سنتے ہی عرب کے لوگ لاجواب ہو جاتے تھے مسجد میں گر جاتے تھے فوراً ایمان لے آتے تھے آخر کیا وجہ ہے کہ اس قرآن کا لاکھ انکار کرنے کے باوجود ابو جہل بن ہشام جیسے لوگ بھی چھپ چھپ کر اسے سننے آتے تھے؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہمیں اس میں وہ بات نہیں نظر آتی جو ان عربوں کو نظر آتی تھی؟ ہمیں کیوں یہ صرف قصوں کا مجموعہ لگتا ہے جن کے درمیان چند نصیحتیں ہیں اور نماز روزے کے احکام؟“

ہمایوں نے ریموٹ اٹھا کر دوبارہ آواز اونچی کی اور پھر مضطرب انداز میں اسے واپس رکھ دیا۔

کیا آپ نے ڈاکٹر مورس بکائی کا واقعہ سنا ہے؟

اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا اور پورے ہال پہ نگاہ دوڑائی۔ سب دم سادھے اس کو سن رہے تھے۔

”ڈاکٹر مورس بکائی ایک فریج ڈاکٹر تھے۔ وہ اپنے پاس آنے والے ہر مسلمان مریض سے کہتے تھے کہ قرآن حق نہیں ہے بلکہ ایک من گھڑت کتاب ہے مریض بے چارے آگے سے خاموش ہو جاتے۔ پھر ایک دفعہ جب شاہ فیصل ان کے پاس زیر علاج تھے۔ انہوں نے یہی بات شاہ فیصل سے کہی تو انہوں نے پوچھا کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ ڈاکٹر بکائی نے کہا کہ ہاں پڑھا ہے شاہ فیصل نے پوچھا کہ کیا پڑھا ہے تو انہوں نے بتایا کہ قرآن کا ترجمہ پڑھا ہے اس پر شاہ فیصل نے کہا پھر تم نے قرآن نہیں پڑھا کیونکہ قرآن صرف عربی میں ہے۔“

ڈاکٹر بکائی نے اس کے بعد دو سال لگا کر عربی سیکھی اور پھر جب انہوں نے اصل قرآن پڑھا تو وہ فوراً ”مسلمان ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر لوگوں نے قرآن نہیں پڑھا ہوتا۔ جو عربی ہم پڑھتے ہیں اس کا لیٹرل ورڈ مینیگ

litred word meaning ہمیں نہیں آتا ہوتا اور اس کا جو اردو ترجمہ ہم پڑھتے ہیں وہ اللہ نے نہیں اتارا ہوتا۔ کسی حد تک یہ تراجم اثر کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی قرآن کا اصل جاننا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ عربی کا قرآن پڑھے۔“

ہمایوں کے صوفے کے پیچھے جانے کب آہستہ سے فرشتے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ بنا پلک جھپکے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”اب اس کے دو طریقے ہیں یا تو آپ پوری عربی سیکھیں یا آپ صرف قرآن کی عربی سیکھیں اور صرف قرآن کی عربی سیکھ کر بھی آپ بالکل درست طور پر اصل قرآن سمجھ سکتے ہیں۔ اپنی کونسی چن؟“

اس نے رک کر ہال پہ نگاہ دوڑائی۔ اسٹیج کے سامنے نیچے لگے مائیک کے قریب کھڑی ایک پاکستانی لڑکی فوراً ”آگے بڑھی اور مائیک اٹھا۔“

”السلام علیکم ڈاکٹر تیمور۔“

”وعلیکم السلام!“ وہ سر کے خفیف اشارے سے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”سراٹھے آپ کی بات سن کر یہ سب بہت مشکل لگ رہا ہے۔ عربی بہت مشکل زبان ہے اور پیچیدہ اور یہ ہماری مادری زبان نہیں ہے۔ عام آدمی۔ اسے کیسے سیکھ سکتا ہے؟“

وہ ذرا سا مسکرایا اپنا اور پڑھانیک کے قریب ملایا۔ ”بالکل ایسے جیسے ہمارے ملک کے عام آدمی نے دنیا کے علوم حاصل کرنے کے لیے انگریزی سیکھی ہے۔ وہ بھی ہماری زبان نہیں ہے۔ مگر ہمیں آتی ہے۔ کیا نہیں آتی؟“

عربی سیکھنا تو زیادہ آسان اس لیے بھی ہے کہ یہ اردو سے بہت قریب ہے۔“

لڑکی نے لاجواب ہو کر گہری سانس بھری پیچھے پورے ہال میں ایک تبسم بکھر گیا۔

”میرا ایک کونسی چن ہے سر!“ ایک نو عمر لہجہ دار لڑکا مائیک پہ آیا۔ ”میں نے آپ کے پچھلے لیکچر سے متاثر ہو کر قرآن سیکھنا شروع کیا تھا مگر قرآن پڑھتے اب مجھ پر پہلے والی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ دل میں گداز نہیں پیدا ہوتا میں قرآن پڑھتا ہوں تو میرا ذہن بھٹک رہا ہوتا ہے۔“

تیمور نے مائیک قریب کیا، پھر بغور اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کہیں جھوٹ تو نہیں بولتے؟“

”جی؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔

”ایک بات یاد رکھیے گا قرآن صرف صادق اور امین کے دل میں اترتا ہے۔“

میں نے اس کتاب کے بڑے بڑے علماء کو دیکھا ہے جو امانت کی راہ سے ذرا سے پھسلے اور پھر ان سے قرآن کی حلاوت چھین لی گئی اور پھر جمی وہ اس کتاب کو ہاتھ نہ لگا سکے۔“

ہمایوں کی کانچ سی بھوری آنکھوں میں ایک کرب ابر اٹھا۔ اس کے صوفے کی پشت پہ ہاتھ رکھتے

ساکت کھڑی تھی اس کے پیچھے دیوار میں شایف بنا تھا۔ ایک طرف میز تھی۔ میز پہ تازہ تہہ کی ہوئی جائے نماز ابھی ابھی رکھی گئی تھی۔

ساتھ شایف کے سب سے اوپر والے خانے میں احتیاط سے غلاف میں لپیٹی ایک کتاب رکھی تھی۔ اس کا غلاف بہت خوبصورت تھا۔ سرخ ویلوٹ کے اوپر سلور ستارے مگر گزرتے وقت نے غلاف کے اوپر گرد کی ایک تہہ جمادی تھی۔

اور وہ شایف اتنا اونچا تھا کہ اس تک اسٹول پہ چڑھے بغیر ہاتھ نہیں جاتا تھا۔

”جس شخص میں صداقت اور امانت ہوتی ہے اور وہ واقعی قرآن حاصل کرنا چاہتا ہے تو قرآن اس کو دے دیا جاتا ہے۔“ اسکرین وہ پہ روشن چہرے والا شخص کہہ رہا تھا۔

”ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے عرب معاشرے کے بارے میں عمومی تاثر یہ رکھتے ہیں کہ وہ بہت جاہل و گنوار لوگ تھے اور بیٹیوں کو زندہ دبانے والے وحشی تھے، لیکن ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ مہمان نواز تھے عہد کی پاس داری کرتے تھے۔ جہاں تک بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام عرب کے کچھ غریب قبائل کرتے تھے اور اس وقت بھی انسانی حقوق کی تنظیمیں جو فدیہ دے کر ان بچیوں کو چھڑاتی تھیں۔ اور رہی بات صداقت کی تو عرب معاشرے میں جھوٹ بولنا انتہائی قبیح عمل سمجھا جاتا تھا اور لوگ اس شخص سے حیران ہوتے تھے جو جھوٹ بولتا ہو اسی لیے ان لوگوں کو قرآن دیا گیا تھا اور اسی لیے ہم لوگ اس کی سمجھ سے محروم کر دیے گئے ہیں کیونکہ نہ تو ہم سچ بولتے ہیں اور نہ ہی امانت کا خیال رکھتے ہیں، بھلے وہ کسی ذمہ داری کی امانت ہو، کسی کی عزت کی یا کسی کے راز کی۔“

محمل مسکرا کر نی وی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سینار ملایشیا سے لائیو آ رہا تھا۔ سینار ختم ہوتے ہی تیمور نے فلائٹ لینتھی اور وہ جانتی تھی کہ رات کھانے پہ وہ ان کے ساتھ ہوگا۔ ابھی اس نے



تیور کے لیے اسپیشل ڈش کی تیاری بھی شروع کرنا تھی سو وہ پروگرام چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
تیور کے لیے کھانا وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے خود تیار کرتی تھی۔ ایک ایک سبزی خود کاٹتی تھی ہاں آغا جان کا پرہیزی کھانا لازماً بناتی تھی۔  
وہ میزھیوں کے ایک طرف سے نکلتی ہوئی آغا جان کے کمرے کے دروازے کے باہر کی اور اسے ہولے سے کھٹکھٹا کر کھولا۔

”آغا جان! آپ نے ناشتا کر لیا؟“

وہ بیڈ پہ لیٹے تھے۔ ان کے ہونٹ فالج کے باعث ذرا ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ اس کی آہٹ سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں اور پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ جب سے وہ اپنی اولاد پہ بوجھ بنے تھے، محمل انہیں اپنے پاس لے آئی تھی۔

”تیور کہہ رہا تھا وہ رات تک پہنچ جائے گا۔“

وہ آگے بڑھی اور کھڑے کھڑے ان کا ہاتھ نرمی سے تھامے بتانے لگی۔  
”میں رات کو کچھ اسپیشل بنانے کا سوچ رہی ہوں، کتنے دنوں بعد ہم تینوں اکٹھے کھانا کھائیں گے، ہے نا؟“

آغا جان نے پھر مسکرانے کی سعی کی، اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے۔  
”آپ فکر مت کیا کریں، میں ہوں نا آپ کے پاس۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی آپ کو بھی دے گا۔“ اس نے نرمی سے ان کے آنسو صاف کئے۔ ”چھا“ مجھے مسجد میں ایک لیکچر دینا ہے، بس گھنٹہ لگے گا، میں ابھی چلتی ہوں، جلدی آنے کی کوشش کروں گی، پھر ڈنر کی تیاری بھی کرنی ہوگی۔“ وہ گھڑی دیکھتی جانے کے لیے مڑی۔

آغا جان اب سسک سسک کر رہے تھے۔  
باہر آگرہ میزھیوں کے پاس لگے آئینے کے سامنے رکے۔ سامنے کیل پہ اس کی پونی ٹنٹی تھی۔ اس نے پونی اٹھائی اور لمبے بال سمیٹ کر اوچی پونی میں جکڑے، پھر ایک نظر آئینے میں خود کو دیکھا اور مسکرا دی۔

وہ آج بھی اتنی ہی صبح، تروتازہ اور خوب صورت تھی جتنی برسوں پہلے ہوا کرتی تھی۔ وہ اوچی پونی آج بھی اس پہ اتنی ہی خوب صورت لگ رہی تھی جتنی پہلے لگتی تھی۔ اور آج بھی ہر سچ وہ دیکھ جاتی تھی جہاں پہلے جایا کرتی تھی۔  
اس نے لی وی بند کیا۔ (تیور کا پروگرام ختم ہو چکا تھا) اور میز سے اپنا بیگ اور سفید جلد والا قرآن اٹھائے ”آغا ہوس“ سے باہر نکل آئی۔

\*\*\*

وہ مسجد جانے سے قبل پندرہ منٹ کے لیے بس اسٹاپ ضرور جایا کرتی تھی۔ اسے کئی برسوں سے اس سیاہ فام لڑکی کی تلاش تھی جس نے اس تک قرآن پہنچایا تھا۔ وہ ایک دفعہ اس سے مل کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔

سنہری سی صبح آتری ہوئی تھی۔ دور کہیں پرندے بول رہے تھے وہ دھیمی رفتار سے چلتی سفید جلد والا قرآن سینے سے لگائے بیچ پہ آ بیٹھی۔ ہر صبح کی طرح آج بھی وہ اسی موہوم۔ امید پہ زور آتی تھی کہ شاید وہ لڑکی آجائے۔

رات خوب بارش ہوئی تھی۔ سرمئی سڑک ابھی تک گیلی تھی۔ وہ سر جھکائے اس کی نیچھی سڑک پہ چلتی چبوتیاں دیکھ رہی تھی۔  
پندرہ منٹ ختم ہونے کو آئے تھے مگر وہ لڑکی کہیں بھی نہیں تھی۔

مابوس ہو کر محمل نے جانے کے لیے بیک اٹھایا۔ تب ہی اسے سڑک پہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے بے اختیار سر اٹھایا۔  
ایک لڑکی دور سے چلی آرہی تھی۔

کندھے پہ کالج بیگ، ہاتھ میں موبائل، شولڈر کٹ بال کپچھر میں جکڑے ہوئے جینز پہ کرنا اپنے چپو نیچہ چبائی قدرے جھنجھلائی ہوئی سی دھوپ سے آکر اس کے ساتھ بیچ پہ بیٹھی۔

محمل یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ لڑکی اور

اس وقت ادھر آتی تھی مگر آج سے پہلے وہ اسے دیکھ کر اتنی چونکی نہیں تھی۔ اب وہ پاؤں جھلاتی ہوئی آتارک موبائل کے بٹن پر لیس کر رہی تھی۔  
”پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو۔“ زیر لب غصے سے برہنہ کر اس نے ایک بٹن زور سے دبایا اور موبائل بیک میں پھینکا۔

وہ ابھی تک یوں ہی اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔ بہت دیر سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

وہ لڑکی ابھر ادھر گردن گھماتی تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ دفعنا ”محمل کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کر کے وہ چونکی۔

محمل نے ذرا سنبھل کر نگاہیں جھکالیں۔ نیچے اس لڑکی کا بیگ پڑا تھا جس پہ جگہ جگہ چاک سے اس کا نام لکھا تھا۔

”عشاء حیدر۔“

وہ زیر لب مسکرا دی بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔  
”ایک سیکورڈی!“ اس نے چپو نگم چبانا روک کر ایک دم محمل کو مخاطب کیا۔ محمل نے نرمی سے نگاہیں اٹھائیں۔  
”جی؟“

”میں روز آپ کو دیکھتی ہوں اور۔“ اس نے محمل کی گود میں بیگ کے اوپر رکھے سفید کور والے قرآن کی طرف اشارہ کیا۔ اور آپ کی اس بک کو بھی۔ آپ اتنی کیئر سے اسے رکھتی ہیں، اس میں کیا کچھ خاص ہے؟“

محمل نے سر جھکا کر سفید قرآن کو دیکھا، جس کی صاف جلد اب خستہ ہو گئی تھی اور جھلکتے صفحے زرد پڑ گئے تھے۔ وہ دیکھنے سے کوئی بہت قدیم کتاب لگتی تھی۔

”خاص تو ہے۔“ اس نے مسکرا کر سر اٹھایا۔  
”چھا۔ والٹس سوا پیکٹل؟“ وہ متحس ہوئی۔  
”اس میں کسی عشاء حیدر کا ذکر ہے، اس کی زندگی کی کہانی ہے اور اس کے لیے کچھ میسجز ہیں۔ اس لیے اسپیشل تو ہے۔“

وہ لڑکی یک ٹک منہ کھولے اسے دیکھے گئی۔  
”کون۔۔۔ کون عشاء حیدر؟“ بہت دیر بعد بمشکل وہ بول پائی تھی۔

”ہے ایک اس زمین پہ بسنے والی لڑکی جس کو لوگوں کی باتیں غمگین کرتی ہیں، جس کے کہنے سے قبل کوئی اس کے دل کی بات نہیں سمجھتا اور جس کو زندگی سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے۔“

اسی لمحے بس نے ہارن بجایا۔ محمل نے بات روک کر دور سے آتی بس کو دیکھا۔

”میں چلتی ہوں، تمہاری بس آگئی ہے۔“ وہ سفید جلد والی کتاب اور بیک اٹھائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ لڑکی ابھی تک شذر سی بیٹھی تھی۔

بس قریب آرہی تھی۔  
محمل چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بیچ سے دور جانے لگی۔

”سنیل۔۔۔ بات سنیں، ایک منٹ رکیں۔“ یک دم وہ بے چینی سے اٹھی اور تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے

فائرہ افکار کے 4 خوبصورت ناول

آئینوں کا شہر	قیمت - 500/- روپے
بھول بھلیاں تیری گلیاں	قیمت - 500/- روپے
یہ گلیاں یہ چوہا رہے	قیمت - 300/- روپے
پچھلاں دے رنگ ہزار	قیمت - 250/- روپے

ناول نگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ - 45/- روپے

مکمل کا پتہ:

کتاب و عمر (ڈائجسٹ: 37، ادوار بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021)